

عبدالغفار واحسن



ڈاکٹر سعید الرحمن

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

**پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ**





یادگارِ عبدالحق



ڈاکٹر سید معین الرحمن
(وفات ۱۵-اگست ۱۹۰۵ء)

الوقار پبلیکیشنز

alwaqarpublications@hotmail.com

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷۱۰۳، لاہور - پاکستان

بابائے اردو کی چالیسویں برسی کی مناسبت سے
خصوصی اشاعت

129370

۶۲۰۰۲

سال اشاعت :

سید وقار معین

ناشر :

Ph.: 0300-8408750

گنج شکر پریس، لاہور

طابع :

380/- روپے

قیمت :

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳، لاہور - پاکستان

atwaqarpublications@hotmail.com

مندرجات:

صفحہ:

○ حرفے چند: ڈاکٹر سید معین الرحمن

اعترافِ حق:

- ۱- بابائے اردو کی خدماتِ جلیلہ ۱۵
- ۲- ”چند ہم عصر“ کا تجزیاتی مطالعہ ۳۳
- ۳- بابائے اردو: ایک کرشمہ ساز شخصیت ۶۱
- ۴- بابائے اردو بحیثیت شاعر ۷۵
- ۵- کچھ بابائے اردو کی شادی کے بارے میں ۱۰۳
- ۶- بابائے اردو کا مقصدِ حیات ۱۱۷

بزمِ حق:

- ۷- بابائے اردو اور نواب معشوق یار جنگ ۱۲۵
- ۸- بابائے اردو اور پروفیسر محمود احمد خاں ۱۳۱
- ۹- بابائے اردو اور پروفیسر حمید احمد خاں ۱۵۱
- ۱۰- بابائے اردو اور جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن ۱۶۷
- ۱۱- بابائے اردو اور حکیم اسرار احمد کرپوی ۱۷۹

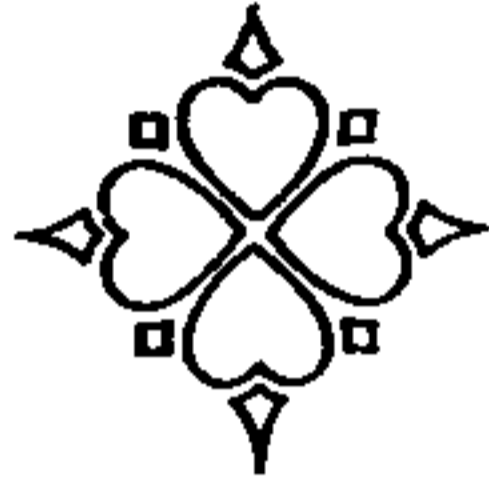
تہذیبِ کاتِ حق (بابائے اردو کی نادر تحریریں):

- ۲۳۵ - ۱۲۔ قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین، ۱۸۹۶ء
- ۲۳۹ - ۱۳۔ غلامی، ۱۸۹۶ء
- ۲۴۷ - ۱۴۔ سر سید احمد خاں کی والدہ، ۱۹۱۲ء
- ۲۶۳ - ۱۵۔ گشتی کتب خانہ، مارچ ۱۹۳۵ء
- ۲۷۳ - ۱۶۔ میرا کتب خانہ، جون ۱۹۳۶ء
- ۲۸۳ - ۱۷۔ ”موازنہ انیس و دیر“ — بابائے اردو کی قلمی تحریر
- ۳۵۶-۳۰۱ - ۱۸۔ اردو زبان و ادب کے سات سو سال

O

بائیں کلم ، کام : باہ

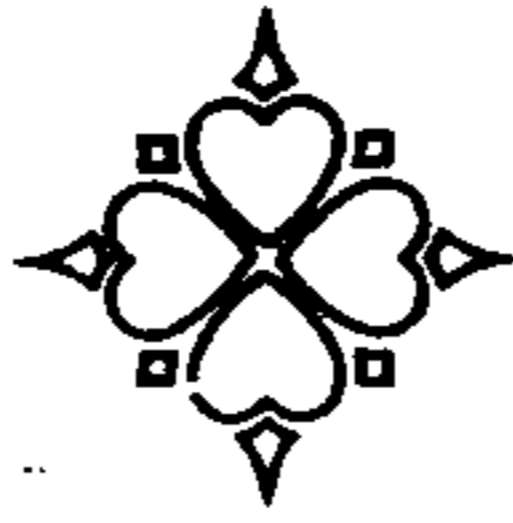
اک
۳۰۱



آءب و اءءرام كے ساآھ
اٲنى ايك مءسن و مہربان اور فيض رساں بستی

بگم ءاقيبہ رحيم الدين

كى نذر



انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے قدیم ترین منصبی وابستگی
 کا اعزاز اور امتیاز رکھنے والے
 جمیل الدین عالی
 کے نام!



Professor: Sufi Tabassum Chair.
Dean, Faculty of Arts,

Chairman, Department of Urdu,

GOVERNMENT COLLEGE, LAHORE

Dr. Syed Moeen-ur-Rehman
1932 - Fazeel

حرفے چند:

زیر نظر کتاب ”یادگار عبدالحق“ کا بیشتر حصہ برسوں سے کتابت شدہ پڑا تھا، لیکن اس کی اشاعت کسی نہ کسی وجہ سے ٹپٹی چلی آ رہی تھی۔ کمپیوٹر کمپوزنگ میں بعض مضامین کے اضافے کے ساتھ، اب اس کتاب کو بلاآخر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی چالیسویں برسی کی مناسبت سے شائع کرنے کی نوبت آ رہی ہے۔

کتاب میں شامل، بابائے اردو کے رفیقِ دیرینہ اور اپنے کرم فرما حکیم اسرار احمد کرپوی کے گئے تحریری مکالمے کو صاف اور مرتب کرنے میں بڑا وقت لگا۔ یہ ایک جامع مطالعہ ہے اور مولوی عبدالحق کے مزاجی اوصاف کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی شادی کے موضوع پر نئے ماخذ و مصادر کی بنیاد پر فراہم کیے گئے لوازمے کو بھی میں اپنی اس کتاب کا ایک قابل لحاظ حصہ خیال کرتا ہوں۔ اس ضمن میں محض تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے قیمتی ملاحظہ ہاتھ لگا اور ناگہاں سوائے اتفاق کہ یہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر برسوں بعد یہ گم گشتہ نادر ماخذ، جس کی طرف سے میں ایک طرح سے ناامید ہو چکا تھا، از سر نو ایکا ایک ہاتھ آ گیا (اس مدد و جزر کی تفصیل متعلقہ مضمون میں آگئی ہے)۔ کتاب میں تاخیر و تعویق، کا ایک سبب یہ بھی رہا!

کتاب میں شامل بابائے اردو کی بعض غیر مرتب نگارشات کی بازیافت، میرے لیے سرمایہٴ فخر ہے۔ کتاب میں بھی ”بزمِ حق“ کی بھی اپنی ایک الگ اہمیت ہے اس بزم کے پانچوں سوار، افسوس کہ اب ہم میں نہیں، لیکن بابائے اردو کے بارے میں ان کے بیانات، تخمینے اور تجزیے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزاج اور ان کی افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے بالذات دائمی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اس سے قطع نظر بابائے اردو کے ان ہم جلیسوں کی سحر آگیاں باتوں میں اپنائیت اور محبت کی جو خوشبو اور مہک رچی بسی ہے، وہ بجائے خود بھی ایک کشش اور حسن رکھتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے احوال و آثار کے ذکر خیر پر جی یہ کتاب، ان کی ذات و صفات، ان کے مقصد حیات اور ان کے کام اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے حوالہ ناگزیر کا کام دے گی، یہی اس کتاب کا جواز ہے۔

یہ کتاب میری توجہ اور فرصت کی منتظر شائد اب بھی ناتمام پڑی رہتی، اگر ہم کار رفیق عزیز محمد سعید کا اصرار حد سے نہ بڑھ جاتا۔ ان کے تقاضوں اور تعاون کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ خدا انہیں زندگی میں کامرانیوں اور آسانیوں سے ہمکنار رکھے۔ کتاب کے سرورق اور خطاطی کے لیے میں ایم۔ فل (اردو) کی بڑی با اعتماد اور اپنی ذی استعداد شاگرد عزیزہ شمینہ ندیم اور ان کے شوہر ندیم حسن صاحب کا ممنون ہوں۔

انجمن ترقی اردو کا سال تاسیس ۱۹۰۳ء ہے، سال ۲۰۰۳ء میں ”انجمن“ کے قیام کے جشن صد سالہ کے موقع پر، میں اپنے وسائل سے ایک ضخیم کتاب (جو پندرہ سو صفحات سے بھی متجاوز ہو گئی ہے)، ”مجموعہ مطالعات عبدالحق“ کے نام سے پیش کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ خدا مجھے اس منصوبے کی تکمیل کی قدرت اور مہلت عطا کرے۔

معصوم

۱۶۔ اگست ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر سید معین الرحمن
پروفیسر، شعبہ تعلیم، گورنمنٹ کالج، لاہور

گھر:

”الوقار“ ۵۰۔ لوئر مال، لاہور



تصویر بابائے اردو اور سید معین الرحمن، مئی ۱۹۶۱ء



ڈاکٹر سید معین الرحمن بابائے اردو کے مزار پر۔۔۔ ج ۲۰۰۲ء



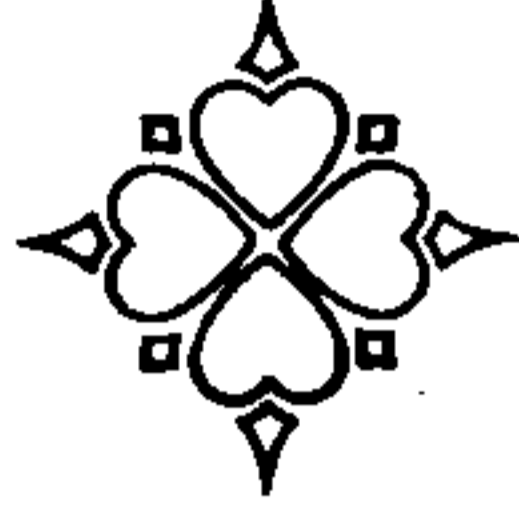


بابائے اردو مولوی عبدالحق

اعترافِ حق:



- ۱۔ بابائے اردو کی خدماتِ جلیلہ ۱۵
- ۲۔ ”چند ہم عصر“ کا تجزیاتی مطالعہ ۳۳
- ۳۔ بابائے اردو: ایک کرشمہ ساز شخصیت ۶۱
- ۴۔ بابائے اردو بحیثیت شاعر ۷۵
- ۵۔ کچھ بابائے اردو کی شادی کے بارے میں ۱۰۳
- ۶۔ بابائے اردو کا مقصدِ حیات ۱۱۷



تحقیقی نقطہ نظر سے مولوی عبدالحق کی شادی کے موضوع پر نئے
 مآخذ و مصادر کی بنیاد پر فراہم کیے گئے لوازمے کو میں اس حصہ کتاب کا
 ایک قابل لحاظ تجر و خیال کرتا ہوں۔ اس حصے کی دوسری نگارشات
 بھی بابائے اردو کی ذات و صفات، ان کے مقصدِ حیات اور ان
 کے علمی کاموں اور ادبی کارناموں کو سمجھنے میں شائد کچھ مدد دیں۔
 — ڈاکٹر سید معین الرحمن

بابائے اُردو کی خدماتِ جلیلہ

[تحریر: ۱۹۶۳ء، نظر ثانی: ۱۹۶۶ء]

مولوی عبدالحق نے شعور کی آنکھ کھولی تو سرسید، آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، حالی اور شبلی کا شہرہ تھا۔ اُدھر اردو ایک پُر آشوب دور میں داخل ہو رہی تھی کیونکہ اس کے مقابل ہندی زبان اور دیوناگری خط کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔ اس تحریک نے جس کا آغاز ۱۸۶۷ء کے قریب ہوا، سرسید کے آخری دنوں میں باقاعدہ ایک ہل چل کی صورت اختیار کر لی۔ یہ مولوی عبدالحق کی طالب علمی کا دور تھا۔ ایک حساس اور باشعور نوجوان کی حیثیت سے انہوں نے اس فضا کا مطالعہ کیا اور اس سے ایک خاص اثر قبول کیا۔ انہوں نے ابھی انٹرنس کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا کہ سرسید کے ”تہذیب الاخلاق“ میں اردو زبان کے مستقبل کے موضوع پر ان ایک مضمون شائع ہوا جس پر نو عمر اہل قلم کو ہر طرف سے داد ملی۔

مولوی عبدالحق کی تعلیم و تربیت سب کی سب کم و بیش علی گڑھ میں ہوئی اور یہاں بھی شخصیت سے انہیں سرسید کی ”چشم نگراں“ میسٹر آئی۔ رشید احمد صدیقی نے ٹھیک کہا ہے کہ عنفوان شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تند صلاحیتوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب یقیناً خوش قسمت تھے کہ ان کو سرسید کا سایہ اور سہارا اور ان کے ناوردہ روزگار رفقاے کرام کی صحیح نصیب ہوئیں۔ سرسید اور حالی جیسے مشاہیر کی شفقت اور صحبت نے مولوی عبدالحق کے ذہن کو صیقل کر دیا۔ ان کا مذاق ادب نکھرتا اور سنورتا گیا۔ مزاج میں ضبط و تحمل، متانت و اعتدال اور تحریر میں صفائی، سادگی، قوت اور استدلال کے جوہر چمک اُٹھے۔ وہ سرسید کی تحریک اور حالی کی تحریر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور بالآخر اسی کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین اور انداز نگارش کا معیار و محور ٹھہرایا۔

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولوی عبدالحق دو تین برس مدرسہ اصفیہ حیدرآباد کے صدر مدرس رہے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں وہ رسالہ آفسر سے بھی بحیثیت مدیر لیتے ہو گئے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں وہ امور عامہ (ہوم سیکریٹری) میں مترجم بنائے گئے جہاں بارہ تیرہ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں وہ ناظم (ڈائریکٹر) تعلیم کے مددگار اور چند ماہ بعد اوائل ۱۹۱۲ء میں صوبہ اورنگ آباد کے سررشتہ تعلیم کے صدر مہتمم (انسپکٹر آف سکولز) مقرر ہوئے اور اس طرح ان کا تعلیمی اور علمی تجربہ ترقی کرتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو وہ "شعبہ ترقی اردو کے سیکریٹری منتخب کئے گئے اور اس کے بعد اردو ان کا اور حنا بچھونا بن گئی۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام میں مولوی عبدالحق کی تحریک اور مساعی کو بڑا دخل ہے۔ صدر مہتممی تعلیمات سے مولوی عبدالحق کو جامعہ عثمانیہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ کی نظامت پر ترقی دی گئی چند سال بعد اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج قائم ہوا تو انہیں اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ کم و بیش بیسٹیل برس تک سرکاری خدمات انجام دے کر مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۰ء میں پیشین لے لی، لیکن فوراً بعد انہیں بہ اصرار جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کا صدر بنا دیا گیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے ایسا پرانہوں نے اس منصب کو قبول کیا لیکن چند ہی سال بعد زبان کی حفاظت و مدافعت کے پیش نظر وہ اس اعزاز اور خدمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوتے ہی مولوی عبدالحق نے زبان کو علمی مضامین کے اظہار کے قابل بنانے کے لیے علمی موضوعات پر تصانیف و تراجم کے سلسلے کو تیز تر کر دیا۔ مغربی علوم کے ترجموں میں سب سے بڑی وقت ان کی مخصوص اصطلاحات تھیں جن کے مترادفات مشرقی زبانوں میں نہیں ملتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے اصطلاحاتِ علمیہ کی لغت مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایسی مسلسل سعی و محنت سے جو ان کا طرہ اقیار رہی ہے، مختلف علوم کی اصطلاحات کو مرتب کر کے چھپوایا اور برابر اس میں مناسب ترمیم و تصحیح اور اضافے کرتے رہے۔

اصطلاحاتِ علمیہ کی لغت سے قطع نظر ۱۹۲۷ء میں مولوی عبدالحق نے انگریزی اردو

لغت کے ترجمے کا عہد آفریں کام مکمل کیا۔ بڑھی لفظی کے دو کالمی ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل انگریزی سے اردو کی یہ لغت کبیر انجن کی طرف سے شائع کی گئی۔ یہ لغت جس میں تقریباً دو لاکھ انگریزی لغات کے ہم معنی اردو الفاظ دیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی رہبری و نگرانی میں متعدد اہل علم کی دس گیارہ برس کی محنت سے تیار ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں حکومت حیدرآباد نے اردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تسوید و تالیف کی خدمت مولوی عبدالحق کے سپرد کی مولوی عبدالحق ہی کے لفظوں میں ایک کامل و جدید مستند لغت میں :

ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہوگا کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اُس وقت سے تاحال اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے اُس کے کون کون سے معنی متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائرو پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل تحقیق کرنی ہوگی یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنی تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھا۔“

ظاہر ہے ان خطوط پر ایک جامع لغت کی ترتیب کس قدر دشوار، کٹھن اور محنت و وقت طلب امر تھا مگر مولوی عبدالحق نے بڑھی حوصلہ مندی سے کام میں ہاتھ ڈالا اور بڑھی استعداد اور تیزی سے لغت کی تالیف کا کام شروع ہو گیا۔ الفاظ کی اصل اور سرگزشت کا پتہ چلانے کے لیے ان کی نگرانی میں سنسکرت اور ہندی کے بعض ماہرین کا تقریر عمل میں آیا۔ نظم و نشر کی مستند کتابوں سے الفاظ و اسناد ڈھونڈنے میں کئی کئی اصحاب مصروف رہے۔ خود مولوی عبدالحق جزوی تلاش و تحقیق تک میں شریک رہتے یہاں تک کہ دنس پندرہ برس میں اس سلسلے کا بہت کچھ مواد جمع ہو گیا۔ سوڈے کا بڑا حصہ مطبع میں پہنچ گیا تھا، اس کے کچھ اجزا حیدرآباد و کن کے سرکاری مطبع میں چھپ بھی لیے تھے کہ یہ سارا سرمایہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گیا۔

پاکستان آنے کے بعد مولوی عبدالحق نے لغت سازی کے کام کی طرف نئے سرے سے

توجہ کی تجلیل الدین عالی کے بقول :

اسناد کی فراہمی اور تشریح نگاری کے کام ساتھ ساتھ شروع کئے گئے، دس بارہ برس کی مدت میں صرف الف ممدودہ، الف مقصورہ، ب اور ج کے الفاظ تک کا مسودہ مکمل ہو سکا۔ بابائے اردو کی وفات سے یہ کام جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ (بہر نوع) اردو زبان میں کوئی لغت ایسی موجود نہیں ہے، جس میں مذکورہ حروف کی حد تک اتنے زیادہ الفاظ ہوں اور پھر تشریح نگاری میں جس تفصیل سے کام لیا گیا ہے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔“

(اداریہ سہ ماہی ”اردو“ اپریل ۱۹۶۶ء ص ۴)

مولوی عبدالحق اردو کے بلند پایہ لغوی، جید عالم اور ماہر لسانیات تھے۔ قواعد اردو کے نام سے اردو کے اجزائے صرفی و نحوی اصول پر ان کی مجتہدانہ تالیف بڑی گراں قدر، مبسوط، اور مستند ہے۔ اس میں الفاظ کی ساخت، ارتقائی تغیرات، مرکبات و محاورات، عبارت کی نحوی ترکیب اور عروض کے ضروری اصول و قواعد پر ایسی مرتب اور مشروح تفصیل بہم پہنچائی ہیں کہ زبان کے نکات و قواعد کی تمام کمال معرفت نصیب ہو جاتی ہے۔ قواعد کے علاوہ ۱۹۳۴ء میں مولوی عبدالحق نے ثانوی درجوں کے طلباء کی ضروریات کے پیش نظر ”اردو صرف و نحو“ پر ایک کتاب تالیف کی، یہ کتاب بقول کے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی مستند کتاب ہے جو ساٹھک بنیادوں پر لکھی گئی، مولوی عبدالحق سے پہلے اس موضوع پر جن مصنفین نے قلم اٹھایا انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کی قواعد کو مشعل راہ بنایا اور اردو زبان کے مخصوص مزاج و منہاج کو نظر انداز کر دیا۔ مولوی عبدالحق نے عربی اور فارسی کی قواعد کو صرف اسی حد تک پیش نظر رکھا ہے جہاں تک اُس کی ضرورت تھی، انہوں نے اردو زبان کی خصوصیات کو پوری طرح سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی اور پہلی بار اس اہمیت کا احساس دلایا کہ اردو کی قواعد عربی و فارسی کا چہرہ نہیں بلکہ بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تحقیق و تدقیق سے مولوی عبدالحق کو گہرا شغف تھا۔ ان کا شمار اردو ادبیات کے قدر

لے گروپوش، اردو صرف و نحو، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۱ء

اُدُل کے مُحققوں میں ہوتا ہے۔ انہیں اُدب کی تاریخ سے عموماً اور زبان کی تاریخ سے خصوصاً بڑی دل چسپی رہی ہے۔ اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ تاریخی ژرف نگاہی کے ثبوت ملتے ہیں۔ اُردو کی ابتدا اور اس کے تاریخی ارتقا پر اُن کی بہت اچھی نظر تھی اور یہ ایسا شعبہ ہے جس میں کوئی اُن کا حریف نظر نہیں آتا۔

مولوی عبدالحق کا بڑا کارنامہ اُردو ادب کے اُن شاعروں اور مُصنفوں کو زندگی عطا کرنا ہے، جو معنوی طور پر مَرچکے تھے۔ اُنہوں نے متعدد قدیم و نایاب تذکروں کا کھوج لگا۔ بڑی جان فشانی سے انہیں ترتیب دیا، اور اس طرح گویا تاریخ ادب کی گم شدہ لڑکیوں کو ہم رشتہ کیا۔ آل احمد سرور نے ٹھیک کہا ہے کہ :

”عبدالحق نے ہمارے کلاسیکی ادب کو جسے ہم مُردہ سمجھ بیٹھے تھے ہمارے لیے زندہ کیا۔ اُن کی تلاش و تحقیق نتائج کے اعتبار سے زبان کی تاریخ پر ایسا گراں قدر احسان ہے جسے اُردو زبان کے نام لیوا کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔“

تذکروں کے علاوہ انہوں نے بیسیوں و کئی مخطوطات کو گم نامی کے عمیق غاروں سے باہر نکالا اس طرح قدیم اُردو کے بہت سے گراں مایہ جواہر ریزوں نے، جو صدیوں سے دور دست مقامات خصوصاً غیر معروف خانقاہوں میں مدفون پڑے تھے، مولوی عبدالحق کی تلاش صادق کی بدولت زندگی کی روشنی دیکھی۔ ان پاریزہ سال کرم خوردہ کتابوں کی فراہمی سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ان کا پڑھنا اور انہیں پڑھ کر ان کے مطالب کی وضاحت کرنا تھا۔ اکثر مخطوطے خط نسخ میں تھے مگر ہندی اُصواف، حروف و اعراب میں فرق تھا۔ کتنے ہی لفظ متروک ہو چکے تھے، انہیں پڑھنا اور سمجھنا بڑا کٹھن اور دشوار تھا۔ مولوی عبدالحق نے یہ سب کھیکھ کر اُٹھائیں اور بڑی کاوش اور جان کا ہی سے متوں کو مرتب کیا اور قدیم دکن کی نظم اور نثر کی بہت سی کتابیں تصحیح، ذیلی حاشیے اور فرہنگ الفاظ کے ساتھ اہل اُردو کے سامنے پیش کیں۔

قدیم اُردو کے موضوع پر وہ برابر اپنی تحقیق کے نتائج مقالات و مضامین کی صورت میں شائع کرتے رہے۔ اُن کے تحقیقی مقالات اور قدیم نظم و نثر کی اشاعت نے اس عام نظریے کو

باطل کر دیا کہ اُردو لشکر ہی زبان ہے، جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہ جہان کے عہد میں جنم لیا۔ مولوی عبدالحق نے بابر کی آمد سے بھی سو برس پہلے کی کتابیں دریافت کیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر اُن کے بسیط تبصرے نے اُردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کو رُطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے بڑی تقطیع کے تقریباً اٹھارہ سو صفحات پر پچاس ہزار کے قریب اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ قدامتِ زبان کے سبب، قطب شاہ کا یہ کلیات عسیر الفہم ضرور ہے، لیکن بلاشبہ یہ اُردو ہی کی ابتدائی اٹھان اور صورت کا نمونہ ہے۔

مولوی عبدالحق کا ایک پرمغز تحقیقی مقالہ ”اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام کئی بار علاحدہ مختصر کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ دو اور طویل مقالے بھی کتابی شکل میں ملتے ہیں۔ ایک ”مرحوم دہلی کالج“ اور دوسرا ”مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر“۔ ۱۹۶۱ء میں انجمن کی طرف سے مولوی عبدالحق کے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ ”قدیم اُردو“ کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں اُن کے اٹھارہ گرانقدر مقالات شامل ہیں۔ ملک الشعرائے بیجاپور کے سوانح اور کارناموں پر ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب ”نصرتی“ بھی مولوی عبدالحق کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

غرض مولوی عبدالحق کی سعی و تلاش نے نہ صرف اُردو ادب کی تاریخ کو کئی صدی ادھر تک وسیع کر دیا یعنی گیارہویں کے بجائے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اسے بولتے ہوئے سنا دیا بلکہ اس کے سبب مرحوم ہاشمی آبادی کے لفظوں میں ہمارے سامنے ہندوستان کی قلمی تاریخ اور تہذیبی وحدت کے مطالعے کا ایک نیا باب کھل گیا۔

مولوی عبدالحق نے انجمن اور دوسرے اداروں یا اشخاص کی طرف سے شائع ہونے والی متعدد اور متنوع کتابوں پر بلند پایہ اور فاضلانہ مقدمات بھی لکھے۔ ان مقدمات کو سب سے پہلے مرزا محمد بیگ نے ۱۹۲۳ء میں دو جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کے کوئی ایک تہائی صدی کے بعد ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان مقدمات کو از سر نو مرتب کیا اور

بہت کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ انہیں ایک جلد میں شائع کیا اس ایڈیشن میں موضوعات وار مولوی عبدالحق کے ستاون مقدمات شامل ہیں۔ چند مقدمات سے قطع نظر جو اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، مقدمات عبدالحق کا یہ ایڈیشن مولوی کے کم و بیش سب مقدمات پر حاوی ہے۔

مقدمات عبدالحق کو تاریخ ادبیات اُردو میں بوجہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر محمود الہی نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر یہ مقدمے نہ ہوتے تو کلاسیکل لٹریچر کے تحفظ و احترام کا اور پھر اسے ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کا جذبہ اتنا عام نہ ہوتا، جتنا اب ہے۔ یہ مقدمات مولوی عبدالحق کے وسیع مطالعے، ان کی نکتہ رسی اور دیدہ وری کے شاہد ہیں۔ "مقدمات" کتاب، صاحب کتاب اور نفس کتاب کے امکانی وقوف کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس لیے بڑے پڑیہ اور سدا بہار ہیں۔ ان مقدمات سے مولوی عبدالحق کے تنقیدی شعور، ان کی تحقیقی استعداد اور ہر دو عناصر کے باہم امتزاج پر مولوی عبدالحق کی غیر معمولی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ مولوی عبدالحق محقق ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے بہت بڑے ناقد ادب بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مختصر مجموعہ ۱۹۳۹ء میں انجمن کی طرف سے "چند تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ایک مجموعہ تراب علی خاں باز نے "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا تقسیم ملک بعد ان کے تنقیدی مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تقسیم سے پہلے کے مجموعوں کو بھی کسی اعتبار سے نامندہ اور مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ مولوی عبدالحق نے ان کے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے تنقیدی مقالات و مضامین لکھے جو ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور بہت کچھ رسالہ "اُردو" کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ طرز جدید کے مطابق عملی تنقید کا مذاق عام کرنے میں رسالہ "رسالہ" کو جو مولوی عبدالحق کی زبرداریت پچھلے چالیس برس تک باقاعدگی سے نکلتا رہا، بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پریم چند نے بجا طور پر اسے اُردو رسائل کا قافلہ سالار کہا تھا۔ اس تھا۔ اس رسالے میں کتابوں پر تبصرہ کا حصہ ہمیشہ بڑا معرکے کار رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کے "غیر رسمی" تبصروں نے تنقیدی

لے برگ گل، بابائے اُردو (نمبر مرتبہ، راقم الحروف ورفقا، اگست ۱۹۶۲ء ص ۲۵۲)

129370

شعور بیدار کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا، ۱۹۴۷ء میں دانش محل لکھنؤ نے ”ادبی تبصرے“ کے نام سے مولوی عبدالحق کے بعض تبصرے کتابی شکل میں شائع لئے یہ نقد و تبصرے کا ایک معیار قائم کرتے ہیں اور آج بھی روزِ اول کی طرح بڑے وزن و وقار کے حامل ہیں۔

مولوی عبدالحق پر حالی شخصیت نے بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ تنقید کا جس کا ان کو حالی ہی کی صحبت میں لگا اور ان کے توسل وہ شیفتہ سے بھی متاثر ہوئے۔ بصیرت و شعور، ذاتی رائے زنی کی صلاحیت اور وسعتِ مطالعہ، نقد و بصر کے لیے انتہائی ضروری ہے خود مولوی عبدالحق کے لفظوں میں :

تنقید جس قدر عام ہے، اسی قدر مشکل ہے..... تنقید پر وہی بکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو۔ جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو۔ جس نے ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دلنشین کر سکتا ہے، ہماری زبان میں یہ کام صرف مولانا حالی مرحوم نے کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے وہ اس کے بانی ہی نہیں ایک اعلا پائے کے ادبی نقاد میں اور جن کی تحریریں ہمیشہ بڑی وقعت اور قدر سے دیکھی جائیں گی۔“

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۸۴)

عقلیت، واقعیت اور چھان بین، مولوی عبدالحق کی تنقید کے بنیادی عناصر ہیں۔ حالی کی طرح ان کی تنقید میں بھی گہرے تفکر اور آزادانہ رائے کی کمی نہیں۔ ان کے نزدیک :
”عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے، تنقید نظر نیچی کر لیتی ہے اور انصاف اُدھر منہ پھیر لیتا ہے.....“

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۷۳)

مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت اعتدال، توازن اور معقولیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وہ اُردو و نثر میں خوشگوار ہی، سادگی و منانت، اس کے موجودہ انقلاب و ارتقا اور

اس کی وسعت اور ادبی صلاحیت کو سُر سید کی مساعی کا نتیجہ کر دانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اُن کی تحریر کو تنقید سے بالا سمجھ کر، اپنی رائے کو عقیدت و محبت کی بھینٹ نہیں چڑھا دیتے بلکہ کمال عقلیت اور متانت کے ساتھ سُر سید کی نثر کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں :

”سُر سید کو ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسن بیان کو قربان کر دیتے ہیں اس سے اکثر اُن کی عبادت سُسْت اور پھسپھی معلوم ہوتی ہے۔“

(چند ہم عصر، ص ۲۹۲)

مولوی عبدالحق حاکمی کے سب سے بڑے تابع ہیں وہ اُن کے اتھاہ جذبہ انسانیت کو بڑھی قابل قدر چیز سمجھتے ہیں اور ان کی اپنی نیک نفسی، پاک سیرتی، سادگی اور شرافت نے اس جوہر کو خصوصیت کے ساتھ اپنا یا لیکن اسلوب احمد انصاری کے لفظوں میں حالی کے صحیح جانشین ہونے کے باوجود مولوی عبدالحق شخصیت کی چھان میں (ہیں حالی سے زیادہ دُور رس ہیں اور ان کا خیر و شر کا تصور عقلی ہے، جذباتی نہیں۔ وہ انتہائی ہمدردی محبت اور عقیدت کے باوجود اپنی رائے کے منصفانہ اظہار میں پس و پیش نہیں کرتے خود حالی کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوتے مولوی عبدالحق نے کسی رُور عایت سے کام نہیں لیا ایک موقع پر لکھتے ہیں

”شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے، کچھ نہ کچھ دشمنی آہی جاتی ہے ہمارے شاعروں میں تو تعالیٰ عیب ہی نہیں بلکہ شیوہ گوئی ہے۔ (حالی) سیدھی ساری باتیں کرتے تھے..... ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعالیٰ آگئی ہے۔“

(چند ہم عصر، ص ۱۶۸)

مولوی عبدالحق کی تنقید بے جھجک اور بے باک ہوتی ہے وہ نام کو نہیں دیکھتے۔

لے ”اُردو“ بابائے اُردو نمبر (مرتبہ سید وقار عظیم) اگست ۱۹۲۲ء ص ۱۹۰

سر سید کی عبارت میں ٹھٹھسا پن ہو یا حالی کی شاعری میں کہیں تعلق کا شاہدہ نظر آئے وہ اس کی نشاندہی سے نہیں چوکتے، ”چند ہم عصر“ میں سر سید کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ”ہم بے لاک رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں“ بایں ہمہ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک ممتاز اور نامور ہم عصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے متعلق جس بے جھجک انداز میں اپنی رائے مرتب کی ہے وہ ”قابل داد“ ہے:

(رشید احمد صدیقی) کے طرز بیان میں ایک بانگ پن پایا جاتا ہے، جس میں شوخی کی جھلک ضرور ہوتی ہے لیکن بعض اوقات لفظی کے الجھاؤ سے الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ صدیقی صاحب اردو کے ان انشا پر وازوں میں سے ہیں۔ جن سے بڑھی امیدیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی اقتدا انہیں کدھر لے جاتی ہے جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اُس میں بگڑنے کے لہجے بھی ہوتے ہیں۔“

(چند تنقیدات عبدالحق، ص ۱۰)

مولوی عبدالحق جذباتیت یا ذاتی پسندنا پسند سے کام لیے بغیر انتہائی توازن اور منطقی استدلال کے ساتھ اپنی چچی تلی رائے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر نہایت پختہ رہے ہوئے تنقیدی شعور کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہ تنقید کرتے ہوئے مواد اور اسلوب دونوں پر یکساں نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے تنقید کو عصر حاضر کے جدید رجحانات کے مطابق صحت مند بنانے میں بھی حصہ لیا کیوں کہ ان کے نزدیک:

شاعری کے انقلابات اور تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو شاعر سے اور اُس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو اُس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دینا۔“

(تنقیدات عبدالحق، ص ۱۰۵)

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت نہ صرف زیر نقد کلام کے ماحول اور اُس دور کے ان معاشرتی و سماجی اثرات پر جس میں اس نے جنم لیا ہے نظر ڈالنے میں بلکہ ”کلیم“

کے ذہن و دل کے در و بست کو بھی ٹٹولتے ہیں یعنی خارجی اور داخلی دونوں قسم کے کُسن و فتح پر نظر رکھتے ہیں تنقید اُن کے نزدیک عقیدت یا منافرت کا اظہار نہیں بلکہ اتہائی و تمہ دارانہ فرض ہے۔ وہ کبھی کسی موضوع کو اس وقت تک چھڑتے نہیں دکھائی دیتے جب تک اُسے ہر پہلو سے دیکھ بھال نہیں لیتے۔ انہوں نے تنقید کا تحقیق سے پیوند لگایا۔ موضوع زیر بحث کو اچھی طرح ذہن میں رچانے پانے کے بعد وہ تخلیقی عمل کے ماتحت اس کے معائب و محاسن کا تجزیہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں حیرت انگیز حد تک عقلیت، متانت اور اعتدال و توازن ملتا ہے۔

متین الرحمن مرقضی کے بقول شبلی کا یہ خیال درست ہے کہ حالی کنویں کی مانند ہیں جو محدود ہوتا ہے لیکن گہرائی رکھتا ہے اور خود شبلی نہر یا دریا کی مانند ہیں جس کی گہرائی اس کی وسعت کی بہ نسبت بہت معمولی اور حقیر ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے کنویں کی گہرائی اور دریا کی وسعت کو ہر دو بزرگوں سے کچھ اس طرح اصل سے بڑھ کر اپنایا کہ وہ بحر و خاں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو کنویں سے کہیں زیادہ گہرائی اور دریا سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

مولوی عبدالحق بہت بڑے خطیب اور اردو کے معروف و ممتاز وکیل اور مبلغ بھی تھے اول اول دو جلدوں میں مولوی عبدالحق کے خطبات علی الترتیب ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۲ء میں انجمن کی طرف سے شائع ہوئے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تیرہ خطبوں اور تقریروں کے اضافے کے ساتھ ان خطبات کو یک جا کر کے مرتب کیا۔ خطبات عبدالحق کے اس جامع ایڈیشن کی اشاعت ثانی ۱۹۶۴ء میں چار مزید خطبات کا اضافہ کیا گیا۔ اب اس مجموعے میں کل اڑتیس خطبے اور تقریریں شامل ہیں۔

یہ خطبات مختلف مواقع پر اور پاک و ہند کے مختلف مقامات پر دیے گئے۔ خطبات کا موضوع ہر جگہ زبان و لسان اور شعر و ادب کے مسائل و معاملات سے متعلق رہا ہے۔ اس کے باوصف یہ خطبے اعادہ و تکرار اور یکسانیت کے عیب سے کم و بیش خالی ہیں۔ وہ ہر مرتبہ اپنی

لے برگ گل، بابائے اردو نمبر ۱ مرتبہ راقم الحروف و نقلاً، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۸

بات زیادہ توانائی اور تازگی سے پیش کرتے اور اسے ذہنوں میں جھلاتے اور منواتے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھی خطابت کا ایک میزان معیار یہ بھی ہے کہ وہ سامعین کو کس حد تک زیر اثر لیتی ہے اس لیے خطابت کو شریفانہ نعرہ بازی کہا گیا ہے جس میں ہجوئی نفسیات کا دخل ہوتا ہے۔ مولوی عبدالمحق خطبات میں سامعین کو مختلف وسیلوں سے متوجہ کرتے ضرور نظر آتے ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کاوش میں ان کے خطبے وقتی ہو کر رہ گئے ہوں۔ یہ اپنے ”انداز گزارش و نگارش“ کے سبب زود اثر اور مواد و معنی کے اعتبار سے مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں۔

مولوی عبدالمحق کو انسانی سیرتوں کی عکاسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کی کتاب ”چند ہم عصر“ جس کا شمار ادبیات عالیہ میں ہوتا ہے اس کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے جن ہم عصروں پر قلم اٹھایا ہے، ان سے وہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوئے اور رہے ہیں۔ اس طرح سیرت نگاری کے لیے ہم عصروں کے انتخاب اور چناؤ کے سہارے ہمیں خود مولوی عبدالمحق کی سیرت، ان کے عقائد و نظریات اور مرکزی اقدار حیات تک رسائی میں بڑھنی بددلتی ہے۔ انھوں نے اپنے مدد و حین کی جن خوبیوں کو سراہا، جن عادات و اطوار کی ستائش کی اور جن شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان کی روشنی میں ہمیں مولوی عبدالمحق کے محاکے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔

مولوی عبدالمحق کے کردار کی تعمیر اپنے اُستادِ معنوی، اُستادِ حالی کے کردار کی طرح خالص پر ہوئی۔ حالی کی طرح وہ بھی سادگی کے دلدادہ ہیں۔ وہ ہمیشہ بیان میں سادگی اور صفائی پر زور دیتے ہیں۔ زبان میں بلاوجہ لفظی اور ثقالت کو بدعت خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک سادگی و پرکاری کا کمالِ ضامی ہے اس میں ادب بھی شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ فصیح تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں، اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تفسیح اوقات ہے۔

وسعت مطالعہ اور زیر فکر موضوع پر غائر نظر قدرتی طور پر سادہ بیانی کا موجب ہوتی ہے، مگر سادہ بیانی پر قدرت ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس کے لیے گہرا ریاض، وسیع مطالعہ اور فکر و نظر میں کشادگی ضروری ہے۔ پریشان خیالی تحریر میں ”دھندلا پن“ پیدا کرتی ہے۔ شعور ہی طور پر آراستہ زبان عجز بیان کا مظہر ہوتی ہے اور یہ ”شیوہ ضعیف اوسیت کی دلیل ہے“ اس عقب میں ہم اگر مولوی عبدالحق کی نثر کا جائزہ لیں تو ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حالی کے بعد وہ اردو کے سب سے بڑے نثر میں ان کے نزدیک :

”آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں۔ یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑھی کٹھن ہے وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا وہاں تو دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بے محل آگیا ہے تو ایسا ہی بڑا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور الجھا ہونا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں“

(خطبات عبدالحق، ص ۲۶۲)

سادگی اور صفائی کے مفہوم کی اس روشنی میں دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق — بسا اوقات حالی پر بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ انہیں کے مطابق :

”ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے۔“

(تنقیدات عبدالحق، ص ۱۲)

زبان میں لفظوں کی ساخت، عہد بہ عہد تغیر اور ان کے استعمال و معنی میں لطیف فرق و امتیاز کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ بعض اوقات عبارت میں موقع محل کے مطابق کوئی نامانوس اور غیر مستعمل لفظ یا ہندی یا سنسکرت اور بھاشا کی کوئی متروک ترکیب اس چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ تحریر میں جان پڑ جاتی ہے مثلاً ”چند ہم عصر“ میں مولوی چراغ علی کے متعلق یہ سطور کس قدر خوبصورت نظر آتی ہیں :-

”تحقیق و تفتیش کی چیلنگ تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے، اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کے مالیہ و ماحولیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔“

مولوی عبدالحق کی تحریر میں انسانی فکر و شعور کے لئے رہ نمائی، فنی قدروں کے نفاذ اور ادبی و لسانی مسائل پر احکام کی فراوانی ملتی ہے، جو ان کی بصیرت کی امین اور عظمت و بزرگی کی علامت ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے خطیب و معلم اخلاق بھی تھے۔ ان کی تحریریں اخلاقی درس کا بہت عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں اقوام عالم کے عروج و زوال علی الخصوص مسلمانوں کے ارتقاء و تنزل پر ان کی نظر گہری تھی وہ اسباب و علل کو ”اپنی نظر“ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں پائیدار تجربوں اور اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کی دولت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ ان کی تحریریں خیال افروز مقامات قدم قدم پر آتے ہیں، جن سے پڑھنے والے کو روشنی نصیب ہوتی ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف اسے کچھ دے رہا ہے اس کا وقت ضائع نہیں کر رہا۔ یہاں چند اقتباسات بے عمل نہ ہوں گے۔

”ادب میں حسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔“

(مقدمات، ص ۲۶۰)

”زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے بڑھنا خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض و غایت ہے۔“

(مقدمات، ص ۴۱)

”امراہ کی صحبت، آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی۔“

(مقدمات، ص ۴۸)

”اچھا استاد، دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔“

(مقدمات، ص ۳۰۳)

”صفت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔“

(ادبی تبصرے، ص ۷۶)

انتقام لینے والا، اکثر گھاٹے میں رہتا ہے۔“

(مقدمات، ۱۵)

نقالی، آخر نقالی ہے اور حدت کی دشمن۔“

(مقدمات، ۱۱۴)

بناوٹ کی باتیں جلد پُرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔“

(ادبی تبصرے، ۷۶)

”صرف سادگی ہی ایک ایسا حُسن ہے، جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال

نہیں بشرطیکہ اُس میں صداقت ہو۔“

(ادبی تبصرے، ۷۶)

”ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟“

(ادبی تبصرے، ۷۶)

”سچ کی چاہ، ہمارے خمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔“

(ادبی تبصرے، ۷۶)

”جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُس سے جھوٹ بولے۔“

(ادبی تبصرے، ۷۶)

اصلاح و ترقی کے لیے اخلاقی جرأت سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔“

(ادبی تبصرے)

گوہمات اور تعقبات کی اصلاح کی صورت ہے اور وہ ان کا

استیصال ہے۔“

(ادبی تبصرے، ۶۱)

”خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا انداز ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے

ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔“

(ادبی تبصرے، ۷۷)

جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں، وہ زندہ زبان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔

(اُوبی تبصرے، ۸۰)

”زندگی سب کے لیے مُعمر ہے۔ اس کے اسرار عقل سے نہیں کھتے۔“

(اُوبی تبصرے، ۸۶)

”ایسے مُصنّف و مؤلف جو حقیقی علم کا ذوق رکھتے ہیں، وہ اپنے ماخذوں کے حوالے دینے میں کبھی نخل نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ عالی ظرفی سے کام لیتے ہیں۔“

(چند تنقیدات عبدالحق، ۳۱)

”بڑائی میں بڑا کرنے والے کی تباہی کا سامان موجود ہوتا ہے۔“

(مکتوبات بابائے اُردو، بنام امامی، ۱۵۲)

یہ اقتباسات بغیر کسی خاص کاوش اور ترتیب کے پیش کر دیے گئے ہیں لیکن بلاخرط ان سے ایک نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے ہاں معنی و مفہوم کی اکائیوں اور لفظوں میں بہت کم فرق اور فاصلہ ہوتا ہے۔ انہوں نے دنیا کو دیکھا اور برتا تھا۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں، ذہن روشن تھا۔ اس سے ہٹ کر اور بڑھ کر وہ تاج کے استنباط کی خداداد صلاحیت سے مُتصف اور بہرہ ور تھے۔ یہی وجہ کہ زمانے، ذہن، زندگی، امکانات، زبان، لسان، انسان اور ادب و شعر وغیرہ سے متعلق انہوں نے جو باتیں کہی ہیں اور جس وقیع اور بلیغ انداز میں کہی ہیں وہ اُنھی کا حصہ ہے۔

مولوی عبدالحق اُردو کے بابا و میجا، بے لوث و بے مثال گزار، جید عالم، مجتہد قواعد و نگار ماہر لسانیات، قدر اول کے لغوی، محقق و نقاد، بہت بڑے خطیب اور مقدمہ نویس، عقب کے سیرت نگار صاحب طرز انشاء پرداز اور اعلیٰ درجے کے مفکر اور منتظم تھے۔ یہاں اس بات کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مولوی عبدالحق نے اُردو زبان کو عظیم میں مقبول عام بنانے کے لیے کس قدر جدوجہد کی۔ صرف تقسیم ہند سے پہلے ہی کے نو دس سالہ بیوفانی دوروں کی مسافت کا اندازہ لگایا جائے تو بات پچاس ساٹھ ہزار میل تک

پہنچتی ہے اس سے ان کی ہمت و استقلال، لگن و استقامت اور غیر معمولی تربیت اور
 دھن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس غیر معمولی اخلاص و انہماک، خدا داد قابلیت اور غیر منقطع
 جدوجہد سے بیدار ہی احساس اور جماعتِ اُردو کی جو عام لہر اور فضا پیدا ہوئی اس کا احاطہ
 دشوار ہے۔

غرض مولوہی عبدالحق نے اپنی بے پناہ تنظیمی قوت، غیرت معمولی استعداد کار اور اپنے
 جملہ وسائل و ذرائع کو تادمِ مرگ اُردو زبان و ادب کی ترویج و تہذیب کے لیے وقف رکھا۔
 ان کا سا جوشِ عمل اور انہماک رکھنے والا بے لوث خدمت گزار اُردو زبان کی تاریخ میں کوئی
 دوسرا نہیں گزرا۔

”چند ہم عصر“ کا تجزیاتی مطالعہ

[تحریر: ۱۹۶۳ء؛ نظر ثانی: ۱۹۷۴ء]

”ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں، صحرا بھی ہو، دریا بھی ہو، آسان ہے لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپر ہی نظر جو بیرونی اشیاء تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اسے عکس ریزہ (ایکس ریزہ) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو کبھی ٹولنا پڑتا ہے۔“

(مقدماتِ عبدالحق، ۳۴/۲۶)

مولوی عبدالحق، صاحبِ نظر تھے۔ انہیں انسانی سیرتوں کی بڑی پرکھ تھی اور اس پرکھ کو لفظوں کا متناسب پیرہن عطا کرنے کی غیر معمولی قدرت اور صلاحیت کے بل پر انہوں نے اپنے بعض رفیقوں، بزرگوں اور نیاز مندوں کے وہ وہ مرقعے تراشے ہیں، کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ ”چند ہم عصر“ اس ذیل کا یادگار مجموعہ ہے۔ اس سے اردو میں مرقع نگاری کا مان و ان سلامت ہے۔

مختلف اوقات میں لکھی گئی مولوی عبدالحق کی ان تجویزوں کو سب سے پہلے مولوی صاحب کے ایک عزیز اور لائق شاگرد شیخ چاند نے جمع کیا۔ لیکن وہ انہیں اپنی زندگی میں طبع نہ کر سکے۔ چاند کے انتقال (۱۹۳۶ء) کے بعد یہ مجموعہ سلسلہ انجمن ترقی اردو نمبر ۱۳ کے تحت، لطیفی پریس، دہلی سے شائع ہوا (سال اشاعت: ندارد، سائز: ۱۸ × ۲۲/۸، ضخامت: ۱۵۱ صفحات)۔

”چند ہم عصر“ کا پہلا ایڈیشن بہت کیاب ہے۔ یہ انجمن ترقی اردو (پاکستان)، کراچی کے کتب خانہ خاص تک میں موجود نہیں اور دس پندرہ برس کی تلاش کے بعد یہ سال گذشتہ

(۱۹۷۳ء) راقم الحروف کے ہاتھ آیا ہے۔ طبع اول کے آغاز میں منیجر انجمن ترقی اردو، لاہور، دکن کی طرف سے چودہ سطرہ "التماس" ہے جس سے کتاب اور مرتب کتاب کے عرائم اور انجام پر روشنی پڑتی ہے:

یہ مضامین، مرحوم شیخ چاند، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (دلیرچ اسکالر، جامعہ عثمانیہ) نے مختلف رسالوں، کتابوں اور تحریروں سے بڑھی محنت اور تلاش کے بعد جمع کیے تھے۔ ان میں سے کچھ تحریریں تو ایسی ہیں جو بعض بزرگوں کی وفات پر لکھی گئی تھیں اور کچھ کتابوں کے تبصرے کے ضمن میں لکھی تھیں۔ یہ سب مرحوم نے ایک جگہ جمع کر لی تھیں۔

مرحوم کی ایک فرمائش مولوی عبدالحق صاحب سے یہ تھی کہ سر سید احمد خاں، نواب عماد الملک اور مولانا حالی پر بھی اسی قسم کی تحریریں لکھ دیں، کیوں کہ مولوی صاحب کے ان تینوں بزرگوں سے خاص تعلقات تھے۔ مولانا حالی پر تو ایک مضمون لکھ دیا، لیکن باقی دو مضمون لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اگر طبع ثانی کی نوبت آئی تو امید ہے کہ اس کی تکمیل ہو جائے۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ ہر تحریر کے ساتھ فوٹو بھی لگا دیے جائیں لیکن اس کا بھی موقع نہ ملا، اسے بھی آئندہ کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ ان مضامین کی ترتیب بھی وہی رکھی گئی ہے جو مرحوم شیخ چاند نے رکھی تھی۔ افسوس، وہ اسے اپنی زندگی میں طبع نہ کر سکے اور اس سے پہلے ہی چل بسے۔ اب، اس جواں مرگ کی یاد میں یہ کتاب طبع کی جاتی ہے۔

اس ایڈیشن میں چودہ شخص مرقعے شامل ہیں۔ آخری خاکہ حالی کا ہے جس پر سال ۱۹۳۷ء ثبت ہے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ مجموعہ اس سال یا اس کے قریب بعد کسی وقت شائع ہوا۔

۱۔ سر سید پر "چند ہم عصر" کے تبصرے اور عماد الملک پر پانچویں ایڈیشن میں مضامین کا اضافہ ہوا
۲۔ "چند ہم عصر" کے چھ ایڈیشن مولوی عبدالحق کی زندگی میں شائع ہوئے لیکن تصایر کی نوبت کبھی نہ آسکی

۱۹۴۲ء میں "چند ہم عصر" کا دوسرا ایڈیشن، منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی مختصر "التماس" کے ساتھ انجمن کے سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۹۲ کے تحت جمال پریس دہلی سے طبع ہوا۔ اس میں راس مسعود اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکے تھے۔ نام دیو، مالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔ یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد نظر ثانی و اضافے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن قاضی احمد میاں اختر جو ناگڑھی کے دیباچے کے ساتھ چھپا سرسید پریس مولوی عبدالحق کاسیر حاصل خاکہ اس ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ تین سال بعد ۱۹۵۳ء میں انجمن ہی کی طرف سے "چند ہم عصر" کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس پر تحسین سرور ہی کا مختصر سا دیباچہ ہے اور اس میں عبدالرحمن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر ری ہٹ سٹیک اور عبدالرحمن بجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ "چند ہم عصر" کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس پر سال اشاعت کہیں درج نہیں۔ انجمن کے کتب خانہ خاص میں نسخے کے اندراج سے سال اشاعت ۱۹۵۶ء قیاس کیا جاسکتا ہے۔ نواب عماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔

"چند ہم عصر" کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی صاحب کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ اردو اکیڈمی سندھ کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں منشی امیر احمد مینائی پر مضمون (جو مولوی عبدالحق نے امیر مینائی کی وفات ہی کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شامل کر دیا تھا) اس اعتراف کے ساتھ حذف کر دیا گیا ہے کہ :

"یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نگاری ہے اور نہ ان کے کلام پر مکمل تبصرہ۔"

اس چھٹے ایڈیشن میں، جو مولوی عبدالحق کی زندگی میں "چند ہم عصر" کا آخری ایڈیشن ثابت ہوا۔ کل چوبیس شخصی خاکے شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق کچھ اور اصحاب پر بھی شخصی مضامین لکھنے کی فکر میں تھے۔ اس کی نشاندہی خود ان کے اپنے ایک خط مکتوبہ

۳۷
 ۳۲ اپریل ۱۹۵۶ء سے ہوتی ہے نصیر الدین ہاشمی کو لکھتے ہیں :
 آپ نے محسن الملک اور حیدری صاحب پر لکھنے کی فرمائش کی ہے
 محسن الملک پر کچھ چکا ہوں (دیکھئے! "چند ہم عصر" البتہ حیدری صاحب
 پر ضرور لکھوں گا۔ فی الحال اگر فرصت ملی تو گاندھی جی اور سرتیج بہادر سپرور پر لکھنے
 کا ارادہ ہے۔ گاندھی جی کی شخصیت بہت پیچیدہ، پراسرار اور گہری ہے میں
 بعض ایسے واقعات کا اظہار کروں گا جن کا علم اب تک کسی کو نہیں اور جن کے
 آشکار ہونے سے تہلکہ مچ جائے گا۔

یہ ہے کہ ان ممتاز شخصیتوں پر "لکھنے" کا ارادہ شرمندہ عمل نہ ہوا۔ گاندھی پر مولوی عبدالحق
 یہ ہے کہ ان ممتاز شخصیتوں پر "لکھنے" کا ارادہ شرمیدہ عمل نہ ہوا۔ گاندھی پر مولوی عبدالحق
 کا موعودہ مضمون خصوصیت سے بہت معرکے کا ہوتا مگر زندگی کی الجھنوں اور آخری ایام
 کی علالت نے انہیں اس کام کے انجام دینے کی مہلت نہ دی۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے
 پر انہیں علاج کے لیے مری کے کبائٹڈ ملٹری ہسپتال میں لے جایا گیا۔ گاندھی پر اپنے
 زیر قلم مضمون کی تکمیل کا خیال یہاں بھی انہیں ستا تا رہا۔ "مولوی صاحب کے آخری ایام"
 کے تحت ابن النشا صاحب نے لکھا ہے :

"ایک زمانے میں وہ گاندھی پر لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس کے متعلق
 ہندوستان سے شائع شدہ دو موٹی موٹی کتابیں بھی وہ پڑھ چکے تھے۔
 مجھ سے لوئی قشر کی کتاب بھی منگوائی۔ مری میں کہنے لگے دیکھو وہ گاندھی
 والا مضمون بھی پڑا ہے۔ اچھا، اب کے کراچی چل کے اسے پورا کرتا
 ہوں۔"

لیکن افسوس، "وہ اسے پورا نہ کر پائے۔ مری سے کراچی واپس آنے کے پانچویں
 روز بعد ان کا انتقال ہو گیا مضمون کا جو حصہ وہ لکھ چکے تھے، ناقص صورت میں، وہ بھی
 ابھی منظر عام پر نہیں آیا۔

۱۔ مکتوبات عبدالحق (مرتبہ: جلیل قدوائی) صفحہ ۳۵۱

۲۔ قومی زبان (بابائے اردو نمبر) ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۶

”چندم عصر“ کے آخری ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں جو چوبیس شخصی خاک کے شامل ہیں، ان میں مرزا حیرت پر مضمون مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس کی نشاندہی خود انہیں نے اپنے ”دیباچہ“ میں کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

”میرے ایک ایرانی نثر اد دوست مرزا حیرت کا بچا کھپا کلام لائے تھے، اور اس کے ساتھ یہ مضمون انگریزی میں لکھا ہوا مجھے دیا۔ اس کا ترجمہ اور حیرت کا کلام دونوں رسالہ ”افسر“ میں شائع ہوئے۔ شیخ چاند مرحوم نے یہ سمجھ کر کہ یہ میری تحریر ہے، ”چندم عصر“ میں داخل کر دیا“

”چندم عصر“ کے بقیہ تیس خاکوں میں سب سے پرانی تحریر پروفیسر ری ہٹ اسک پر ہے جو اول اول رسالہ ”افسر“ شمارہ جون ۱۹۰۱ء میں چھپی اور جسے تحسین سروری کے ہاتھوں ”چندم عصر“ کے چوتھے ایڈیشن میں پہلی بار شامل کیا گیا۔ آخری خاکہ خالدہ اویب خاں کا ہے جو کتاب کے ”آخری“ ایڈیشن کے لیے لکھا گیا لیکن اس سے پہلے ہفت روزہ ”لیل و نہار“ کے سالنامے ۱۲، اپریل ۱۹۵۹ء (جلد ۹ نمبر: ۱۵) میں شائع ہوا۔ اس طرح یہ شخصی مضامین ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک مختلف مواقع پر کم و بیش ساٹھ سال کی طویل مدت میں لکھے گئے۔

چندم عصر“ کے خاکے فرمائشی نہیں ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انہیں کی سیرتیں لکھی ہیں جن سے وہ ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ نصیر الدین ہاشمی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں =

”آپ نے سرور جنگ..... پر لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ سرور جنگ کے حالات سے میں زیادہ واقف نہیں لے۔

نصیر الدین ہاشمی ہی کے نام ایک دوسرے خط میں مولوی عبدالحق نے اپنے نقطہ نظر کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

”آپ نے سرور جنگ کے حالات کی فرمائش کی تھی، میں سرور جنگ سے

زیادہ واقف نہ تھا۔ میں نے کبھی کسی ایسے شخص کے متعلق کچھ نہیں لکھا جس کے حالات، خصائل اور سیرت سے مجھے پوری واقفیت نہ ہو۔ میں نے سرور جنگ کو دیکھا ضرور ہے مگر ذاتی طور پر ان کے حالات وغیرہ سے ناواقف ہوں۔

”چند ہم عصر“ کی سیرتیں ”ذاتی اور پوری“ واقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں۔ اس لیے اس میں بعض اشخاص خصوصاً، سرسید، حالی، مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بگرامی اور میرن صاحب کے ایسے ضروری حالات اور بعض قابل عزت پہلو اس طرح یکجا مل جاتے ہیں اور سامنے آتے ہیں کہ ان سے بہتر دوسری جگہ شاید ہی ملیں۔ یہ ”چند ہم عصر“ کا ایک اہم امتیاز ہے۔

”نواب صدربار جنگ مولوی حبیب الرحمن شردانی نے ”مقدمات عبدالحق“ کے ویلچے میں اس امر پر حد درجہ افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہم اُس طبقے کو ابھی سے فراموش کر چکے جو سرسید سے شروع ہو کر وقار الملک ختم ہوا۔

”کیسا ہی یہ عبرت ناک بیان ہو مگر واقعہ ہے کہ آج..... سب سے زیادہ گم ہستی سرسید احمد خاں مرحوم کی ہے، نام جاننے والے یا لینے والے بہت نکلیں گے مگر ان کے حالات جاننے والا، ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر پیروی کا شوق رکھنے والا، مجھ کو کوئی نظر نہیں آتا۔ پس مولوی عبدالحق صاحب کی وہ سعی جو انہوں نے اس طبقے کے کارنامے یاد دلانے کے لیے کی ہے، ہمارے شکر کی مستحق ہے“

”چند ہم عصر“ میں سرسید کی سیرت و سوانح پر مولوی عبدالحق کا شخصی خاکہ کم و بیش سو اسو صفحات پر مشتمل ہے، جو بجائے خود ایک الگ اور مستقل کتاب کو کفایت کرتا ہے۔ یہ بڑے خلوص اور خوبی سے لکھا گیا ہے۔ حالات و واقعات کی ضروری اور مناسب تفصیل پیش کی گئی ہے اور ان مباحث و کوائف سے صرف نظر کیا گیا ہے، جن کا مولوی عبدالحق کو پورا اور ذاتی وقوف نہیں تھا۔ ڈاکٹر اوور ہیر کے نام ایک خط میں مولوی صاحب سرسید

سے متعلق اپنے اس مرقع کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس میں میں نے اُن کے مذہب اور سیاست کو نہیں چھیڑا۔ سیاست کا ذکر سرسری کے۔ مذہب کے متعلق اس لیے کچھ نہیں لکھ سکا کہ اس بارے میں میرا علم جہل سے بدرجہ ہے۔“

عرض ذاتی واقفیت، مرقع نگاری کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی ایک — بنیادی قدر ہے جس کا انھوں نے ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ اس قدر کا نتیجہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کا تراشیدہ کوئی مرقع، سرسری یا ہوائی نہیں۔

مقدمہ ”ماثر الکریم“ میں مولوی عبدالحق نے ضمناً ایک بات کہی ہے جس میں سیرت کئی کے لیے اُن کے منیرانِ انتخاب کا اسارہ مخفی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

پند و نصائح اور اخلاقی کتب اس قدر مفید نہیں ہوتیں۔ جس قدر ان لوگوں کے تذکرے، جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے لے۔“

سرسری کے مرقع میں مولوی عبدالحق نے اپنے اسی خیال کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر اراثا ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی..... رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ اُن بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے، جنہوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دکھ سہے اور اپنے لیے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت ورہ نمائی کا کام دیں گے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔“

۱۔ مکتوبات عبدالحق، ۳۳، ۱۔ مقدمات عبدالحق، (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی) ۲۲۲

۲۔ ”چند ہم عصر“، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع ۱۹۵۹ء، ۳۳۵ و بہ بعد

اس اشارے اور اقتباس سے بجا طور پر یہ نتیجہ مرتب کیا جاسکتا ہے کہ اُن کے نزدیک امیر و، کا اولوالعزم، صاحب ایشیا، بندہ استقلال، اخلاص مند اور بے نفس و بے ریا ہونا شرط ہے۔ مولوی عبدالحق، شخص کے اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ سیرت کسی کے لیے اُن کا میزان انتخاب بھی یہی ہے اور مطیع نظر بھی۔ چنانچہ جہاں یہاں وہ ہر سیرت سے اس طرح کا کام لینے کی کوئی صورت پیدا کرتے ہیں۔ یوں دیکھتے تو اخلاق آمیزی اور سبق آموزی مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری کی ایک دوسری بدیہی قدر ہے۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں وہ امارت اور افلاس کا کوئی فرق روار کھتے ہیں اور نہ ایسی کسی دوسری ہی حد بندی کے قائل ہیں۔ انھیں انسانیت سے پیار اور اعلیٰ انسانی اقدار سے عشق ہے۔ وہ سچائی، نیکی اور حُسن کو کسی کی میراث نہیں سمجھتے۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ممکن ہیں، جیسی اونچی ذات والوں میں۔ اُن کا نقطہ نظر بے حد وسیع ہے جو ایک اعلیٰ فنکار کی شان ہے۔ وہ قوموں اور طبقوں کے امتیاز کو مصنوعی سمجھتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ کتنا ہی بڑا زمانہ کیوں نہ ہو دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہو سکتی اور اچھے بڑے ہر قوم میں ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے نواب محسن الملک اور مولوی چراغ علی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، نواب عماد الملک نواب محسن الملک اور مولوی سید علی بگرامی ایسے متجرب اہل علم و فن اور سید محمد مولوی عزیز مرزا، راس مسعود، خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، عبدالرحمن بجنوری، پروفیسر ری ہٹ سک، عبدالرحمن صدیقی اور ڈاکٹر اقبال ایسے نامور اور لائق فرزندوں کے دوش بدوش، ایک عریب سپاہی نور خاں اور ایک مالی نام دیو کے مرقعے بھی تراشے ہیں، اور اس فہمائش کے ساتھ کہ:

گوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں بلکہ غریبوں (اور عامیوں) میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔

ان خاکوں کے ذریعے مولوی عبدالحق نے نورخان اور نام دیو کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور خود مولوی الحق کے ادبی "نامہ اعمال" سے ان کی طویل طویل خدمات حذف کر دی جائیں تو بھی محض ان دو خاکوں ہی سے ان کی انسانی دوستی، وسیع النظری اور عظمت و بزرگی اپنی جگہ مسلم رہتی ہے اور وہ انسانیت کے بہت بڑے علم بردار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جاسکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک انسانی کی بڑائیاں ہی کا باعث نہیں ہوتیں، بعض اوقات اُس کی خوبیاں بھی اُسے لے ڈوبتی ہیں۔ مولوی صاحب محض نیکوں ہی کے ہی خواہ نہیں، وہ بدوں سے بھی ہمدرومی رکھتے ہیں اور دنیا کی بہت کچھ رونق کا ذمہ دار نہیں قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بُرائی۔ اس طرح انسان بے عیب نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے "مدوح" کے محض حسن ہی سے سروکار نہیں رکھتے، اُس کے عیوب و نقائص کا ذکر بھی کر دیتے ہیں اور یوں ان کی سیرت نگاری کسی مرحلے پر بھی پروپیگنڈا، نہیں ہونے پاتی۔ حالی کو وہ بے مثال خصائل کا بزرگ ہے، کہتے ہیں اور ان کی پاک سیرتی کے بڑے مداح ہیں لیکن ان کی کمزوری سے چشم پوشی نہیں کرتے۔

نام و نمود چھوڑ کر نہیں گیا تھا، ورنہ شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شینخی آہی جاتی ہے..... ہاں، شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلق آگئی ہے لہ،

مولوی محمد عزیز مرزا میں مولوی عبدالحق کو وہ تمام اوصاف دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی ملک و قوم کو اُس وقت سخت ضرورت تھی بلکہ لیکن وہ ان کی خوشامد پسندی کے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں شمس العلماء و اکابر مولوی سید علی بگرامی، مولوی عبدالحق کے نزدیک:

ہندوستان کے عہد جدید کے ان نامور علماء میں سے ہیں جنہوں نے علم و دانش مشرقیہ

۱۔ چندھم عصر، ۱۶۱
۲۔ چندھم عصر، ۱۶۸
۳۔ چندھم عصر، ۶۶
۴۔ چندھم عصر، ۶۵

و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن، علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ ان کی شخصی خامیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں:

”مروج میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُب جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں۔“

حکیم امتیاز الدین کو مولوی عبدالحق اپنا بے مثل دوست کہتے ہیں۔ لیکن اس محبت میں وہ ان کی طبیعت کی کمزوری اور ان کے مزاج کے لاابالی پن کو نہیں چھپاتے۔ لکھ نواب محسن الملک کی وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی کے مولوی عبدالحق بڑے مداح ہیں۔ لیکن اس مداح کے باوجود نواب محسن الملک کی کمزوری کو حد درجہ متبادل افسوس گردانتے ہیں کہ وہ گورنر وقت کی دھمکی پر اردو کی حفاظت میں قائم ہونے والی انجمن سے دستبردار ہو گئے۔ وہ سرسید اس مسعود کی طباعی، ذہانت، قابلیت صلاحیت اور حافظے کے قائل ہیں، لیکن اس ”معتقد“ کے ساتھ ہی وہ ان کی شخصی کمزوریوں کے اظہار میں کوئی سمجھک محسوس نہیں کرتے:

”مسعود میں مُقلبے کی قوت مُطلق نہ تھی۔ وہ بڑے ذکی الحسن تھے، ذرا سی مخالفت سے پریشان ہو جاتے تھے۔ خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی تو انہیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آ جاتے تھے۔“

اردو شریں انقلاب اور ترقی اور اس کی وسعت و ادبی صلاحیت کو وہ سرسید کا طفیل گردانتے ہیں۔ لیکن اس رد میں وہ ان کی خامیوں کو نظر انداز نہیں کرتے:

۱	چندیم عصر، ۶۷	۲	چندیم عصر، ۱۰۶
۲	چندیم عصر، ۱۱۶	۳	چندیم عصر، ۱۳۹
۳	چندیم عصر، ۱۵۰	۴	چندیم عصر، ۲۰۰
۴	چندیم عصر، ۱۹۸	۵	چندیم عصر، ۲۸۵

”انھیں ادا کے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حسین بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر ان کی عبارت سست اور بھس بھسی معلوم ہوتی ہے،“ لہٰذا مولوی عبدالحق، حسرت موہانی کی پے پایاں روحانی قوت، اخلاقی جرأت اور خلوص و صداقت کے معترف اور معترف ہیں لہٰذا ”لیکن اس عترے میں وہ ان کی انتہا پسندی کو نہیں کہہ سکتے لہٰذا وہ نواب عماد الملک کی بے دریغ علمی سرپرستی علمی فیض رسائی فاضلانہ استغناء، اعلیٰ سیرت اور لے لوٹ کر دار پر اچھے لفظوں کے خراج کے ساتھ ساتھ، نئی طرز معاشرت اور آئے دن کے تغیرات سے پیدا شدہ ان کی بیزاری اور تن آسانی کا بھی ذکر کرتے ہیں لہٰذا

اس توازن اور غیر جانب داری کا نتیجہ ہے کہ ان کی سیرت نگاری پر نہ صرف یہ کہ منافب یا افزا کا الزام نہیں آتا، ان کے کسی ممدوح پر فرشتے یا شیطان کا گمان نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس یہ سیرتیں جامد، یک رخ اور ناویدہ معلوم ہونے کے بجائے مانوس، مدور اور مکمل معلوم ہوتی ہیں۔ اسی ”توازن“ نے مولوی عبدالحق کے تراشیدہ مرقعوں کو سدا بہار اور ان کی سیرت نگاری کے فن اور عمل کو کلاسیکل بنایا ہے۔

سیرت نگاری اور سوانح عمری میں پھیلاؤ اور سہماؤ کے امتیاز سے قطع نظر، بہ اعتبار فن بنیادی فرق ہے۔ سوانح عمری سے انصاف کے لیے تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے جامد واقعات اور اٹل حقائق سے آنکھیں چار کرنا ہوتی ہیں، جس کے لیے لامحالہ ایک ٹھہراؤ اور سکون و رکار ہوتا ہے۔ سیرت نگاری میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو اسی کرنا پڑتا ہے اور چند اہم اور خیالی افزا اشاروں اور شخصیت کی رنگارنگی میں سے کچھ نمایاں اور نمائندہ نقوش کے محتاط انتخاب سے پوری شخصیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس عمل میں ایک طرح کی تیز روی کی بھی ضرورت ہوتی ہے،

۱۔ چند ہم عصر، ۲۹۲ لہٰذا چند ہم عصر، ۳۶۳، ۳۶۴ (علی الترتیب)

۲۔ چند ہم عصر، ۲۳۵

تاکہ شخصیت کی نیزنگیاں ایک آن جھلک دکھا کر، کسی مجموعی باتیکھے اور واضح نقش کے ابھرتے میں معاون ہو سکیں۔

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری میں ہمیں انفرادی شخصی تاثر کے ساتھ تاریخی اور واقعاتی چھینٹے بھی ملتے ہیں۔ اس خوش گو اور امرتراج نے ان کی مرقع نگاری میں تنظیم و تہذیب اور ان کے محاکات کی فضا میں سرشاری حیات کی کرامت پیدا کر دی ہے۔ "شعرا و شاعری" کے بارے میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"شاعری کے انقلاب اور تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات و تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شاعر کو شاعری سے اور اُس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہی ہے جسے کسی شخص کو اُس کے اجباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دینا۔ جب ہم شاعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات اُس کی طبیعت، اُس کے خصائل اور عادات پر نظر ڈالیں اور اس کے عہد کے واقعات و حالات و تغیرات و انقلابات کا ذکر کم اس حد تک ضرور کریں جہاں تک ان کا تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری، اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے،"

یہ کچھ شاعر ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی شخص اپنے عہد کے حالات سے کم یا زیادہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیرت نگاری کے ذیل میں بھی مولوی عبدالحق کا میزان معیار بعینہ یہی ہے وہ اپنے "مدوح" کو بھی اُس کے زمانے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے اور نہ اُس کے عہد کے حالات سے بے نیار ہو کر اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔

۱۷ تنقیدات عبدالحق ، ۸۷

سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے۔ مسلمانوں میں دو چار خاندان ایسے تھے جنہوں نے کش مکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہنچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لیے بڑھے اور زمانے کے ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری کی ایک اور خصوصیت ان کی سچائی اور بے باکی ہے۔ وہ اسلاف کی اس نسل کی یادگار تھے، راست گوئی اور راست بازی جس کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے اور ہر حال سچ بات کہہ گزرتے تھے، خواہ اس کے لیے انہیں کتنی بڑی سے بڑی قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑتی۔ اظہارِ حق سے وہ کبھی نہ جھکے۔ اس میں انہوں نے دوست، دشمن کوئی اور کسی طرح کا امتیاز نہ رکھا۔ مولانا محمد علی کی سیرت اور کردار اور شخصیت کا حقیقت آفرین اور جرأت مندانہ محاکمہ مولوی نے کیا اور ۱۹۳۲ء میں اس وقت کہ جب مولانا محمد علی کی ”خانہ زاد“ موت نے انہیں ہند کے مسلمانوں میں بہت برگزیدہ، محترم اور متبرک بنا دیا تھا، مولوی عبدالحق کی بے باکی جرأت صلابت مواخذہ اور متوازن سیرت نگاری کا شاہکار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ہندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے، مولانا محمد علی مرحوم ”عجیب و غریب“ شخص ہوئے ہیں۔ وہ، مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مُبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔ وہ آزادی کا دل دادہ جبر و استبداد کا پکڑا دشمن تھا، لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور متبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ

۱۔ چندیم عصر، ص ۳۸۲ و بعد

جاتی تھی۔ دوست بھی اُس کے جانثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے..... وہ جب کسی کام کو اٹھاتا تو بڑی شان و شکوہ سے اٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا۔ لیکن تکمیل کو پہنچانا اُس کی طبیعت میں نہ تھا..... محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیوپیکر شخص تھا۔ اُس کے رُفقا اور اس کے ہم عصر اُس کے سامنے پوونے تھے مگر افسوس اُسے اپنے اُوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی اے،

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری کا ایک اور اہم اور ممتاز پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی زیرِ تحریر شخص کے مدِ مقابل یا فریق کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ سیرت نگار کے طور پر انہیں ہمیشہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں اور نزاکتوں کا خیال رہتا ہے وہ اس فن کو بہت ناخوب جانتے ہیں۔ نواب حبیب الرحمن شیروانی نے ٹھیک کہا ہے کہ مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں جس طرح حالات لکھے ہیں وہ:

"نمونہ ہیں کہ کسی ممتاز آدمی کے اوصاف پر مخالفت، موافق رائے کس طرح ظاہر کی جائے گی۔"

مولوی عبدالحق نقائص اور عیوب پر استہزا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے محاکے کو "وعظ" بناتے ہیں۔ بلکہ ایسے مواقع پر اُن کا لب و لہجہ بطور خاص زیادہ ہی ہمدردانہ ہوتا ہے اور اس وصف نے، جو انسانیت پر گہرے یقین کا نتیجہ ہے، اُن کی سیرت نگاری میں انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ مولانا محمد علی کی سیرت کے سخت محاکے کے بعد وہ طعن و تشنیع کے تیر نہیں چلاتے بلکہ عام فکر اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں:

"محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وہ اپنے کاموں کے لیے گھر بیٹھے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کر سکتے تھے۔ لیکن وہ اسلئے دردی بے پروائی اور غیر ذمہ دارانہ طور پر اسے صرف کرتے تھے۔ ہم میں (خاص کر

۱۔ چند ہم عصر، صفحہ ۱۵۲ اور بعد ۲۔ مقدمہ، مقدمات عبدالحق

یو۔ پی والوں اور خصوصاً مسلمانوں میں، اب تک زمیندار کی شان قائم ہے جو بادشاہی شان کی نفل ہے۔ ہم انتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے۔ ہم صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ لوٹنا اور لٹانا!

محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شے کے لیے ہم لڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبقتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں، اس کے لیے پختہ سیرت اور اعتدال طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔“

”چند ہم عصر“ کی اہمیت اسی قدر نہیں کہ اردو ادبیات عالیہ میں سیرت نگاری کے لیے اسے نشان راہ کا درجہ حاصل ہے بلکہ اس کی اہمیت بہت کچھ یوں بڑھ جاتی ہے کہ مولوی عبدالحق نے سیرت نگاری کے لیے جن بنیادوں پر کچھ یادگار زمانہ شخصیتوں کا چناؤ کیا، ان کی جن خوبیوں کو سراہا اور جن شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے، اس سے نیک و بد کے بارے میں خود مولوی عبدالحق کے اپنے معیار، معتقدات و اولیات مرکزی اقدار حیات اور ان کے بنیادی انسانی زاویہ نگاہ اور نقطہ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ بہت بری بات ہے۔“

خوش معاملگی، مہر و وفا، ہمدردی، مروت، بے نفسی بے ریائی، رواداری، ہیر سہی اور عالی ظرفی کو مولوی عبدالحق انسانیت کا جوہر تصور کرتے ہیں۔ سچائی، اصول پرستی، وضع داری، آن بان اور خود داری کو طرہ اشرف جانتے ہیں۔ اخلاق کو انسان کی فضیلت

لے چند ہم عصر، ۱۵۴ء بعد

اور برتری کی اساس ٹھہراتے ہیں۔ انسانیت ان کے نزدیک ایشا سے عبارت ہے۔ وہ کمال کو شوق اور محنت اور بے تعصبی کے وصف کو طبیعت کی انصاف پسندی کا خازنہ تصور کرتے ہیں۔ خود مہمتی کو بڑے پن کی علامت ٹھہراتے ہیں اور جلب زر کو عارضہ خیال کرتے ہیں اور ہم عمروں اور چشموں کی رقابت کو عیب اور خوشامد پسندی کو انسانی ضعف سے تعبیر کرتے ہیں۔

قومی اتحاد اور یگانگت کے لیے لباس کی یک رنگی کو مولوی عبدالحق ضروری سمجھتے ہیں لیکن مذہب ان کے نزدیک ذوقی چیز ہے جسے علم و فضل سے کو واسطہ نہیں صحیح ذوق کو وہ زندگی کی جان تصور کرتے ہیں اور اس کے بغیر علم و فضل کو بے نتیجہ اور بے ثمر گردانتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد ان کے نزدیک فکر کو جلا بخشنا ہے اور ایسی تعلیم کو جو صحت کے ساتھ واقعات پر نظر ڈالنے کی اہلیت پیدا نہ کرے، وہ بے معنی خیال کرتے ہیں۔ زندہ ولی کو وہ سلامت مطبع اور جائیت کی نشانی اور ظرافت کو دلیل ذہانت تصور کرتے ہیں اور روشن زندگی میں حسن کاری کے لیے ان کے نزدیک قدیم وضع اور جدید تہذیب کا امتزاج ضروری ہے۔

سادہ زبان لکھنے کو وہ آسان نہیں سمجھتے اور سلامت کے ساتھ ساتھ لطف بیان اور اثر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور اور دستگاہ ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ان کے نزدیک یہ ہے کہ لوگ اُسے پڑھیں اور اثر قبول کریں اور جو یہ خوبیاں مفقود ہوں تو ایسی تحریر کو وہ بیکار محض اور تضحیح اوقات کا باعث قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی تحریر یا ادب کی گشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھینا پڑتا ہے۔ ضبط اور اعتدال اور لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال ان کے نزدیک ادیب اور ادب کا بڑا کمال ہے۔

کام ان کے نزدیک اسی وقت کام رہتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام کو وہ بیگار کہتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ یہ کام اور کردار ہی ہے جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتا ہے اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے ہی میں ان کے نزدیک

ساری بڑائی اور نیکی ہے اور نیکی کو وہ اسی وقت تک نیکی خیال کرتے ہیں جب تک کہ آدمی کو اس کا احساس نہ ہو۔ چند تراشوں سے مولوی عبدالحق کے اعتقادات و ایقان، اُن کے بنیادی انسانی زاویہ نگاہ اور ادبی و فنی نقطہ نظر کے سمجھنے میں سہولت ہوگی!

اُتراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خود داری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس قدر نہیں کر سکتا۔ اس لیے شریف رونا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھولتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔“

(گڈڑی کالال نور، ۱۲۵۶)

ڈھ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں..... اُن کی زندگی بے لوث تھی اور..... (اس کا) ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا..... تو میں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش تم میں بہت سے نور خان ہوتے۔“

(گڈڑی کالال نور خاں، ۳۸۱-۱۲۷)

اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں، وہ انہیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

(مولانا وحید الدین سلیم، ۱۲۳)

ایک بات ان کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے غدر کے ہنگامے میں ان کے استاد لاپتہ ہو گئے یا مارے گئے تھے۔ اُنہوں نے دوڑ لگیاں چھوڑی تھیں جو بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ میرن صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو ڈھونڈ کر اپنے گھر لے آئے اور اپنی بیٹیوں کی طرح اُنہیں پالا پوسا اور ایسی محبت و شفقت کی کہ وہ باپ کو بھول گئیں..... حق شاگرد ہی شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو یہ وضع داری، یہ محبت و شفقت اور ایثار، اب کہاں نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر دوسروں

کی خدمت کرنا یہی جو ہر انسانیت ہے۔

(میرن صاحب صفحہ ۲۲۲ و بعد)

تغصب اُن میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے بے تعصبی کا وصف اُن ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

(حالی، صفحہ ۱۶۳ و بعد)

”ہم عسروں اور چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے..... مولانا اس عیب سے بڑی معلوم ہوتے ہیں۔“

(حالی، ۱۶۶)

’قومی لباس کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور مذہب کا ایک ہونا۔‘

(سر سید احمد خاں، ۲۵۸)

’اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا لگتا ہے، وہ خود کبھی نہیں پڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔‘

(مولوی چراغ علی، ۱۳)

’بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ محبت اور ہمدردی اُن کی گھٹی میں تھی..... وہ بہت بے نفس شخص تھے۔ جلب زر کا عارضہ جو آج کل نئی تانتی میں عام طور پر پایا جاتا ہے، اُن میں بالکل نہ تھا۔‘

(ڈاکٹر محمد اقبال، صفحہ ۲۵، ۲۵۹)

’مروجہ ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ ورگزر کا یہ عالم تھا کہ اُن سے کیسی ہی بد معاہلی اور بد سلوکی کیوں نہ کرے ان کے تعلقات میں فرق نہ آتا تھا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو

وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں۔“

(حالی، ۱۸۳۰)

باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے۔ اسے علم سے کوئی واسطہ نہیں۔“

(مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، ۱۱۹)

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔“

(چندیم عمر، ص ۲۵۵)

صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفر حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔“

(نواب عمار الملک، ۲۲۳)

سید محمود معمولی سے معمولی بات میں وہ شان پیدا کر دیتے تھے، جو دوسروں کو نہیں سوچتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔“

(سید محمود، ۵)

ظرافت و لیل و لہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارگراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑھی موعین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن مرحلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔“

(سرسید احمد خاں، ۲۲۶)

سادگی و پرکاری کمال صناعتی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ آسان الفاظ جمع کر دیے جائیں ایسی

تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لُطْفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ اُس وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے، جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیال کو صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کا اثر قبول کریں اور لُطْف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار تصنیع اوقات ہے۔“

(دستِ سید احمد خاں، ۲۸۶، و ب بعد)

”لفظ کا صحیح اور برعمل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ نکلنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے دلوں میں گھر کر لیتے کے جوگز ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔“

(حالی، ۱۶۸)

”کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔“

(چندیم عصر، ص ۲۸۳)

”ضبط اور اعتدال اُن کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دونوں بیاں اُن کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ بات صرف اساتذہ کے کام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں اگر آدمی سررشتہ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔“

(حالی، ۱۴۶)

”انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اُس کی آل اُولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔“

(مولوی چراغ، ۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے سے ہی انسان بنتا ہے اور اسی سے اُس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اُس کے دماغی اور اخلاقی قوار کی چلا ہوتی ہے اس مراد وہ کام ہے، جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق اُسے اور اُبھارے ورنہ کام کام نہیں رہتا، بیگار ہو جاتی ہے۔

(سرسید احمد خاں، ۱۲۲۶)

نیکی اُس وقت تک نیکی ہے، جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی..... ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں پہنچنے کی کوشش میں ہی انسان، انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی، اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فائدہ پہنچایا؟

(نام دیومالی، صفحہ ۲۳۱ و بعد)

”چند ہم عصر“ کے ان متفرق اقتباسات سے صرف مولوی عبدالحق کے معتقدات ہی لاپتہ نہیں چلتا بلکہ یہ شہ پارے داغ داغ اُن کے اعلیٰ درجہ کے مفکر ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ وہ دیر اصل بنیادی طور پر مفکر ہی تھے۔ لیکن زبان و ادب کے پھیلاؤ اور بچاؤ کے سلسلے میں اُن کے طول طویل مجاہدے نے اُن کے اس وصف کو ثانوی حیثیت دے دی، اور نہ حقیقت یہ ہے کہ زبان و ادب اور شعر و فن کا مسئلہ ہو یا زندگی اور کائنات کا کوئی معاملہ فکر و عقل کا دامن کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں جاتا۔

اقوام و عقل اور خاص طور پر مسلمانوں عروج و زوال کے اسباب و علل پر مولوی عبدالحق کی گہری نظر ہے اور تاریخی و تمدنی بصیرت و شعور ایسا پایا ہے کہ کم ہی کسی میں

ہوگا۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی عقلیت پسندی حقیقت پرستی، متوازن مزاجی اصابتِ رائے اور منطقی استدلال و قوت کے سہارے ایسے گراں قدر نتائج اخذ کیے ہیں، جو صحت و توانائی کی دولت سے مالا مال ہیں:

”کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلیٰ قابلیت کا ہونا ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصبِ پاکسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی، تو اُس کی ترقی شاہِ راہ تمدن پر بہت سُست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اُس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں اعلیٰ ترقی کی ہو۔“

(مولوی چراغ علی، ۲۱)

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا، اس کا رزاق حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے،

(چند ہم عصر، ۳۸۲)

”مسلمانوں کو منظم طور سے احتجاج کرنا اور ہل چل مچانا نہ پہلے آتا تھا، نہ اب آتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ خسارے میں رہے۔“

(سر سید احمد خاں، ۲۱۳)

زوالی یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔“

(سر سید راس مسعود، ۱۹۷)

”چند ہم عصر“ کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ شخصیتوں کا یہ انتخاب اور چناؤ محض سیرت کشی کی ”خانہ پرہی“ ہی کے لیے نہیں تھا، وہ زندگی میں ان سے کہیں نہ کہیں متاثر ضرور ہوئے۔ متاثر محض ان معنوں میں ہی نہیں کہ ان شخصیتوں کو انہوں نے اپنے تئیں

آدمیت و انسانیت کی مکمل اکائی اور عظمت و بزرگی اور بڑائی کا معیار جانا، یقیناً انہوں نے ایسا سمجھا اور قدرتاً شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی پیروی بھی کی، لیکن اس سے قطع نظر اس انتخاب اور چناؤ کے پس پشت بہت کچھ ان شخصیتوں سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی رحمان و میلان اور گذرانِ حیات کے ضابطوں اور اصولوں میں ایک گونہ اشتراک کو دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "چندم عصر" کے نگار خانے میں ہمیں قدم قدم پر مولوی عبدالحق کی طبیعت کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ جگہ جگہ ان کی اپنی پرچھائیاں اور جھلکیاں ملتی ہیں اور ان نے آئینہ خانہ فن کے عرض میں ان کی اپنی شخصیت کا جو ہر تڑپتا نظر آتا ہے۔ اور یہ "چندم عصر" کا بہت ہی نادر پہلو ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے یہاں ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

شخصیتوں کو آڑ میں ان کا جذبہ بے اختیار شوق دیدنی ہوتا ہے اور ان پر "عشق پیسہ" میر کے لیے "آفتِ زماں" کا گناہ ہونے لگتا ہے، جو اپنے سارے مطلب پر دے میں ادا کرے ہے۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا تھا، غالب کے شاگرد مغوی عبدالحق کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی اُفتاد پیش آئی۔ ان کے دل کا معاملہ شخصیتوں کے انتخاب کے ہاتھوں کھل گیا لیکن یہ جگہ ہنسائی اور رسوائی والا مضمون نہیں، جو شخص کوئی زبان بولتا اور لکھتا ہے اُس میں وہ کچھ نہ کچھ اپنی زندگی کے نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ قدر اور قامت کے لحاظ سے جو جتنا بڑا ہوگا، اتنا ہی اُس کی تحریر میں زندگی کا رچاؤ زیادہ ہوگا۔ زبان کو بولنے اور لکھنے والے لاکھوں اور کروڑوں ہوتے ہیں، لیکن چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو زبان و ادب پر اس قدر اثر انداز ہوں اور اتنے جذب سے لکھنے پر قادر ہو سکیں کہ تحریر میں ان کی زندگی ہنستی بولتی، سانس لیتی دکھائی دینے لگے۔ میر، غالب اور عبدالحق ان ہی معدودے چند لوگوں میں سے ہیں۔ عبدالحق کی تحریروں سے ان کے دل کے معاملے کا کھلنا ان کی عظمت کا مظہر ہے۔ مولوی عبدالحق سادگی و پُرکاری پر ایمان رکھتے ہیں اور آراستہ بیانی کو صعب ادبیت کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ ان کے انداز میں تراش ہے نہ بانچہن اور نہ ایسی چکا چوند ہی جو ایک ٹائپ نے کوروشنی دکھا کر اندھیاروں کو اور گہرا کر دے بیانی کو، بصارت کو مفلوج کر دے۔

اس ضمن میں ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا مضمون "ذکر عبدالحق"، مطبوعہ نقوش، لاہور، شمارہ ۲، صفحہ ۲۹ تا ۳۸

مہر و محنت مولوی عبدالحق کے مزاج و کردار کا جزو اعظم ہے۔ اُن کا اسلوب بھی انہیں اوصاف و صفات کا مظہر ہے۔ صدیوں کے مٹھاس سے ملو اُن کا مشفقانہ، شگفتہ رُواں، دھیمہ اور ہمدردانہ لب و لہجہ ذہن کو شفاف، ہلکی سُہانی، یکساں اور مُستقل روشنی کی دولت عطا کرتا ہے۔

پروفیسر عتّام حسین نے کہیں "چندم عصر" کے کسی خاکے کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے پڑھ کر ہمیں اپنے ماحول میں روشنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ٹھیک کہا ہے کہ اس میں مدوح کے کردار کی بلندی اور شخصیت کی دل کشی کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کے انداز نگارش کو بھی برابر کا دخل ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحریر میں مزاج کا عنصر شامل رہتا ہے، لیکن اُن کی مُسکراہٹ، وقار اور سنجیدگی سے خالی نہیں ہوتی وہ اس لیے ہنستے ہیں کہ ہنسنا "شے لطیف" کا تقاضا بھی ہے اور ایک کثیر الاشغالی شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ بھی۔ لیکن بہتوں کی طرح محض ہنسانے اور ہنسنے کا کاروبار انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ "چندم عصر" میں مولوی عبدالحق کے مزاج کی عام اور تیز جھلکیاں نہیں ملتیں۔ بایں ہمہ جہاں تہاں خاکوں میں ظرافت اور زندہ دلی اس طرح موجود ہے، جیسے بادلوں سے چاندنی چھن رہی ہو۔ پُر وقار اور اجیالے سے تلبتم کی جھلک اُن کی تحریر میں بڑھی شیرینی پیدا کر دیتی ہے۔

"چندم عصر" کے خاکوں میں سے کچھ تقریریں ہیں، بعض اصحاب کے حالات مولوی عبدالحق کے مسکاتیب یا دوسری تحریروں سے اقتباس کر کے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تحریریں خاکہ نگاری کے فن پر پوری نہیں اُترتیں انہیں فن کے مقررہ آداب و معائیر پر جانچنا ہے بھی زیادتی۔ اس لیے کہ ان کا مقصود بالذات سیرت کشی نہیں تھا۔ یہ تحریریں خاکوں کے بطور لکھی ہی نہیں گئیں یہ خاکے نامکمل ضرور ہیں، لیکن خاکہ نگاری کی سبب خوبیوں سے خالی نہیں۔ حکیم امتیاز الدین اور شیخ غلام قادر گرامی کے خاکے ایسے ہی ہیں۔ انہیں "سیر حاصل" تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان میں شخصیت کے کلیدی پہلوؤں کی طرف ایسے ضروری اشارے

لے و لے نقوس شماره ہستی ۱۹۵۹ء صفحہ ۸۲، ۸۳ علی الترتیب

جن کی بنیاد پر پھر پور خاک کے کھے جاسکتے ہیں۔

چند ہم عصر کی وہ سیرتیں جو خاص طور پر لکھی گئی ہیں، بہت و مواد دونوں کے اعتبار سے بڑی قابل قدر ہیں۔ ربط خاطر نے انہیں لکھوایا ہے، کاوش، توجہ اور سلیقے نے انہیں وقوع بنایا ہے۔ ان میں سیرت پر محاکمہ بھی ہے اور عقیدت و محبت کا خراج بھی لیکن ہے یہ سب کچھ ایک خوش گوار امتزاج، توازن اور اختصار کے ساتھ۔ ان کے ایک ایک جملے سے خلوص، محبت اور صداقت کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے ”مدوح“ ہمارے سامنے ہنستے بولتے پھلتے پھرتے اپنی واقعی شکل و صورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں اور یہ سیرت نگاری کا بہت بڑا کمال ہے۔ نور خان، نام دیو، میرن صاحب، سرستید، عالی، چراغ علی، سید علی بنگرامی، عماد الملک محسن الملک اور راس مسعود کا شمار ایسے ہی خاکوں میں ہے۔ یہ عبدالحق کے شاہکار اور اردو کے جواہر آبدار ہیں، ان کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔“

بابائے اردو۔ ایک کرشمہ ساز شخصیت

”اس برس اس شہر (لاہور) کے یوموں میں ایک نئے یوم کا اضافہ ہوا۔ یہ یوم مولوی عبدالحق کا تھا۔ اب تک مولوی عبدالحق کی برسی منانے کی ساری ذمہ داری کراچی کے سرٹھی۔ اس برس لاہور نے پاکستان کونسل کی معرفت اس بوجھ کو بنایا۔ پاکستان کونسل میں پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ معین الرحمن نے مقالہ پڑھا۔ پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، اور حامد علی خاں صاحب نے تقریریں کیں۔“

[انتظار حسین، لاہور نامہ، مشرق لاہور ۳۰۔ اگست ۱۹۷۱ء]

(بابائے اُردو کی دسویں برسی کے موقع پر ۲۰ اگست ۱۹۷۶ء کی سہ پہر، پاکستان کونسل کے لاہور مرکز نے "بابائے اُردو کی یاد میں" ایک تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت پروفیسر حمید احمد خان نے فرمائی۔ ذیل کا مضمون اسی تقریب میں پیش کیا گیا۔)

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں "بابائے اُردو کی خدمات" کے موضوع پر کچھ عرض کروں..... یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے، بقول شخصے:

"اُردو کی پورے تاریخ میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے اتنی دشواریوں کے باوجود، اتنی، اتنی طویل مدت تک، ہر دوسرے تعلق سے منہ موڑ کر اس خلوص، قابلیت، اور پامردی سے اُردو کی اتنی گراں قدر اور مختلف النوع خدمات انجام دی ہوں جتنی کہ مولوی عبدالحق نے — ان خدمات کا گنا بھی آسان نہیں ہے۔۔۔۔"

کسی اور موقع پر میں لکھ چکا ہوں کہ مولوی عبدالحق نے اپنے تئیں طویل لیکن اپنے مداحوں مداحوں کی آواز سے کم تر عمر پائی۔ اُن کی "طویل" زندگی کا کوئی لمحہ بے مصرف نہیں گزرا۔ ان کی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع اور نتائج کے اعتبار سے بے حد وسیع ہے۔ انہوں نے اُردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قدر اور قامت، ہر اعتبار سے قابل ستائش اضافہ کیا۔

زندگی بھر وہ برابر زبان کی اشاعت و مدافعت کے لیے معرکہ آرا رہے اور جہاں کہیں اس پر آنچ آتی دیکھتی، وہ ایک ذمہ دار وکیل اور جان لیوا محافظ کی طرح، اُس محاذ پر سینہ سپر ہو گئے۔ ہر جگہ دلوں کو گرمایا، حوصلوں کو بڑھایا اور زبان کی موقر و کالت اور موثر حفاظت کی۔

عبدالحق، بلا مبالغہ کشمیر سے لے کر اس کٹاری تک اُردو کا مقدمہ لڑتے پھرے۔ اس کا سفیر بن کر دور دور اس کا پیغام پہنچایا، خطابت کے سہارے اسے دلوں میں اتارا اور انتشار و ازمی کے بل پر، اس پیغام کو ذہنوں میں جمایا۔ زبان کی بنیاد ہی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اصول و قواعد، صرف و نحو، کتب حوالہ اور لغات کی تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کی۔ قدیم ادبی تذکروں اور نادروں و معدوم مخطوطوں کو گم نامی سے نکال کر، اصحابِ علم کو ان سے روشناس کرایا، اپنے عہد کے جید ہم عصروں کے حالات لکھ کر، ان کی سیرتوں کو آنے والی نسلوں کے لیے زندہ و تابندہ کیا اور تحقیق و تنقید کی راہوں پر نیت نئے چراغ روشن کیے۔

مولانا غلام رسول مہرنے بڑھی سچی بات کہی ہے کہ :

بابائے اُردو کا اسم گرامی زبان پر آتے ہی ایک ایسی شخصیت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ زبان اور علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دیا اور اس سلسلے میں بھی وہ پہلو، بطور خاص پیش نظر رکھے جنہیں ملک و ملت کی تعمیر اور قومی ثقافت کی زینت و تحسین میں بڑھی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے دائرے میں، ان کی ہمسرا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

مولوی عبدالحق متفقہ طور پر عظیم شخصیت کے مالک تھے اور بڑھی شخصیت کی مشکل یہ ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جاسکتا، بابائے اُردو کے کارنامے بھی اتنے زیادہ اور متنوع ہیں کہ ایک مضمون یا ایک نشست میں بیان نہیں ہو سکتے۔

میں یہاں اختصار کے ساتھ مولوی عبدالحق کے مقصد حیات کے بارے میں، جو

اُن کی طویل زندگی کے ہر دور میں ایک ہی رہا۔ سلسلہ وار چند حقائق آپ کے سامنے رکھوں گا، اس مقصدِ حیات ہی کے حوالے سے اُن کی خدمات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے:



۸۹ - ۱۸۸۸ء

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”میں جب اول روز درستہ العلوم مسلمانان ایم۔ او۔ کالج، علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہوا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دنیا میں آگیا ہوں“، یہ ۸۹ - ۱۸۸۸ء کی بات ہے۔ لکھنے پڑھنے کی یہی نئی دنیا بعد میں مولوی صاحب کی اپنی دنیا ہو گئی۔ شیخ چاند مرحوم کی روایت کے مطابق ۱۸۹۰ء میں مولوی عبدالحق علی گڑھ سے طالب علمی کے زمانے میں اورنگ آباد، پین چکی کے کتب خانے کی تلاش میں گئے۔ اُس زمانے میں اورنگ آباد تک ریل جاری نہ ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں احمد نگر کے رستے سے اورنگ آباد پہنچنا پڑا۔ لیکن افسوس کہ اس سے قبل وہ مشہور کتب خانہ لٹ چکا تھا، کئی زبان کی چند کتابوں کے سوا، مولوی صاحب کو دیکھنے کے لیے کچھ نہ ملا۔ اس طویل مسافت کا انجام حوصلہ شکن نظر آتا ہے لیکن اس سے مولوی صاحب کو طلب اور لگن میں کمی نہ آئی بلکہ زبان کو ترقی دینے کی دہن ایسی لگی یا سوار ہوئی کہ سرسید کی بزم سے اٹھے تو گیسوئے اردو کے سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔



۱۸۹۲ء

اردو سے مولوی عبدالحق کی دل چسپی وقتی یا اتفاقی نہیں تھی۔ اس کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں ان کے خیالات، ”مدۃ العہر کے غور و فکر اور شغف کا نتیجہ تھے۔ اردو کو ترقی اور وسعت دینے اور زیادہ عام اور مقبول بنانے کے عزائم اور منصوبے طالب علمی ہی کے زمانے سے اُن کے پیش نظر تھے۔ یہ ۱۸۹۳ء کا واقعہ ہے، اس زمانے میں ابھی وہ بی۔ اے میں تھے کہ انہوں نے سرسید کے ”تہذیب الاخلاق“ کے لیے ایک مضمون لکھا جس میں ”ہندوستان کے اس مشہور انقلاب انگیز رسالے کو طبعی آزادی

سے یہ بتایا کہ اُس کے فرائض کیا ہیں، ان میں ایک ضروری اور ناگزیر فرض "اُردو زبان کو ترقی دینا" بھی تھا۔"



۱۹۰۱ء

مواقع، قسمت سے بہتوں کو ملتے ہیں لیکن بات دراصل اُن سے بروقت فائدہ اٹھانے کی ہوتی ہے۔ یہ بس ایک "لمحہ" ہوتا ہے جسے "شبہ گھڑی" کہہ لیجئے، جس نے اسے جان لیا، پہچان لیا اور جرات سے کام لے کر اس لمحے کو گرفت میں لے آیا اور اس سے فائدہ اٹھالیا، وہ بڑگیا، امر ہو گیا۔ مولوی عبدالحق کو حیدرآباد وکن میں اس طرح کا جو پہلا بہترین موقع میسر آیا، اور جس سے انہوں نے قرار واقعی فائدہ اٹھایا، اہل نظر اُس سے بالعموم بے خبر ہیں، چالیس پینتالیس سال ہوتے ہیں کہ شیخ چاند مرحوم نے اس کی نشاندہی کی تھی، اس نشاندہی پر بھی اب وقت کی دبیز تہہ پڑ چکی۔ یہ انیسویں صدی کے بالکل اخیر کی بات ہے نواب عماد الملک، اُس زمانے میں حیدرآباد وکن میں ناظم تعلیمات اور ولی عہد وقت نواب میر عثمان علی خاں کے اتالیق تھے۔ اُن کی تعلیم و تدریس کے لیے عماد الملک نے مولوی عبدالحق سے اُردو خطوط نویسی پر رسالے لکھنے کی فرمائش کی: یہی وہ لمحہ تھا جس سے مولوی عبدالحق نے ایسا فائدہ اٹھایا، جس کی وار دینے کے لیے الفاظ مساعت نہیں کرتے۔

۱۹۰۱ء میں مولوی عبدالحق، اُردو خطوط نویسی پر دو رسالے لکھتے ہیں۔ دوسرے رسالے میں ایک خط، باپ کی طرف سے بیٹے کے نام ہے۔ بیٹے کے نام باپ کا یہ خط، جس پیغام پر شتمل ہے وہ دور رس معنویت کا حامل ہے:

"جان پدر!۔ چونکہ اس خط میں تمہاری تعلیم کا تذکرہ آگیا ہے، میں اس موقع پر ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس میں شک نہیں، تم قریب قریب تمام مضامین میں اچھے ہو اور ان میں دلچسپی بھی ہے، لیکن میں ایک بڑی کمی دیکھتا ہوں جس کا ظاہر کر دینا میرا فرض ہے، وہ یہ ہے کہ تمام اُردو، یعنی اپنی ماوری زبان کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہو۔ اس سے زیادہ

افسوس کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ہم دوسری زبان کے حاصل کرنے میں تو ہمہ تن مصروف رہیں لیکن اپنی مادری زبان کی طرف بالکل توجہ نہ کریں۔ علاوہ مادری زبان کے ہمیں اب تک زیادہ تر کام اسی زبان سے پڑتا ہے۔ آپس میں خط و کتابت اور عدالت کی کارروائی اردو ہی میں ہوتی ہے۔ اس میں علمی ذخیرہ بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی طرف سے بے توجہی کرنا سراسر غلطی ہے اور اس میں نقص رہ جانے سے بعد میں بڑی بڑی وقتیں پیش آتی ہیں۔۔۔۔۔ ”باپ کے اس پیغام سے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے ایک نیا عالم کھل جاتا اور وہ نہایت جوش اور خلوص سے لبیک کہتا ہے:

”آداب! آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ نے جو تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل صحیح ہے حقیقت میں افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں ہمارے ایک استاد یہی کہا کرتے ہیں، مگر ہے یہ کہ متعدد مضامین تیار کرنے کی وجہ سے بہت کم فرصت ملتی ہے کہ ان چیزوں کی طرف بھی توجہ کی جائے، جو ہمارے امتحان میں نہیں ہیں لیکن آج سے میں نے ارادے کر لیا ہے کہ فرصت کا تمام وقت اردو کے سیکھنے میں صرف کروں۔“

ملاحظہ کیجئے: کس طرح مولوی عبدالحق نے نواب عماد الملک کی فرمائش سے فائدہ اٹھایا اور کس طرح ایک ادائے خاص سے ہونے والے بیدار مغز تاجدار کے دل میں ابتداء ہی سے اردو کی محبت کا بیج بونے کی کوشش کی جو آگے چل کر ایک تناور، عظیم الشان اور بار آور شجر کی شکل میں نمودار ہونے والا تھا۔ یہی وہ ہلکی سی جنبش تھی جس پر ایک مستحکم، ذمی وقعت اور بے عدیل تعمیر چینی جانے والی تھی۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ حیدرآباد دکن کے تعلیمی انقلاب میں مولانا عبدالحق کا کیا کردار رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ انقلاب، مولوی عبدالحق کی جانفشانیوں اور دُور اندیشیوں کا نتیجہ ہے، وہ عرصے تک اس کے اسباب پیدا کرتے رہے اور حیدرآباد دکن کا یہ تعلیمی انقلاب اپنے اثرات مابعد کے اعتبار سے ملک گیر اہمیت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔



۱۷ - ۱۹۰۷

جب تک ہر علم و فن کی ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیم اُردو زبان میں نہیں دی جائے گی، صحیح اور وسیع مفہوم میں قوم ترقی نہیں کر سکے گی۔“

مولوی عبدالحق کا یہ بیان ۱۹۰۷ء کا ہے، اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے، لیکن اُس وقت، اس خیال کے عمل میں لانے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن نیت بخیر اور صادق ہو تو ہر بھلے خیال کے رُو بہ عمل آنے کی کوئی نہ کوئی صورت کبھی نہ کبھی نکل ہی آتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ صورت از خود ہی نہیں نکل آتی۔ ضرورت، مُناسبت اور صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھانے اور صحیح خطوط پر آغازِ کار کی ہوتی ہے۔

دس برس بعد آخر اس کا بھی وقت آیا اور مولوی صاحب نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، (اسی میں اُن کی جیت ہے) : سر اکبر حیدر ہی نظام و کن سرکار میں ہوم سیکرٹری کے منصب پر فائز ہوئے، اب مولوی عبدالحق کو موقع ملا اور انہوں نے حیدرآباد میں اُردو ذریعہ تعلیم پر عامل ایک یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت اور ضرورت کے موضوع پر موثر کالت سے سر اکبر حیدر ہی کو اپنا ہم خیال بنایا۔ ابتدائی مراحل کے سرانجام میں کچھ وقت لگا، اس عرصے میں پُرس پر وہ مولوی عبدالحق نے ”اسپیشل ڈیوٹی“ کے طور پر نہایت حزم و احتیاط، خاموشی، دُور اندیشی اور قابلیت سے یونیورسٹی کی مکمل اسکیم مرتب کی۔ اربابِ اقدار نے اس کو بغور جانچا اور پسند کیا۔ بالآخر وہ اسکیم بارگاہِ نظام میں پیش کر دی گئی اور وہاں سے اُسے منظوری کا شرف بخشا گیا۔ اُردو، ذریعہ تعلیم قرار پائی اور حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم ہو گئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا خاکہ، منصوبہ اور کامل اسکیم مولوی عبدالحق کے ذہن رسا کا نتیجہ ہے۔ آج یہ بات سب کو معلوم ہے لیکن اس کی جانب اُول اُول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے خویش پروفیسر الیاس مجیبی نے اشارہ کیا۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں کہ: مولوی عبدالحق نے پُرس پر وہ وہ شاندار کامیابی کی عموماً لوگوں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہر راز کی ایک عمر

ہوتی ہے، اُس کے بعد راز کو راز رکھنا چند ان ضروری نہیں۔ کتنوں کو اس راز کی ہوا بھی لگی ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی اسکیم مولوی عبدالحق صاحب ہی کی بنائی ہوئی ہے اور انہیں کے ایمار سے ریاست حیدرآباد کی کونسل میں دادا حیدر می کی طرف سے پس ہو کر پاس ہوئی۔“

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ”یادوں کی دُنیا“ میں لکھتے ہیں کہ: ”میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اصلی بانی مولوی عبدالحق کو سمجھتا ہوں۔ مولوی عبدالحق نے جو سرائیکبر حیدر می کے مزاج میں ذخیل تھے، اُردو زبان کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز ان کے روبرو پیش کی حیدر نواز جنگ کی تحریک پر میر عثمان علی خاں نظام ریاست حیدرآباد نے اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا، یونیورسٹی کے قیام سے پہلے اُردو میں اعلیٰ معیار کی علمی کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی غرض سے ۱۲ اگست ۱۹۱۷ء کو ایک ”سررشتہ تعلیم و ترجمہ“ کا قیام عمل میں آیا جو عام طور پر دارالتوجہ کے نام سے مشہور ہے۔ مولوی عبدالحق اس بُھماتی کام کے سربراہ بنائے گئے۔ اور مشرعی انداز میں وضع اصطلاحات اور ترجموں کے کام کا آغاز ہوا۔ یہاں تک کہ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو اُس عمارت میں عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا جہاں آج کل اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک خط میں جس کا حوالہ حال ہی میں سامنے آیا ہے، خود بتایا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ابتدا کیسے ہوئی۔

”ہوا یہ کہ ایک بار سرائیکبر اورنگ آباد آئے اور میں نے اُن کی صدارت میں ایک تقریر مروجہ تعلیم اور طریق تعلیم پر کی اور اُس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس کا اعتراف خود انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا جو انہوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسے میں کی تھی۔ وہ (کالج کے رسالے) ”نورس“ میں چھپی تھی۔ خیر، حیدر می صاحب تو آمادہ ہو گئے، وہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے، البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آئے تو وہ کارروائی کرنے کو تیار تھے۔ الما لطفی (ڈاکٹر تعلیمات) کے ذریعے اس تحریک کو پیش کرنا خلاف مصلحت تھا، وہ اس کے مخالف تھے۔ اس

زمانے میں درالعلوم کے پرنسپل مولوی حمید الدین مرحوم تھے۔ انہوں نے میرے متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ میں نے انہیں ہم خیال بنا لیا اور ان سے کہا کہ آپ بحیثیت پرنسپل درالعلوم یہ تحریک کیجئے۔ انہوں نے کہا ”میں دستخط کروں گا“ میں نے ہوم سیکرٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست پیش کر دی۔ ہوم سیکرٹری اُس وقت سر اکبر حیدر می تھے۔ اب بوجوب انگریزی محاورے کے گینڈ لٹکھنا شروع ہوئی۔ مجھے اوزنگ آباد سے اپسٹل ڈیوٹی پر بلایا گیا۔ کام دہیرے دھیرے شروع ہوا۔ عرضداشت جو اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں منظور ہی کے لیے پیش کی گئی تھی، وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی۔“

پروفیسر مجیبی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ: ”مولوی صاحب کچھ نہ کرتے، انہیں ایک حرف لکھتے، بس یہی ایک کام ایسا تھا ان کا، جو بڑے بڑوں کے بڑے بڑے تصنیفی کاموں پر بھاری ہے۔“



۱۹۲۰ء

ہندوستان میں پہلی جنگ کے دوران میں ہوم رول کی تحریک پڑھے لکھے طبقے میں پھیل اور توجہ کا باعث ہو چکی تھی اور غور و فکر کی بہت سی راہیں ان کے سامنے عقدہ کشا ہونے لگی تھیں، جلیاں والا باغ کے قتل عام نے کیا خواص اور کیا عوام، ملک بھر میں ایک سر سے لے کر دوسرے سر تک آزادی کا نغمہ بلند کر دیا۔ جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک روارکھا، اُس نے جلتی پرتیل کا کام کیا اور ہندوستان کے درو مند مسلم زعماء اور عوام سب میں انگریزی سامراج کے خلاف یکساں نفرت کا شدید جذبہ ابھر آیا، خلاف کی تحریک لے ملک گیر قبولیت حاصل کی۔ اس تحریک کے سرکردہ اور سرگرم زعماء میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اسی زمانے میں ترک موالات کی آواز اٹھی جسے خلافت تحریک کی پُر زور تائید حاصل ہوئی اور ملک کی آزادی کا چرچا بہت زور

پکڑ کیا۔ اس تحریک کا ایک جُز، بقول شخصے یہ بھی تھا کہ طلباء اسکول اور کالج چھوڑ کر آزادی حاصل کرنے کے لیے قومی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیں۔ مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈروں نے علی گڑھ کے طلباء کو اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کا پیغام پہنچایا، جس پر طلباء نے

اصحاب نے فیصلہ کیا کہ ایک قومی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) ہوگا۔ ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم۔ اے۔ او کالج کی جامعہ مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا اور مولانا محمود الحسن کے متبرک ہاتھوں سے اس کی تاسیس کی رسم ادا ہوئی اور چونکہ علالت کی وجہ سے بہت کمزور اور ناتوان تھے، ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کا خطبہ پڑھا، (یادوں کی دُنیا، ص ۸۵)

مولوی عبدالحق اس یادگار موقع پر بنیاد جامعہ کی جانب سے بطور خاص اورنگ آباد سے، علی گڑھ بلائے گئے۔ اورنگ آباد واپس پہنچ کر ۸۔ نومبر ۱۹۲۰ء کے اپنے خط موسومہ ڈاکٹر انصاری میں وہ لکھتے ہیں کہ:

”میں، علی گڑھ بہت جوش اور شوق سے گیا تھا۔ مجھے نیشنل یونیورسٹی کا بڑا اشتیاق تھا اور دہلی پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے آپ سے اسی کے متعلق گفتگو کی۔ میری دلی تمنا یہ تھی کہ میں اس یونیورسٹی کو آغاز ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ لوں۔ شکر ہے کہ میری مُراد برآئی اور سب سے بڑی مسرت اس کی ہوئی کہ آپ صاحبان اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے اور مولانا حالی کے نام سے اُردو پروفیسری قائم کرنے پر رضامند اور آمادہ ہیں۔ میں علی گڑھ اسی خیال اور نیت سے گیا تھا، ورنہ مجھے دوسرے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میری زندگی کا مقصد، صرف دُنیا میں ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ اُردو کو ترقی ہو اور وہ علمی زبان بن جائے۔ ہندو، مسلمان کا اتحاد ملک کے لیے ایک مُبارک فال ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ آئندہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ اہل ملک کو ”سولج“

ملے گا (خدا کرے وہ زمانہ جلد آئے)۔ اُس وقت زبان کا سوال، جو اُس وقت دب گیا ہے، پھر پیدا ہوگا۔ حکومت کی کوئی صورت بھی ہوئی، خواہ ملک امریکہ کی طرح مختلف ریاستوں میں تقسیم ہوا، یا ایک انتظام کے تحت میں رہا، زبان کا سوال ناگزیر ہے۔ سیاسی اعراض سے اگر ملک کی تقسیم کی گئی تو اس تقسیم کی بنیاد بھی زبان ہی ہوگئی۔ اس لیے ہمیں ابھی سے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اس کے لیے اس سے بہتر موقع کبھی نہیں مل سکتا۔ مجھے اس کی بڑی مسرت ہے اور اس کی وجہ سے بڑا اطمینان ہے کہ آپ اور جناب حکیم اجمل خاں صاحب میرے ہم رائے ہیں کہ نیشنل یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اُروو ہو۔ آپ اس پر قائم رہیں اور ہزار مخالفت ہو کبھی اس اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، ورنہ ابتداء میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو پھر موقع ملنا محال ہو جائے گا۔“

مولوی عبدالحق کے یہ کلمات قیام پاکستان سے ۲۷ برس پہلے کے ہیں لیکن یہ اُن کی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، دیدہ وری اور پیش قیاسی کے امین اور ان کے واحد مقصد حیات کے منہ بولتے منظر ہیں۔



۱۹۶۰ء

اہل ملک کو آزادی مل گئی، ملک تقسیم ہو گیا، زمانہ کا سوال پیدا ہوا، اور وہ اصول ہاتھ سے جاتا رہا، جس پر قائم رہنے اور ہزار مخالفت کے باوجود جسے ہاتھ سے نہ جانے دینے کے لیے مولوی عبدالحق نے آزادی ملک سے ۲۷ برس پہلے بڑے شد و مد سے زور دیا تھا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے کامل تیرہ سال بعد، انتقال سے ایک برس پہلے، وطن عزیز کے شہریوں کے سامنے مولوی صاحب کو بہ جزن و رقت یہ کہنا پڑا کہ: میں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری دستگیری کریں، مجھے سہارا دیں اور اُروو یونیورسٹی کے قیام میں میری مدد کر کے مجھے ایک نئی

زندگی عطا کریں۔ میں اب زندگی کی اُس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام، اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔ (دراچی پاکستان میں اُردو یونیورسٹی بن کر رہے گی یہ خود قضا و قدر کا منشا ہے۔ سوال صرف دیر اور سویر کا ہے۔ اگر آپ نے میری مدد کی اور یونیورسٹی کے قیام کے وسائل و اسباب مہیا کر دیے تو یہ جلد بن جائے گی اور میری زندگی میں بن جائے گی۔ یہ میرا عہد ہے کہ جب تک قلم میں طاقت اور زبان میں سکنت ہے اُردو یونیورسٹی کی پاک مہم کو جاری رکھوں گا:

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید

یا حبان رسد بجاناں یا جان رتن بر آید

اور بالآخر اگست ۱۹۶۱ء میں انہوں نے جاہی بار دی۔ آج مولوی عبدالحق کو گزرنے دس برس ہو گئے۔ لیکن اُردو یونیورسٹی کا قرض ہم پر باقی ہے۔

زبان کا اُن جیسا عاشق اور نڈر خیر خواہ اب کوئی نہیں، نہ کسی میں اُن کا سا جوشِ عمل نظر آتا ہے اور نہ ویسی شانِ استقامت۔ یہ نہیں کہ خدا نخواستہ زبان کے خیر ایدیشوں کی کمی ہو، یہ بہت میں اور مخلص بھی ہیں۔ زبان کے غم میں گھٹنے والے بھی ہیں، حالات سے مغلوب ہو کر کچھ نہ کر گزرنے والے بھی ہیں۔ نادان دوست بھی ہیں اور دانا دشمن بھی۔

زبان کی بے لوث خدمت میں لگے ہوئے خاموش کارکن بھی بہت ہیں۔ اور اُردو کا جلوس نکالنے والے بھی۔ لیکن مولوی صاحب کا سچا جانشین کوئی نہیں، گدھی نشینی کے کے مدعی اور مجاور بہت! ایک مولانا صلاح الدین احمد کی ذاتِ گرامی وجہِ اطمینان تھی لیکن وہ بھی، اُردو کی بد قسمتی کہ مولوی عبدالحق کے بعد زیادہ دن نہ چیسے اور فرودس نشین ہوئے۔ مولانا غلام رسول مہرنے ٹھیک کہا ہے کہ خیرہ ذوقی اور اغراض جوشی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اُس میں مولانا جیسے کسی فرد کا پیدا ہونا بظاہر مشکل ہی نظر

آتا ہے۔ ، لیکن مایوس اور افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خود مولوی عبدالحق کے بقول تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب دل بچھ گئے ہوں، شکوت اور سناٹے کا عالم ہو اور ہر چہار طرف افسردگی اور مردنی چھائی ہوئی ہو:

”ایسے باہمت جوان مرد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کر جاتے ہیں۔“

...

تجربہ ۲۸- اگست ۱۹۷۱ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق:

بحیثیت شاعر

”شاعری کیا ہے، اساتذہ کے دو تین دیوان، لکھ کر ایک ”نیا“ دیوان تیار کیا جاسکتا ہے۔ (بابائے اردو مولوی عبدالحق) ۱۔

مولوی عبدالحق کا یہ قول شعراء سے ان کی بے اطمینانی کا مظہر ہے۔ ایک موقع پر گرامی کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

”گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو لوازم سمجھے جاتے ہیں، وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے: بے نیاز، بے پروا، دنیا کے معاملات سے بے خبر، لا ابالی.....“ (چند ہم عصر، ص ۱۵۷)

۱۔ مجلس یادگار حمید احمد خاں کے تالیسی اجلاس میں، جو ۱۸ مئی ۱۹۷۳ء کو لاہور میں منعقد ہوا، بابائے اردو کے رفیق دیرینہ پروفیسر محمود احمد خاں نے میرے استفسار پر یہ روایت بیان فرمائی، خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات مولوی صاحب نے ایک روز مجھ سے باتوں باتوں میں کہی اور خوب یاد ہے کہ ”نیا“ کا لفظ مولوی صاحب نے زور دے کر ادا کیا.....“ (ڈاکٹر سید معین الرحمن)

مولوی عبدالحق، اس کے برعکس قطعاً عملی آدمی تھے اور بے عملی کے دشمن....
 اس لیے شاعروں اور شاعروں کے دلوں سے وہ کبھی زیادہ خوش اور مطمئن نہیں رہے، اس
 کا اظہار اُن کی تحریروں میں طرح طرح سے ہوا ہے:
 ”شاعر پر کسی کا بس نہیں چلتا اور کسی کا کیا، وہ خود اپنے بس میں
 نہیں ہوتا“ (خطبات عبدالحق، ص ۱۲)



”ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بنے فلکا تھا اور دنیا و مافیہا کی
 انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ آخر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور
 اُمراء اس طرن جھکے تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں
 نے رہا سہا، انہیں اور کھو دیا۔“ (مقدمات عبدالحق، ص ۸)
 ”رمضان لاہور میں گزارا گیا اور وہاں کی خوش آب و ہوا اور
 مناظر سے لطف اٹھایا اور دیوان کے پروف دیکھے اور پڑھ
 پڑھ کے جھومے، ہم خرما و ہم ثواب“
 (مکتوبات عبدالحق، بنام امامی، ص ۱۶۷)



”مبارک ہو آپ کے دو دیوان چھپ گئے، جس کے پیچھے آپ
 دیوانے ہو رہے تھے۔“

○ (مکتوبات عبدالحق بنام امامی، ص ۱۶۹)

”آج کل تو ہمارے اکثر شاعر نے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں
 اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں اُن میں بعض طرح
 طرح سے چشم دابرو، ہاتھ گردن اور دوسرے اعضاء کے کام لیتے

اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی
آجاتی ہے۔“ (چند ہم عصر، ص ۱۷۱)

”ہمارے شاعروں میں تو تعلقِ عریب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ
ہو گئی ہے۔“ (چند ہم عصر، ص ۱۶۸)

”ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی شاعر سے
مٹتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر
تو شاعر سے اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اُسے بھی اپنا کلام سنانے
کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مخاطب بھی اس سے
یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت
نہیں پڑتی، بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔
دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاعر
ان سے اس کی توقع رکھتا ہے۔ بعض شاعر تو اس کے لیے
بے چین رہتے ہیں۔“ (چند ہم عصر، ص ۱۶۹)

” (بیسویں صدی کے ربع اول میں) ہماری زندگی میں بہت کچھ
تغیر واقع ہوا ہے۔ اگر دو ایک شاعروں سے قطع نظر کیا جائے تو
کیا ہمارے شعراء کے کلام میں کہیں بھی اس انقلاب کا پتا ہے؟“
خطباتِ عبدالحق، ص ۱۳۹، ۱۴۰

”ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذ الرحمن ہیں۔ مشاہدے
مطلوع اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، ان کے دلوں پر
آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے لیکن اگر
انہیں اپنا اور دوسروں کا وقت صنائع کرنا منظور نہیں تو
انہیں اپنی ہوائی پرواز سے، اس ناپاک زمین پر اترنا پڑے گا“
○ (خطبات عبدالحق، ص ۳۴)

مشاعروں سے بھی مولوی عبدالحق کو بوجہ کچھ دلچسپی نہیں تھی۔
”کانفرنس اور مشاعرہ محض تفریحی نہیں ہونے چاہئیں، کچھ کام
بھی ہونا چاہیے، ورنہ... (کانفرنس) بھی مشاعرہ ہو کر رہ جائیگی۔“
(مکتوبات عبدالحق بنام امامی، ص ۳۶)

○
”کانفرنس کرنا آجکل کا فیشن ہو گیا ہے۔ ہنگامہ پسندی اور تفریح
کے لیے لوگوں کو اچھا نسخہ ہاتھ آ گیا ہے۔ اس قسم کی اردو کانفرنس
میں مشاعرہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ
مشاعرہ کے جواز کے لیے کانفرنس بھی کر لی جاتی ہے۔ مجھے
بعض ایسی کانفرنسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے اور
ہمیشہ کھپتانا پڑا ہے۔ بے عملی کا یہ رنگ دیکھ کر میں کانفرنسوں
سے بیزار ہو گیا ہوں۔“
(خطبات عبدالحق، ص ۲۲۹)

○
”مشاعروں کو برا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب بڑی علمی اور ادبی
مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی کیا حالت ہوگی۔“ (مکتوبات عبدالحق، ص ۸۱)

”میں مشاعروں میں شرکت نہیں کیا کرتا....“

(بابائے اردو، دادی مہران میں، آفاق صدیقی، ص ۶۱)



”میں مشاعروں میں بالعموم شریک نہیں ہوتا، حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو کی تقریب میں جو مشاعرہ ہوا، میں نے اس میں شرکت نہیں کی، صرف چند منٹ بیٹھ کر چلا آیا۔ میں صرف مشاعرے کی خاطر راولپنڈی جاؤں اور دو روز کے بعد واپس آ جاؤں، یہ سب کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔“ (مکتوبات عبدالحق، ص ۶۳)



”آپ مشاعرے کو اردو کی خدمت خیال فرماتی ہیں، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ البتہ ان مقامات میں جہاں اردو کا رواج نہیں یا کم ہے، اردو مشاعرے، اردو کی اشاعت و ترویج میں مدد دے سکتے ہیں لیکن پنجاب اور یوپی کے شہروں میں مشاعرے، محض ادبی تفریح ہیں۔ کسی فلم میں نہ گئے مشاعرے میں چلے گئے۔ اسی لیے میں مشاعروں میں شرکت سے احتراز کرتا رہا ہوں، جب تک کہ ان کے ساتھ کوئی ایسی تحریک نہ ہو جو حقیقی طور پر اردو کی خدمت ہو۔“

(مکتوبات عبدالحق، ص ۶۵)



شاعروں اور مشاعروں سے مولوی عبدالحق کی مزاجی نامناسبت اپنی جگہ، لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ شعر یا شاعری کی طاقت اور عظمت کے منکر ہوں، ان کے نزدیک: ”شاعری خود ایک بڑا کمال ہے اور ایسا بڑا کمال ہے کہ اگر

کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اس کے سامنے دوسرے
کسب و کمال ہیچ ہیں۔ (مقدمات عبدالحق، ص ۱۷۷)



بلکہ شاعری کا، صحیح طور سے موجود ہونا "اصل بات ہے اور یہ چیز مولوی عبدالحق
کو کم شاعروں میں نظر آتی تھی۔ بے نیازی بے پروائی، دنیا کے معاملات سے بے خبری
لا ابالی پن، بے عملی اور کاہلی سے شعراء کا متصف ہونا مولوی عبدالحق کو کبھی نہ
بھایا اور اسی لیے وہ اس "مخلوق" سے ہمیشہ کسی قدر گریزاں رہے۔ مولوی عبدالحق
کے نزدیک ضبط اور اعتدال کے اوصاف سے مزین ہونا شاعر کا بڑا کمال ہے:

"یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، ورنہ جوش
میں آکر آدمی سررشتہ اعتدال کو مودیتا ہے اور بہک کر کہیں
کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخے چلانے لگتا
ہے۔" (چند ہم عصر، ص ۱۷۲)

مولوی عبدالحق کا عقیدہ یہ ہے کہ شعر میں اعتدال اور حسن ذوق کو قائم رکھنا
شاعری پر بڑا احسان ہے اور خود شاعر کا بڑا کمال ہے۔ شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار
اس کے کلام کی تاثیر ہے۔۔۔۔۔ زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ (جائے) شاعری
میں خیال آرائی نہ ہو: دل میں درد اور صداقت بھی ہو، جہاں یہ نہیں وہاں آواز
میں بھی درد اور صداقت نہیں ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ
سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں گے۔ اچھے شعر سے مولوی عبدالحق کا ایک تقاضا یہ بھی
ہے کہ: "وہ ہمیشہ دلوں کا گرمائے، دماغوں میں جولانی پیدا کرے اور لطف درد سے

۱۷ چند ہم عصر، ص ۳۶۳
۱۸ مقدمات عبدالحق ص ۱۸۵
۱۹ مقدمات عبدالحق، ص ۲۶۷
۲۰ خطبات عبدالحق ص ۸۷

شعر و شاعری کے اس اونچے آدرش پر مولوی عبدالحق کے نزدیک مسالی کے بعد اقبال کے علاوہ بالعموم کوئی پورا نہیں اترتا اور اسی لیے اکثر شاعر مولوی عبدالحق کی نظر میں نہیں جتتے۔ مولوی عبدالحق کا قطعی اور حتمی خیال یہ ہے کہ:

”ایک پھسپھسی بے جان اور بے اثر تحریر کا لکھنا، نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ جب تک کلام میں لکھنے والے کی روح شریک نہ ہو، کلام مردہ ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کر سکتا۔ اگر کلام میں سادگی کے ساتھ صداقت، جدت، تازگی اور جوش ہے تو وہ آبِ رواں کی طرح موجیں مارتا ہوا بڑھتا چلا جائے گا اور اگر وہ دقیق الفاظ پیچیدہ استعارات و تشبیہات اور تکلف و تصنع کے بوجھ سے دبا ہوا ہے تو بجز مردار کے پانی کی طرح ساکن، مردہ اور بے حس ہوگا۔“
(خطبات عبدالحق، ص ۸۷)

مولوی عبدالحق کے نزدیک :

”شاعری طبعاً انسان کو مرغوب ہے اور اس نے قوموں پر بڑا اثر ڈالا ہے اور بعض اوقات بڑے بڑے انقلاب پیدا کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے عام ادب میں اول درجہ شاعری کا ہے“
(مہرٹی زبان پر فارسی کا اثر، ص ۱۰۳)

لیکن ہمارے ہاں ازد و شاعری نے کیا انقلاب پیدا کیے؟ کتنے شاعر ہیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں حب وطن اور حب قوم کا جذبہ پیدا کیا؟ انہیں قومیت کا خیال کھجایا، ان کے دلوں کو اپنے پرتاثر کلام اور انقلاب انگیز خیالات سے گرمایا اور کسی سیاسی انقلاب کا باعث ہوئے یا کسی سیاسی انقلاب کی داغ بیل

۱۔ مقدمات عبدالحق، ص ۲۵۷ ۲۔ خطبات عبدالحق، ص ۱۵۱

ڈالی یا لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا؟

”ہندوستان میں شاعروں کو ایسی باتوں سے کچھ واسطہ ہی

سہلیں..... ان کی جولانیوں کے میدان ہی دوسرے ہیں“

(مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، ص ۱۱۲)

یہی اختلاف اور اسباب ہیں کہ مولوی عبدالحق، شاعروں سے زیادہ خوش اور مطمئن نظر نہیں آتے اور خود انہوں نے قریب ستر برس تک میدانِ ادب میں رہنے کے باوجود شاعری کا کوئی طوطا نہیں پالا! بایں ہمہ یہ امر دلچسپی سے حالی نہیں ہوگا کہ مولوی عبدالحق نے بھی، تفریح اور تفتن کے طور پر ہی سہی شعر گوئی کا ”گناہ“ کیا ضرور ہے!

”اس حقیقت سے غالباً کم لوگ واقف ہوں گے کہ وہ (مولوی

عبدالحق) محقق کے خشک میدانوں سے نکل کر شعر و سخن کے

سبزہ زاروں میں مجرگل گشت نظر آتے ہیں“

— ایم۔ ایم۔ فرشتوری بدایونی

(بابائے اردو، وادیٰ مہران میں، ۱۹۶۲ء، ص ۸۴-۸۵)

بابائے اردو کے ایک قدیم رفیق پنڈت ونشی دھرجی ودیا لنگار لکھتے ہیں کہ:

”یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ موج میں آنے پر وہ (مولوی عبدالحق)

کبھی کبھی شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنے ہی ڈھنگ

کی ہے۔ وہ اوزان اور بحرؤں سے بے نیاز ہوتی ہے اور جدید طرز

کی ہے۔ مولوی صاحب کے پڑھنے کا انداز، ان کی خصوصیت کو

محسوس کرادیتا ہے۔ انہوں نے چکرا تاد مسیری سے چار میل

شمال میں) کے پیاروں میں شام کے وقت ٹہلتے ہوئے مجھے اپنی ایک

نظم سنانی تھی جو مجھے اب بھی یاد ہے..... اس کے علاوہ مولوی صاحب کے دو ایک مصرعے یا شعر بعض اور حضرات کے معنائیں میں نظر سے گزرے ہیں، لیکن اب انہیں پیش کرنا مشکل ہے۔“
(مجلس حیدرآباد دکن، عبدالحق نمبر ۶۱-۶۰، ۱۹۶۰ء، ص ۶۹-۶۸)

صیاء الدین برنی مرحوم کا بیان ہے کہ:

”مولوی عبدالحق صاحب، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے، جتنے شعر میں نے اب تک سنے ہیں وہ زیادہ تر مزاح کا رنگ لیے ہوئے ہیں..... مولوی صاحب کبھی کبھی ایک مصرع پر دوسرا مصرع بھی لگا دیتے تھے..... انہوں نے اختر انصاری اکبر آبادی کے لیے ایک ”مزاحیہ“ شعر بھی لکھا تھا مگر افسوس اب وہ میرے حافظے میں نہیں ہے، بہر حال مولوی صاحب شعر کہتے تھے جو زیادہ تر وقتی ہوتے تھے اور بعض میں چوٹیں بھی ہوتی تھیں.....“

(عظمت رفتہ، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۸-۵۰۹)

محمد اکبر الدین صدیقی نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

”بابائے اردو نے بحیثیت شاعر کبھی شہرت نہیں پائی۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ سننے میں آئی کہ جب شعراء مولوی صاحب کے سامنے اپنا کلام سناتے تو وہ کبھی کبھی فی البدیہہ مصرعے کہہ دیا کرتے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوا کہ شعر میں مولوی صاحب نے تھوڑا سا الٹ پھیر یا خفی سی تبدیلی کر دی جس سے شعر کا حسن دو بالا ہو گیا۔ زبان ہی کی اصلاح نہ کرتے بلکہ طرز ادا کا بھی خیال پیش نظر رہتا....“

(قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، ص ۷)

انگلے صفحات میں بلا تبصرہ مولوی عبدالحق کے پچاس کے قریب متفرق اشعار جو مختلف ذرائع سے میسر آئے پیش کیے جاتے ہیں۔ ماخذ کا جوالہ ذیلی حواشی میں آگیا ہے۔ اُمید ہے ان کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں ہوگا :

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے،
مگر جاگتے رات کشتی ہے ساری



تو نے حقی کو خوب کاٹھا ہے
اپنے مطلب کو خوب چھانڈا ہے
دیکھنے میں دوپھول ہے، لیکن
درحقیقت وہ سیہہ کا کاٹھا ہے

۱۔ ”یہ مولوی عبدالحق کا مشہور شعر ہے۔ یہ شعر مشہور اس معنی میں ہے کہ یہ ان کے بہت سے طے واؤں کو یاد ہے۔“ (صیاء الدین برنی، عظمتِ فتنہ، طبع اول، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۸)

۲۔ مولوی عبدالحق نے، ایک ان بیٹھے بیٹھے شانِ اخترِ حقی کی تعریف میں، یہ دو شعر ایک کاغذ پر لکھ کر مشفق خواجہ کو بھیج دیے۔ یہ محض نایاقاً لکھا گیا ہے، اس سے کسی کی تعقیق مراد نہ تھی۔ مولوی صاحب، حقی کو بہت چاہتے تھے اور ان سے مذاق بھی کیا کرتے تھے۔

(صیاء الدین برنی، عظمتِ فتنہ، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۸)

”حقی صاحب۔۔۔ والا قطعہ۔۔۔ ان کے نام کے ساتھ کبھی نہ چھپتا (اس میں ان کی بسکی کا پڑھ لکھا ہے)۔ لیکن ہوا یہ کہ جس وقت مولوی صاحب نے یہ قطعہ بھجوا تھا، اس وقت برنی صاحب، روم میرے پاس بیٹھے تھے، انہوں نے اسی وقت اُسے نقل کر لیا تھا۔ اب تو خیر حقی صاحب نے بڑے فن کے ساتھ اس قطعے کو ”گلدستہ نگارش“ میں شامل کیا ہے۔“

(مشفق خواجہ، بنام ڈاکٹر سید معین الرحمن، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۰ء) (باقی اگلے صفحے پر)

اختر انصاری اکبر آبادی
 دین و دنیا کی تجھ سے آبادی
 حیدر آباد میں تیرے دم سے
 گو بجتی ہے صدائے آزادی
 تو نے وہ وہ اصول لکھے ہیں
 پڑھ کے حیراں ہیں حیدر آبادی
 نئی قدروں میں لکھ کے شعر اپنے
 غزل اپنی، اثر سے شکر آبادی
 منظور خواجہ و حکیم اسرار
 مانتے سب ہیں تیری استادی



(گذشتہ سے پیوستہ)۔ ان اشعار کو محض چھپڑ خوباں یا زیادہ سے زیادہ ایک وقت یا لمبی آتی ترنگ
 خیال کرنا چاہئے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق، حقی صاحب کے بڑے قدر دان تھے۔
 خود میں نے ایک سے زیادہ بار بابائے اردو مولوی عبدالحق کو، حکیم اسرار احمد کروی سے بڑی
 اور شفقت کے ساتھ حقی صاحب کا ذکر کرتے سنا ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ سعید الرحمن)

۱۔ منظور ایوبی ۲۔ مشتق خواجہ ۳۔ حکیم اسرار احمد کروی

۴۔ مولوی عبدالحق نے یہ اشعار نواب شاہ کے دوران قیام اختر انصاری اکبر آبادی، ایڈیٹر 'نئی قدیں'
 (حیدر آباد) کی شان میں لکھے تھے۔ (صبا، الدین برنی، عظمت رفتہ، ۱۹۹۱ء، ص ۵۰۸-۵۰۹)
 میر پور خاص حیدر آباد، نواب شاہ اور سکھر کے ادبی اجتماعات سے فالغ ہو کر۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۰ء کو
 بابائے اردو کی واپسی کا پروگرام تھا، ہم (انہیں) نے کریم نوبیجے روہڑی جنکشن پہنچے۔ بابائے اردو
 بڑی موج میں تھے، پہلے تو بڑے مزے مزے کے لطیفے سنائے پھر وہ اشعار سنائے جو استاد اختر انصاری
 کے لئے لکھے تھے۔ (آفاق صدیقی، بابائے اردو وادی مہراں میں، ۱۹۶۲ء، ص ۱۱)

نہ من مقلدِ باطل نہ قایلِ تقلید محققانہ نظر داشتہ کہ عبدِ حقِ امؑ
دلوں پر قبضہ، خیالات پر حکومت ہے اب اس سے بڑھ کے تمہیں اختیار کیا ہوگا

بعضور لیڈر اعظمؑ

ہمارے اکِ محبِ رسیا برج کے دو آنے ہیں شبِ دروز اس کے پیچھے
نہ گھر کی کچھ خبر ہے اور نہ در کی برج سے دل لگی آکھوں سپر کی
اگر آنے کبھی گھر میں تو ایسے مسافر آ، سر میں اُترا جیسے!
ترسے رہتے ہیں صورت کو بچے نہیں یہ پھوٹے منہ سے بات کرتے
رہی بوی، سو ہے وہ کون کتیا لگائے منہ اُسے کوئی بھلا کیا
بہت دن تک وہ دیکھا کی تاشا کیا صبر، اور کبھی اُن کو نہ ٹوکا
چھٹک ہی تو پڑا پیمانہ صبر! کہاں تک کر کے دل پر کوئی جبر
لگی کہنے کہ اے حضرت! سلامت ذرا آئیے میں دیکھو تو صورت
رُخِ زیبا پر زردی چھا رہی ہے جوانی کی کلی مڑھ جا رہی ہے
تمہارے آج کل اچھے نہیں طرز کبھی اس پر کیا بھی آپ نے غور
نہیں بنتی ہماری اور برج کی تو کیا سمجھا ہے بوندی مجھ کو بچ کی!

۱۔ بزواہت: مولوی محمد علی جنینوں نے مولوی عبدالحق کے ساتھ تقریباً نصف صدی گزاری۔

(قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۱۷)

۲۔ ماہنامہ ہم قلم، کراچی، جلد ۲، نمبر ۱۲، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۷
۳۔ مولوی عبدالحق کے ایک ساتھی، انسٹریٹ کالج اورنگ آباد کے محمد ابراہیم صاحب لیکچرار
معاہدات جنینوں برج کھیلنے کا چرکا یا لت تھی۔ انہوں نے ایک ٹیم کی ٹیم تیار کر رکھی تھی جس کے کپتان
وہ خود تھے اس لیے وہ لیڈر اعظم کہلاتے تھے۔ (محمد اکبر الدین صدیقی، قومی زبان، کراچی
اگست ۱۹۶۲ء، ص ۱۷)

نہ مانو گر بُرا تم، تو کموں نہیں!
 نہیں منظور اس کے ساتھ رہنا
 کما شوہر نے، سُن اُلو کی بیٹی!
 برج کو چھوڑ دوں، ممکن نہیں یہ
 برج ہے جان میری، آن میری
 برج کاراج ہے سارے جان کا
 برج سے منزل فرحت چراغاں
 برج ایمان: دین ابنِ آذر!
 برج پر میں فدا ہوں جانِ دل سے
 تمہیں جانا ہو، بسم اللہ جاؤ!
 وہ یوں روتی ہوئی جب گھر سے نکلی
 اب اس گھر میں رہے وہ یار ہوں میں
 جلی جاؤں گی، گر مانا نہ کہنا!
 پڑھائی ہے یہ کس نے تجھ کو چٹی
 یہ رشتہ توڑ دوں، ممکن نہیں یہ
 برج سے ہے یہ ساری شان میری
 برج کا غلغلہ ہے لامکان میں
 برج ہے زندگی کا ساز و سامان
 برج سرمایہ عقیقی سراسر
 بتا ہوں میں اسی کے آبِ گل سے
 نہ یہ مسخو کس چہرہ پھر دکھاؤ
 کہ جیسے خانماں برباد ہو گئی

خدا کی مار ایسے کھیل پر ہو
 زن و فرزند سے جس نے چھڑایا
 نہ کھانا ہے، نہ پینا ہے، نہ سونا
 نہ یاروں سے رہی افسوس یاری
 برج میں بتلا ساری خدائی
 کہ جس سے یوں تہ برباد گھر ہو
 کیا دم بھر میں گھر بھر کا صفایا
 برج ہے اور فرح منزل کا کونا
 اگر کچھ ہے تو بس اک چار یاری
 دہائی دوستو، یارود ہائی لے



لے بابائے اردو کی یہ نظم، خود ان کے اپنے قلم سے لکھی ہے ایوانِ اردو حیدرآباد
 دکن کے میوزیم میں محفوظ ہے۔

(محمد اکبر الدین صدیقی، قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، ص ۷۵)

نظم

سب سے پتا

سب سے پتا

دوست کتاب!

سب سے بڑا

سب سے کڑا

معلم، زمانہ



بخدمت امام الشعراء حکیم امامی صاحب سلمہ :

قائدِ بنگلور امامی ہو تم

شاعرِ میسور امامی ہو تم

خدمتِ اردو سے منہ نہ موڑو

دامنِ اردو، نہ کبھی چھوڑو

طعن و بلامت سے نہ گھبرائو

خدمتِ اردو سے نہ شرمائو

ہمت مردان کے خدا ساتھ ہے

حق یہ ہے تو حق کا تر ساتھ ہے

۱۔ اس نظم کے راوی نانک رام بھنگوان داس سائنس کالج کے پرنسپل پنڈت ونشی دھرجی
 ودیا لنگار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اپنی یہ نظم انہیں مسوری سے پالیس
 میل شمال میں چکراتا کے پیاروں میں شام کے وقت ٹہلتے ہوئے سنائی۔

(مجلس حیدرآباد دکن، عبدالحق نمبر ۶۱-۱۹۶۰ء، ص ۶۹-۷۰)

بوجھیں، یہ تک بندی کس کی ہے؟

[تحریر: اکتوبر ۱۹۷۲ء]



استدراک :

(مضمون کا ابتدائی حصہ ۱۹۷۲ء میں تحریر کیا گیا تھا،

ذیل کا اضافہ، بعد کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔)

مشفق خواجہ صاحب نے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کے ایک گرامی نامے میں مجھے اس امر سے مطلع کیا کہ :

ابن انشا کو بھی مولوی صاحب اپنے شعر لکھ کر بھجوا کرتے تھے مولوی صاحب کی وفات کے بعد انشانے یہ اشعار "جنگ" میں چھپوا دیے تھے۔ لاہور میں کہیں "جنگ" کی جلدیں ہوں تو اگست سے دسمبر ۱۹۶۱ء تک کے شمارے دیکھ لیجئے۔ ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے :

گلف نے انشانکا کر دیا
ورنہ تم بھی آدمی تھے کام کے



اب بابائے اردو کے اشعار کی تلاش میں میں نے ابن انشا سے رجوع کیا، ۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے ایک گرامی نامے میں انہوں نے مجھے لکھا کہ :

"بابائے اردو کے متعلق جملہ معلومات کا مخزن مشفق خواجہ ہی ہیں

انے بابائے اردو کے ان اشعار کے مخاطب انجمن ترقی اردو میسور، بنگلور کے سیکرٹری حکیم محمد امام امی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے مولوی عبدالحق کا خط مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۲ء بنام امامی در : مکتوبات بابائے اردو بنام امامی، ص ۶۵

اُن سے باہر کوئی معلومات میرے پاس نہیں۔ اُن کے جو دو چار اشعار معروف ہیں، اُن سے زیادہ کا علم مجھے بھی نہیں۔ تاریخیں بھی خوب نکالتے تھے۔ اثنوس میں نے کبھی ریکارڈ نہ رکھا۔ خیال پڑتا ہے کہ ایک متظوم خط میں جو میرے نام تھا، رائٹرز گلڈ پر کچھ چھینٹے اڑائے تھے، اس عنوان سے کہ وہ مجھے فرصت نہیں بخشی۔ گلڈ کے کاموں میں انہماک کی وجہ سے میں اُن کے پاس کم جاتا تھا۔ جانے وہ فنم کہاں رکھی ہے۔ اُن کے انتقال پر ”جنگ“ میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا، شاید اُس میں اس (نظم) کا عکس بھی تھا۔ یہ چیز بھی مشفق خواجہ کی زبیل میں ہوگی۔

ابن انشانے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے وہ مجھے روزمانہ ”جنگ“ کراچی کی اشاعت ۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ میں ملا۔ مضمون کا عنوان ہے ”مولوی صاحب کے آخری ایام“ اس مضمون میں ابن انشانے، مولوی عبدالحق کی پانچ شعری قلمی تحریر کا عکس بھی دیا۔ اشعار یہ ہیں:

گلڈ نے انشا نکما کر دیا
 در نہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
 گلڈ نہیں یہ گلٹ ہے انشا دور رہو یہ پالی ہے
 کان نہک بے اس میں نہ جانا یہ تو ستیاناسی ہے
 حال کہوں کیا تجھ سے بابا صحبت تیری اچھی نہیں
 گلڈ میں جانا، گلڈ میں ہنا، گلڈ میں کھانا اوباشی ہے

۱۔ اس مضمون کی فراہمی کے لیے میں اپنے کرم فرما، عبدالسلام سلامی (کراچی) کا ممنون ہوں۔

دنیا ایک جنجال ہے پیارے جلال بچپا ہے چاروں کھونٹ
 محنت کھٹن ہے اس سے نکلنا، دیکھ یہ اوگھٹ گھائی ہے
 دیکھ سنبھل جا انشا پیارے صحبت یہ کچھ اچھی نہیں
 کوئی بھی ان میں ایسا نہیں جو وقت پڑے کا ساتھی ہے

مولوی عبدالحمق کے اپنے سوادِ تحریر میں مندرجہ بالا اشعار کا عکس پیش کرنے
 کے بعد تو صنیعاً ابنِ انشانے لکھا ہے کہ ”گلڈ کی مصروفیات کی بنا پر مولوی صاحب کے
 ہاں میرا آنا جانا کچھ کم ہو گیا تھا، اس کا انتقام انہوں نے ان اشعار میں ’میری بجائے
 گلڈ سے لیا ہے، ویسے وہ گلڈ سے محبت کرتے تھے اور اس کے رب سے پہلے بنیادی
 رکن تھے۔“



بابائے اردو کے اشعار کی کُرید میں میرے خطوں کے جواب میں مشتاقِ خواجہ
 نے مجھے لکھا کہ :

”آپ کا پہلا خط بھی مل گیا تھا جواب دینے میں تاخیر اس لیے
 ہوئی کہ میں اس انتظار میں تھا کہ بابائے اردو کے کچھ شعر مل
 جائیں تو آپ کو بھیجوں۔ بابائے اردو کے کچھ شعر میرے پاس ہیں
 تلاش کر رہا ہوں۔ فی الحال ایک غزل ملی ہے، وہی جس کا عشق
 ’بتاں والا شعر مشہور ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بابائے اردو کے
 پوچھا کہ (یہ) کیا... واقعی انھیں کا شعر ہے؟

انہوں نے فرمایا کہ اس زمین میں انہوں نے پوری ایک غزل کہی
 تھی۔ میری فرمائش پر انہوں نے یہ غزل خود لکھ کر مجھے دی مگر

۱۰ روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۱-اگست ۱۹۶۱ء، ص ۴

پنسل سے۔ آپ کو تو ان کا مزاج معلوم ہی ہے۔ اس لیے
ہمت نہ ہونی کہ یہ کہتا کہ قلم سے لکھ دیجئے۔ یہ خستہ حال اور
بریدہ رنگ ”اصل مسودہ ہی آپ کو بھیج رہا ہوں۔“
(خط، ۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۴ء)

یابائے اردو کی قلمی تحریروں سے میری قدیم آشنائی اور شناسائی ہے ”خستہ حال“
اور ”بریدہ رنگ“ مسودہ مولوی عبدالحق ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق
کی یہ اردو غزل ذیل میں پیش کی جا رہی ہے:

ہوں آلودہ عصیاں سے گو سر بسر میں
مٹا دے گی دھتے مری خاک ساری
نہ عشق بتاں ہے، نہ فکرمیشت
گزرتی ہے کیوں جاگتے رات ساری
نشیب و فراز اس جہاں کی ہے ریت
نہ کراے مری جہاں دل اپنا بھاری
* میں کیوں چاہوں عفو گنہ کو کہ اس سے
تجھے شہ ساری مجھے شہ ساری

۱۔ صیاء الدین برنی نے اپنی کتاب ”عظمتِ رفتہ میں اس شعر کی قدرے مختلف قرائت درج
کی ہے (طبع اول ص ۵۰) برنی صاحب کی روایت کے مطابق یہ شعر اس مقالے
کے ابتدائی حصے میں پیش کیا جا چکا ہے۔

* اس شعر اور اگلے شعر پر نشان لگا کر دائیں جانب کی خالی جگہ میں اس شعر کا اضافہ کر دیا

گیا ہے: سزا چاہتا ہوں نہ عفو گنہ کی
کہ ہے اس میں تیری مری پرودہ داری

پہلے پہلے سے تامل و تامل	حسن و کرم - اوست
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں
کہاں کہاں سے کہاں	کہاں کہاں سے کہاں

سزا چاہتا ہوں کہ پناہ ہے جس میں
 تری بردباری، مری بے ستاری
 سمجھتا ہے جس کو تو حسین کامل
 حقیقت میں ہے وہ تری خاک ساری
 کہاں تک یہ مخلوق پستی رہے گی
 کہاں تک یہ آہ و بکا نالہ زاری
 کہاں تک جفائیں، سزائیں جفائیں
 کہ رشتے جس کے زمانے پہ طاری
 سعی میں ہے پناہ خدائی کی رونق
 رزق پہ تنزل ہے سب اعتباری

ترے زہد میں پاپ ہے اور نہ پُن ہے
 ہے اس سے تو بہتر مری سے گساری
 خزاں کا اعلیٰ اٹھ چکا ہے چین سے
 خبر لائی اڑتی سی بادِ بھاری



مستفح خواجہ لکھتے ہیں کہ :

مولوی صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ جب طبیعت ہوزوں پڑتی
 تھی تو خوب شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی سے بھی خاص دلچسپی
 تھی۔ میرے پاس کسی ایسے پُزے تھے، جن پر انہوں نے شعر لکھ
 کر بھیجے تھے۔ افسوس کہ باوجود تلاش کے ان میں سے کوئی نہیں ملا۔
 ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم، اردو بورڈ کا کام انجمن کے کتب خانے
 میں کرتے تھے اور انجمن کا دفتر کھلنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی تشریف
 لے آتے تھے۔ اُن کے لیے بطور خاص یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ
 کتب خانہ وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے کھولا جاتا تھا
 ایک روز ایسا نہ ہو سکا تو ڈاکٹر صاحب نے مولوی صاحب
 سے شکایت کی۔ مولوی (عبدالحمق) صاحب نے ڈاکٹر
 (شہید اللہ) صاحب کی شکایت کو ایک نظم کی صورت میں
 میرے پاس بھیجا۔ اس میں چھ سات شعر تھے۔ پہلے مصرعے
 میں میرا نام تھا اور دوسرا مصرع یہ تھا =
 مجھ سے بڑھے کو کیوں ستاتے ہیں
 آخری شعر یہ تھا :

بورڈ کی خیر ہم مناتے ہیں
 جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے میں
 افسوس کہ باقی اشعار یا دنہیں۔ اگر ریزہ مل گیا تو آپ کو
 بھیج دوں گا۔“ (خط بنام ڈاکٹر سید معین الرحمن
 مرقومہ ۲۸- دسمبر ۱۹۷۴ء)



ذیل کے دو مصرعے مولوی عبدالحق کی یادگار ہیں :

مجھ سے تقریر امامی نے یہ لکھوائی ہے
 ”ایک بیداگر جو روحنا اور سہی“



”چل دیا، ہائے غریب الوطن“

۱۳۷۲ھ

۱۔ افسوس کہ کاغذ کا وہ پرزہ جس پر مولوی صاحب نے اشعار لکھے کبھی بچھے میسر نہیں آسکا۔
 ۲۔ حکیم محمد امامی: اردو اخبار ”آفتاب“ (میسور، بنگلور) کے مدیر، ایک شعری مجموعے اور شخصی مضامین پر مبنی ایک
 کتاب ”نقوش و تاثرات“ کے مصنف اور میسور (بنگلور) کی انجمن ترقی اردو شاخ کے سکریٹری۔
 ۳۔ ماخذ: خطبات عبدالحق، ایڈیشن ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۷۔
 ۴۔ ہجری سال وفات عبد الرحمن صدیقی ۱۰ اس کے بارے میں خود مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ”یہ تاریخ میں
 عبد الرحمن صدیقی کی وفات کے روز گہی بختی“ (قومی بان کراچی، بابائے اردو، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۹)

۶۔ نومبر ۱۹۳۳ء کی رات کالی کٹ (ملیاری) میں بڑے زور کا مشاعرہ ہوا اور بابائے اردو کو میر مشاعرہ بنایا گیا بلکہ ایک شعر بھی تیر کا پڑھوایا (ہماری زبان نئی دہلی ۱۶۔ دسمبر ۱۹۳۳ء)۔ مولوی صاحب کا طبع زاد شعر یہ ہے:

گوپیر ہیں پہ دل سے ہمیشہ جواں رہے

گل کی طرح شکفتہ رہے ہم جہاں رہے

[پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، مرتبہ: سید ہاشمی فرید آبادی کراچی ۱۹۵۳ء، ص ۱۲۴]



درج ذیل دو اشعار کے بارے میں میرا گمان ہے کہ شاید یہ بابائے اردو کے ہوں لیکن یہ ابھی تحقیق طلب ہیں اور مجھے ان کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہیں کہ یہ بابائے اردو ہی کے ہیں۔ ماخذ کے حوالے سے یہ دونوں شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

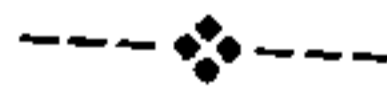
دن کٹا جس طوح کٹا لیکن
رات کتنی نظر نہیں آتی ل



کام آ خلق خدا کے کہ خدا کے نزدیک
اس سے بہتر نہ ہوئی ہے نہ عبادت ہوگی ل

اس ساری بحث کے بعد گوپی چند نارنگ کا یہ کہنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ
”مولوی عبدالحق..... سخن گوئی کے معاملے میں کورے تھے“ ل

[نظر ثانی و اضافہ: اپریل ۱۹۹۲ء]



حوالہ جات:

- ۱۔ مکتوبات بابائے اردو بنام امامی، طبع اول، کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۱۷۴
- ۲۔ بابائے اردو وادی مہران میں ۱۹۶۲ء، ص ۸۵
- ۳۔ ماہی تناظر، نئی دہلی جون ۱۹۸۴ء، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۳۶

مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر

تحریر: محبوب احمد نقوی

بابائے اردو کی شعر گوئی کے بارے میں میری کاوش اور جستجو کا نوٹس لیا گیا اور اس کی قدر افزائی ہوئی۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے اردو کے محسن اعظم بابائے اردو مولوی عبدالحق پر چار روزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا جس میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، ناروے، انگلینڈ اور کینیڈا وغیرہ سے ستر کے لگ بھگ مندوبین نے شرکت کی۔

اس سیمینار میں پیش کیے گئے کچھ مقالات کا ایک مجموعہ ”مولوی عبدالحق - - - ادبی و لسانی خدمات“ کے نام سے ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتب کیا جو ۱۹۹۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۳۲۸ کے تحت شائع ہوا۔ اس مجموعے کا آخری مضمون ”مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر“ جناب محبوب احمد نقوی (لندن) کا تحریر کردہ ہے جسے افادہ عام کے لیے ان کے اور ڈاکٹر خلیق انجم کے شکریے کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمن]

اس عنوان سے ممکن ہے کہ بعض لوگ چونکے ہوں اس لیے کہ مولوی عبدالحق، شاعر کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بھی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک باشعور اور برجستہ گو شاعر تھے۔ ان کا باشعور ہونا ہی آگے چل کر ان کے دوسرے ادبی کارناموں یعنی اشعار اور ترجمے کی تحقیق و تنقید کا وسیلہ بنا اور وہ ایک بلند پایہ محقق و نقاد بن کر سامنے آئے۔ ان کی برجستہ گوئی بھی ضائع نہیں گئی بلکہ گاہے گاہے خاص علمی و ادبی واقعے کی منظوم تاریخی گواہ بن گئی ہے اور گاہے موقع محل کے اعتبار سے محفل میں شہ مکہ صاحبان ذوق کے لیے سارا اہل ذوق کے لیے۔

مانا کہ مولوی عبدالحق اردو کے نامور نثر نگار ہیں اور نثر نگاری ہی ان کی شناخت ہے، پھر بھی ان کا شاعر ہونا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہاں ادبی روایات کا سلسلہ نثر سے نہیں شاعری سے شروع ہوا ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی سب کا تقریباً ایک ہی حال ہے۔ شاعری کی روایت کے مستحکم ہونے کے بہت بعد تحقیق و تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے سارے بزرگ ادیبوں کی ذہنی تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق سے قبل کے ممتاز نثر نگار ڈیپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولانا شبلی چاروں شاعر تھے۔ خود سر سید احمد خاں، جنھیں جدید نثر کا بانی کہا جاتا ہے اور نثر میں جن کی خدمات غیر معمولی ہیں، وہ بھی شاعر تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔

سر سید اور حالی کے بعد کے نثر نگار یعنی مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، محمد دین تاثیر، آل احمد سرور، مولانا حامد حسن قادری، احتشام حسین وغیرہ سب کے سب طبعاً شاعر تھے یا ہیں۔ فراق نے تو خیر تنقید اور شاعری دونوں میں بڑا نام پایا لیکن دوسروں نے بھی شاعری کا قابل ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اور ان میں سے بعض کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ دور کیوں جائیے مولوی عبدالحق سیمنا میں آج جو لوگ بطور نقاد و محقق شریک ہیں ان میں بھی کئی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ایسے میں مولوی عبدالحق کا شاعر ہونا چنداں حیرت کی بات نہیں بلکہ ان کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں سے تو یہ بات روز روشن کا طرح عیاں ہے کہ ان کا شعری ذوق ہی انھیں ادب کی طرف لایا ہے، اور اسی کی بدولت ان کی نثر میں وہ دل کشی پیدا ہوئی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یوں بھی ان کے مقدمات، تبصروں اور تنقیدی مضامین پر نگاہ دوڑائیے تو اندازہ ہو گا کہ ان کی طبیعت کو شاعری سے خاص مناسبت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اردو شعرا کے تذکروں کو نہ ہاتھ لگاتے اور نہ اردو شعرا کے انتخاب کلام کی طرف توجہ کرتے۔ دوسرے مضامین کو چھوڑیے، صرف انتخاب کلام میر ہی کے مقدمے کو لے لیجیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ شاعری کی تفہیم و تنقید کا کیسا اچھا شعور و سلیقہ رکھتے تھے۔

مولوی عبدالحق کو میں نے اوپر باشعور شاعر کہا ہے اور وہ اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ دوستوں کی طرح بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکے نہیں بلکہ اپنی خوش ذوق اور شاعرانہ صلاحیت کے باوجود بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ شاعر سے اچھے نثر نگار ہو سکتے ہیں اور شاید یہ بھی محسوس کر لیا کہ کسی زبان یا قوم کو صرف شاعری کی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور علمی و ادبی نثر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی

نظر سے غالباً مولانا روم کا یہ قول بھی گزر چکا تھا کہ

شعر گفتن گرچہ در سختن بود

شعر فہیدن بہ از گفتن بود

یعنی شعر کہنا یقیناً، موتی پر رونے کا کام ہے اور بہت مشکل کام ہے لیکن شعر کی تفہیم و تنقید کا کام کچھ اس سے بھی زیادہ بہتر کام ہے۔ اسی لیے انھوں نے دانستہ شاعری کو اوروں کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے معنوی استاد سرسید احمد کی طرح خود کو نثر کے لیے وقف کر دیا۔

مولوی عبدالحق کا شعری سرمایہ کسی ایک جگہ مجتمع نہیں بلکہ اُن کی تشریروں خصوصاً خطبات اور مکتوبات میں جا بجا بکھرا ہوا ہے اور ہماری نگاہوں سے عموماً اوجھل ہے۔ اُن سب کا کھوج لگانا، انھیں یکجا کرنا اور جانچنا پر کھنا کسی بلند پایہ محقق کا کام ہے، میں تو، ادب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں اور مجھے چوں کہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کی ذات و صفات سے خاص دلچسپی ہے، اس لیے اس محفل میں اُن کی شاعری کے ذکر کو ضروری جانا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے تلاشِ سیار یا تحقیقِ واقعی کا بھی کوئی موقع نہیں ملا اور نہ شاید میں اس کا اہل ہوں نتیجہً جو چیزیں آسانی سے ہاتھ لگ سکیں، بطور تبرک پیش کیا جا رہا ہے۔

اب سے کم و بیش پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں کراچی میں تھا۔ اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ عام میں "عظمتِ رفتہ" نامی کتاب دیکھ رہا تھا۔ ضیاء الدین احمد برنی کی کتاب تھی اور اس میں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں چھوٹے چھوٹے خاکے تھے۔ مجھے کتاب اچھی لگی، اپنی پسند کے سارے ادیبوں کے خاکے پڑھ ڈالے اور لطف اندوز ہوا کتاب کے آخر میں مولوی عبدالحق کا خاکہ تھا۔ اس میں ان کے چند شعر نظر آئے۔ میں نے کچھ شعرا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ اشعار یہ تھے۔

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے مگر جاگتے رات کشتی ہے ساری

تو نے حقی کو خوب گانٹھا ہے اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ہے
دیکھنے میں وہ پھول ہے لیکن درحقیقت وہ سیرہ کا کانٹا ہے

لے یہ قطعہ شانِ الحقی کے بارے میں ہے۔ اس کے سلسلے میں برنی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ محض مذاقاً

لکھا گیا ہے۔ اس سے کسی کی تنقید مراد نہ تھی۔ مولوی صاحب حقی کو بہت چاہتے تھے۔ ص ۵۰۸

عبدالحق سیمنار کے لیے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کو قلم اٹھایا تو یہی اشعار میرے لیے موضوع بن گئے۔ کراچی میں دو تین دن قیام کر کے میں نے مولوی صاحب کی شاعری کے بارے میں مزید مواد فراہم کرنا چاہا۔ پہلے تو مایوسی ہوئی پھر کسی نے بتایا کہ اردو کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر سید معین الرحمن کی ایک نئی کتاب "تحقیق اور تلاش" کے نام سے بازار میں آئی ہے اس میں ایک مضمون مولوی عبدالحق کی شاعری کے بارے میں بھی ہے۔ اردو بازار گیا کتاب آسانی سے مل گئی اور میرے لیے لطف مسرت کا باعث ہوئی۔ لندن میں رہ کر بھی ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب کے نام اور کام سے متعارف تو تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ مولوی عبدالحق کی زندگی، شخصیت اور نثر نگاری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور ان پر درجنوں مقابے ہی نہیں تین چار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی شاعری کے سلسلے کا مضمون بھی میرا حاصل اور محققانہ تھا۔ نتیجتاً اس سے آگے کھوج کرنے کی ہمت نہ ہوئی میں نے اسی کو اپنے مضمون کا اصل ماخذ بنالیا اور اس جگہ اسی کی مدد سے مولوی عبدالحق کے جستہ جستہ اشعار، آپ کی لطف اندوزی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

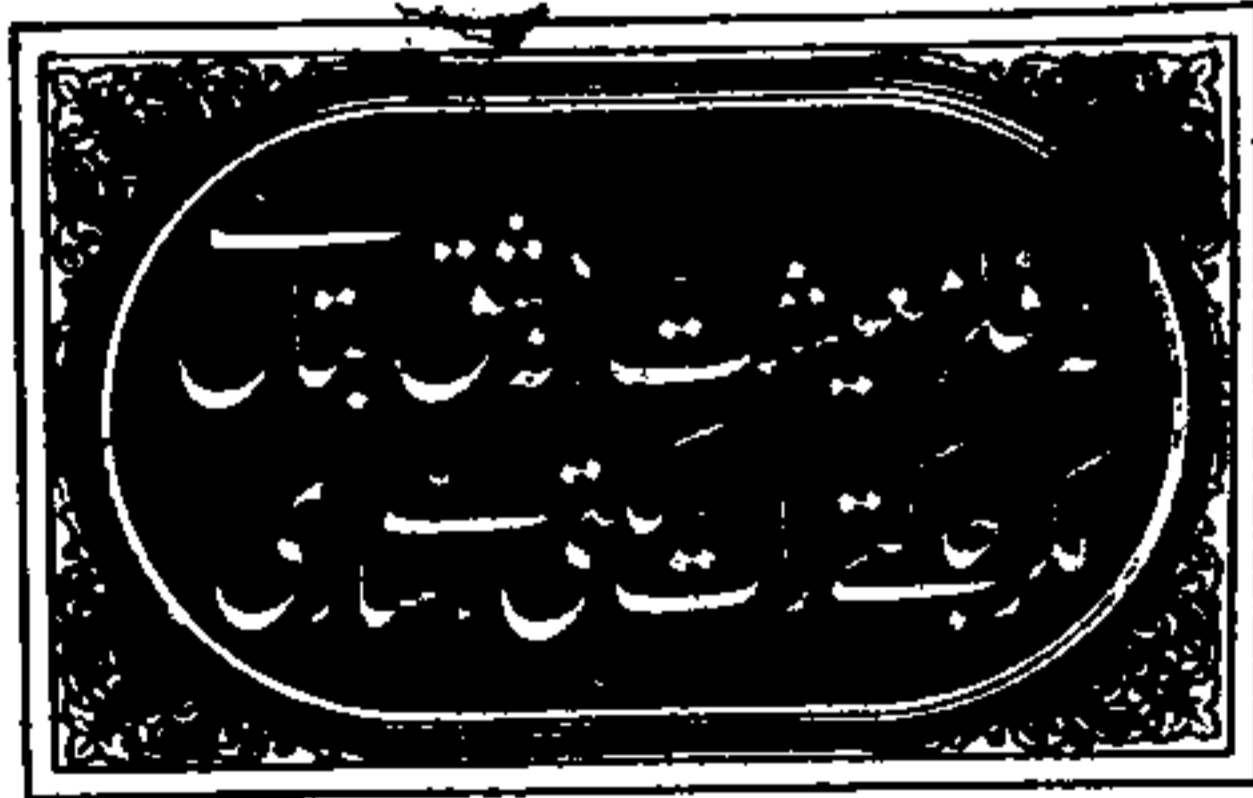
اوپر، ضیاء الدین برنی کی کتاب کے حوالے سے یہ شعر نقل کیا گیا ہے
 نہ عشق بتاں ہے، نہ فکر معیشت ۴ مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری
 یہ شعر، اکیلا نہیں ہے بلکہ مولوی صاحب کی مکمل غزل سے تعلق رکھتا ہے اس غزل میں
 گیارہ اشعار ہیں، صرف چند شعر دیکھیے۔

مٹا دے گی، دھتے مری خاکساری	ہوں آلودہ عصیاں سے گوسر بسر میں
نہ کراے مری جان، دل اپنا بھاری	نشیب و فراز اس جہاں کی ہیں ریتیں
تیری برد باری، مری بے قراری	سزا چاہتا ہوں کہ پنہاں ہے جس میں
کہاں تک یہ آہ و بکا نالہ نزاری	کہاں تک یہ مخلوق پرستی رہے گی
ہے اس سے بہتر مری لے گاری	تسے زہر میں پاپ ہے اور زہن ہے
خبر لانی اڑتی سی باد بہاری	خزاں کا عمل اٹھ چکا ہے جن سے

ایک اور شعر میری توجہ کا مرکز بنا۔ یہ فرد کی صورت میں ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ مولوی عبدالحق میں غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ موجود تھا۔ اگر وہ چاہتے تو بہت اچھی غزلیں کہہ سکتے تھے لیکن انھوں نے دانستہ شعر گوئی سے گریز کیا اور افادیت کے نقطہ نظر سے نثر نگاری ہی کو مستقلاً اپنا لے رکھا

شعر یہ ہے۔

دلوں پہ قبضہ خیالات پر حکومت ہے اب اس سے بڑھ کے تمہیں اختیار کیا ہوگا
 مولوی صاحب برجستہ گوئی اور تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے اس کی بھی کئی
 مثالیں اپنے مضمون میں درج کی ہیں لیکن میں انہیں اس جگہ نقل کرنے کے مضمون کو بے جا طول نہیں دینا
 چاہتا۔ بتانا صرف یہ تھا کہ مولوی عبدالحق شاعر بھی تھے اور شعر گوئی کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے لیکن
 ان کی خود شناسی نے انہیں شاعر بننے سے روکا اور سرسید احمد خاں کی راہ پر چلنے پر ہمیںز کیا۔ واقعہ
 یہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے جس جدید اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی تھی مولوی عبدالحق نے اُس پر ایک تاج
 محل تعبیر کر دیا اور آج ہم مولوی عبدالحق سیمینار کے حوالے سے اس تاج محل کو حیرت سے دیکھ
 رہے ہیں۔



گچھ بابائے اردو کی شادی کے بارے میں

تحریر: جولائی ۲۰۰۲ء

(۱)

انتظارِ حسین نے ایک موقع پر اپنے مخصوص اسلوب میں مولانا حامد علی خاں (۱۹۰۱ء-۱۹۹۵ء) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء) کی ایک ابتدائی ملاقات کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے:

”حامد علی خاں کے بیان سے پتہ چلا کہ مولوی عبدالحق سے جب

ان کی ملاقات ہوئی تو اس کا سماں کچھ یہ تھا:

مولوی عبدالحق: میاں تمہاری شادی ہوگئی ہے؟

حامد علی خاں: جی نہیں۔

مولوی عبدالحق (مسرت بھرے لہجے میں): کیا کہا، شادی نہیں ہوئی!

حامد علی خاں: جی نہیں۔

مولوی عبدالحق: شاباش، شاباش، اب تم دل لگا کر اردو کی خدمت کرو۔

حامد علی خاں نے شاباش لی اور اطمینان سے شادی کر لی! خیر، اردو

کی خدمت انہوں نے اس کے بعد بھی کی، مگر اتنی ہی جتنی کہ ایک

شادی شدہ آدمی کر سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا معاملہ یہ تھا کہ بقول

مولانا حامد علی خاں انہوں نے تو اردو ہی سے شادی کر لی تھی۔“

[روزنامہ، مشرق، لاہور ۳۰-اگست ۱۹۷۱ء]

اردو سے شادی کر لینے والی بات“ بابائے اردو پر متعدد لکھنے والوں نے یہاں تک

کہ ان کے بہت سے دوسرے قریبی احباب تک نے بارہا کہی ہے۔ یہ بات، ایک بڑے طویل

عرصے سے اور اس قدر تواتر اور وثوق کے ساتھ کہی جاتی رہی ہے کہ اس نے ایک طرح سے

”مسلمہ صداقت“ کی سی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء-۱۹۵۶ء) کے

چھوٹے اور مولانا حامد علی خاں اور پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۲ء-۱۹۷۴ء) کے بڑے بھائی

پروفیسر محمود احمد خاں (۱۸۹۳ء-۱۹۷۳ء) سے جو بابائے اردو کے ہم دم دیرینہ تھے اور جن کی بابائے اردو سے ۱۹۱۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی، ۱۹۶۵ء میں مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بابائے اردو کی شادی کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں پروفیسر محمود احمد خاں نے کسی قدر سختی اور عزم کی پختگی سے فرمایا کہ:

”۔ میں شادی کے بارے میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ شادی کے بارے میں مجھے پتہ ہے لیکن مجھے مولوی صاحب نے راز رکھنا پسند فرمایا، مجھ سے اس سلسلے میں کچھ نہ ٹولے، اسے ROMANCE ہی رہنے دیجیے۔“

اس موضوع پر میرا کوئی استدلال مسموع، گزارش کا کوئی انداز مقبول اور کوشش کا کوئی طریق نتیجہ خیز نہ ہوا۔“

اقومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۶ء ص ۱۲۷

شادی کے موضوع سے بابائے اردو مولوی عبدالحق ”ایلر جک“ نہیں تھے۔ اس حوالے سے اُن کی زندہ دلی اور شگفتہ طبعی کی بعض روایتیں ملتی ہیں۔ پروفیسر محمود احمد خاں نے ہی ایک ملاقات میں راقم الحروف (سید معین الرحمن) کو بطور ”لطیفہ“ ایک قصہ سنایا کہ:

”میری شادی ہونے سے ایک دو برس پہلے کی بات ہے ایک اینگلو انڈین لڑکی مولوی (عبدالحق) صاحب کو ملی۔ مولوی صاحب اس سے متاثر ہوئے، اور ایک روز ترنگ میں آ کر کہا، ”اس کی شادی کراؤ۔“ احباب نے نام تجویز کرنا شروع کر دیے۔ مولوی صاحب نے ہاشمی فرید آبادی سے کہا کہ ”اور سب کو چھوڑ دو، بھئی محمود سے کراؤ۔ اس پر بڑی چہل رہی۔“ ااقومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۶ء ص ۱۲۸

بابائے اردو کے ایک پرانے خادم ہاپوڑ کے بشیر احمد قریشی کا کہنا ہے کہ:

” ایک دن مولوی (عبدالحق) صاحب اور اُن کے کئی دوست ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ

مولوی صاحب، اب تو آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ یہاں ایک کافی مالدار عورت ہے۔ اس پر مولوی صاحب خوب ہنسے اور کہنے لگے کہ اگر یہ عورت اپنی تمام دولت میری ”انجمن“ کے نام کر دے تو میں شادی کر لوں گا۔“

ابابائے اردو کے کہانی، ان کے معتمد کی زبانی‘

کراچی طبع اول ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۹

۱۹۶۳ء میں مجھے بابائے اردو کے ایک بہت ہی دیرینہ اور معتمد دوست نواب معشوق

یار جنگ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ پہلی بار ۱۹۰۱ء میں مولوی عبدالحق سے ملے اور پھر

مولوی صاحب سے ان کا یہ تعلق، مولوی عبدالحق کے دم آخر (اگست ۱۹۶۱ء) تک قائم رہا۔

انہوں نے بتایا کہ انہیں کئی بار ”مولوی صاحب کے والد علی حسن صاحب کے نیاز کی عزت

حاصل ہوئی۔ وہ حیدرآباد میں آتے تو میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ مجھ پر خصوصی

شفقت فرمانے لگے تھے، لیکن اسی خانگی بات کا انہوں نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا، اور نہ میں

نے کبھی کچھ پوچھا۔“ (قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۶)

میرے ایک سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا: ”تجرتہ پسندانہ زندگی

کی نعمتوں یا متاہلانا زندگی کی برکتوں کا کوئی ذکر مولوی صاحب نے مجھ سے نہیں کیا بلکہ کسی سے

بھی نہیں کیا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی ہو گئی تھی۔ لڑکی والوں نے بعض

رسموں کی انجام دہی پر اصرار کیا تو مولوی صاحب بدک گئے۔ اور وہاں سے بمبئی بھاگ

آئے۔ یہاں سے کچھ دنوں بعد حیدرآباد چلے گئے۔ بعد میں سنا طلاق بھی ہو گیا تھا.... (لیکن)،

یہ میں کوئی شہادت نہیں دے رہا۔ یہ سماعی بات ہے۔ میں نے جیسا سنا آپ کو بتا دیا۔ اب صحیح

(قومی زبان، ایضاً ص ۱۳۶)

صورت کیا تھی، اللہ جانے!“

شاہد احمد دہلوی نے مولوی عبدالحق کی شادی کے بارے میں ایک موقع پر گول مول

سی بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں:

”مولوی عبدالحق صاحب نے شادی ساری عمر نہیں کی۔ یہ بھی سنا تھا کہ

ایک دفعہ گھر والوں نے گونتھ گانتھ کے اُن کی شادی کر دی تھی تو مولوی عبدالحق نے حیدرآباد پہنچ کر طلاق نامہ بھیج دیا۔ اصل میں اُن کی شادی تو اُردو سے ہو چکی تھی۔“

اقومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۶

۲

بابائے اُردو کے قریبی احباب کے قیاسات سے قطع نظر، بابائے اُردو کے بعض قدیم نجی خدمت گزاروں کے بیانات سے یہ صریح شہادت ملتی ہے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی شادی ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ان کے ایک قدیم اور آبائی خدمت گار صوفی عبدالرشید سے منسوب ایک روایت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس روایت کو پیش کرنے سے پہلے، یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ راوی، صوفی عبدالرشید ہیں کون؟

صوفی عبدالرشید نے، پروفیسر شمیم احمد سے ایک بات چیت میں اپنے بارے میں

بتایا ہے کہ:

”...میرا سارا خاندان، مولوی (عبدالحق) صاحب کے خاندان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ دبا رہا ہے... میرا اور مولوی (عبدالحق) صاحب کا تعلق میرے دادا کے وقت کا تھا۔ میرے دادا اُن کے پرانے ملازم تھے اور اس طرح میری تین پشتیں مولوی (عبدالحق) صاحب کے خاندان کی خدمت میں گزر گئی ہیں۔ میری پیدائش بھی مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق کے گھر میں ہوئی اور میرے والد عبداللطیف بھی اسی طرح اس خاندان کے دعا گو اور احسان مند رہے۔“

[اقومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۵-۲۲۶]

صوفی عبدالرشید بتاتے ہیں کہ:

”علمی، تعلیمی اور قومی کاموں میں ہر وقت مصروف رہنا اور زندگی کی کسی بڑی سے بڑی رنگینی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، ان کا خاص جوہر تھا... حتیٰ کہ مولوی (عبدالحق) صاحب نے اپنی شادی بھی اس خوئے بیگانگی کی نظر کر دی۔ جب اُن کی چھوٹی بہن کی شادی ”چھوٹے محل“ میں ہونے لگی جو ہاپوڑ کا زمیندار گھر انا تھا تو مولوی صاحب کی شادی بھی اسی گھر کی ایک لڑکی سے طے کر دی گئی۔ مولوی صاحب کی بیوی کا نام جعفری تھا۔

یہ شادی مولوی (عبدالحق) صاحب نے والدہ کے اصرار پر کی تھی مگر اُن سے یہ بردستی زیادہ دیر برداشت نہیں ہوئی اور بیوی سے بالکل تعلق ہی نہیں رکھا اور علی گڑھ چلے گئے۔ تھوڑے عرصے بعد مولوی صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اُن کی شادی کسی دوسری جگہ ہو گئی مگر مولوی (عبدالحق) صاحب نے پھر ساری عمر شادی نہیں کی۔ صوفی عبدالرشید نے اپنی سنی سنائی، یہ ساری روایات اپنی والدہ سے منسوب کی ہیں۔ [قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء ص ۲۲۶]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ایک دوسرے پرانے خادم بشیر احمد کے بیانات سے صوفی عبدالرشید کی پیش کردہ روایات کی تائید ہوتی ہے۔

بشیر احمد نے بقول خود ”اپنے گھر کے نامساعد حالات کی بناء پر گیارہ برس کی عمر میں بابائے اُردو کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق کی خدمت اختیار کی (یہ غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے)۔ ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے بشیر احمد کو اپنی خدمت کے لئے حیدرآباد بلوا لیا۔“ اور پھر چالیس برس کے طویل عرصے تک بشیر احمد نے مولوی صاحب کی خدمت میں گزار دیئے۔ ”بابائے اُردو کی کہانی“ کے نام سے بشیر احمد کا ایک کتابچہ (۷۵ صفحات پر مشتمل) ۱۹۸۳ء میں کراچی سے شائع ہوا جس سے بابائے اُردو کی نجی زندگی بالخصوص اُن کی شادی کے موضوع پر

قابل توجہ مواد ہاتھ آتا ہے۔

بشیر احمد کے بقول:

”مولوی عبدالحق صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے محلّہ قانون گویاں میں رہا کرتے تھے اور میرا خاندان بھی اسی محلّے میں آباد تھا۔ اسی محلّے میں مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق بھی رہتے تھے اور رئیس لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔“ [مذکورہ کتابچہ، ص ۱۱۱]

بشیر احمد بتاتے ہیں کہ:

”جناب قبلہ مولوی (عبدالحق) صاحب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ شادی نہیں کی لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ انہوں نے شادی کی تھی اور جس لڑکی سے شادی ہوئی تھی وہ بھی مولوی صاحب کے خاندان کی تھی۔ یہ بات اس لیے بھی پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ (ہاپوڑ میں) میرا مکان بھی مولوی صاحب (کے مکان) کے بالکل قریب تھا اور میری والدہ صاحبہ برابر ان کے ہاں آیا جایا کرتی تھیں، اور جس دن مولوی صاحب کی شادی ہوئی، میری والدہ بھی شریک ہوئی تھیں۔ جب شادی سے فارغ ہو گئے تو سب لوگ اگلے دن صبح کو ویسے کی تیاری میں مصروف تھے، معلوم ہوا کہ دولہا میاں علی الصبح گھر سے روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ بات بڑی مضحکہ خیز تھی۔ گھر کے لوگوں کو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑی۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا (کہ) مولوی صاحب قبلہ نے اپنی بیوی کا مہر وغیرہ سب کچھ ادا کر دیا ہے۔ ان کی بیوی کافی عرصے تک اپنے میکے میں بیٹھی رہیں اور پھر کافی عرصے کے بعد ایک دوسرے صاحب جناب ممتاز حسن صاحب کے ساتھ ان کا نکاح ہوا اور کئی بچے بھی ان سے ہوئے، جو اب تک ہاپوڑ میں موجود ہیں۔“

[مذکورہ کتابچہ، ص ۳۹-۴۰]

ہاپوڑ کے بشیر احمد قریشی کا کتابچہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس مختصر سی کتاب کی اشاعت سے بیس برس پہلے بشیر احمد نے والدین کے بے پناہ احترام اور مولوی عبدالحق کی شادی کے بارے میں کم و بیش یہی باتیں پروفیسر شمیم احمد سے ایک بات چیت میں ریکارڈ کرائیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ:

” (مولوی عبدالحق کے بھائی) ضیاء الحق صاحب اپنی والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ میں نے انہیں اکثر ان کے پیردباتے دیکھا تھا۔ والدہ کی عزت کے معاملے میں مولوی عبدالحق صاحب کا بھی یہی احوال تھا جو ضیاء الحق صاحب کا۔ کسی بات کو ان کی ٹال نہیں سکتے تھے۔۔۔“

اقومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۳ء ص ۱۸۸

بابائے اردو کے ایک قدیم رفیق کار مولانا سید عطا حسین کی ایک تحریر سے بھی والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت کے بارے میں بشیر احمد کے بیان کی تائید اور توثیق ہوتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ لکھتے ہیں کہ:

”میں مولوی عبدالحق کو چالیس سال سے جانتا ہوں (جو ہر ص ۳۲)۔ مولوی عبدالحق والد کا اس قدر ادب کرتے تھے جس قدر کہ اب سے دو نسل پہلے ہندوستان کے شریف خاندانوں کے ممتاز لوگ کیا کرتے تھے۔ ان کی محبت اور اطاعت اور خدمت گزاری میں انہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ والدہ مرحومہ کے ساتھ جہاں تک میں نے سنا، ان کا ادب اور ان کی محبت اور اطاعت اور خدمت گزاری اس سے بھی کچھ بڑھ کر تھی۔“

۱ مولانا سید عطا حسین، رسالہ جوہر، دہلی عبدالحق نمبر ۱۹۴۰ء ص ۱۱۸

ہاپوڑ کے بشیر احمد قریشی شہادت دیتے ہیں کہ:

”مولوی (عبدالحق) صاحب کی شادی محض والدہ کے اصرار سے ہوئی

تھی، حالانکہ مولوی صاحب کی مرضی بالکل نہ تھی اور شادی کے ہی دن

وہ گھر سے فرار بھی ہو گئے تھے۔ شادی کے معاملے میں دونوں بھائی یکساں طبیعت رکھتے تھے۔ ضیاء الحق صاحب کو بھی شادی سے بڑی نفرت تھی، اسی لیے اُن کی شادی بہت عمر میں ہوئی۔ اُن کی شادی بھی والدہ کے اصرار پر ہوئی۔

مولوی (عبدالحق) صاحب کی شادی کا بھی قصہ اسی طرح کا ہے میری والدہ کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی ہاپوڑ میں ایک معزز خاندان کی لڑکی سے اُن کی والدہ نے طے کر دی جبکہ مولوی صاحب کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ مگر وہ والدہ کی بات کو اُس وقت نہ ٹال سکے اور مجبور ہو گئے، لیکن شادی ہی کے دن گھر سے فرار ہو گئے۔ کئی سال تک اُن کی بیوی بیٹھی رہیں، پھر مولوی صاحب نے والدین کے انتقال کے بعد ایک عزیز کو اُن کے مہر کا روپیہ ادا کر کے طلاق دے دی۔ اس مطلقہ خاتون کی شادی بعد میں ممتاز حسن صاحب (ہاپوڑی) سے ہو گئی۔۔۔“

ابشیر احمد کی بات چیت شمیم احمد سے، قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۳ء، ص ۱۸۸

۳

”شادی و غم زمانے میں توام ہے“ کے مصداق۔ اب یہاں سے حسن اتفاق اور سوئے اتفاق کا ایک طویل اور تھکا دینے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

ستمبر ۱۹۸۷ء میرا اردو میں خواتین لیکچرار کی ایک انتخابی کمیٹی میں جانا ہوا۔ سیشن کم تھیں اور اُمیدوار خواتین بہت زیادہ۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی جب انٹرویو میں ایک بچی ناصرہ شمیم نے بتایا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی حیات اور خدمات کے موضوع سے اُسے خاص دل چسپی ہے۔ بابائے اردو کی عائلی زندگی کے بارے میں ناصرہ شمیم کی گفتگو کو میں نے

بالخصوص بہت معلومات افزاء پایا۔ اور رابطہ رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔

میں نے ناصرہ شمیم کو اپنی کتاب ”ذکر عبدالحق“ بھیجی اور درخواست کی کہ بابائے اردو کی ابتدائی خانگی زندگی کے بارے میں ان قریبی اور قیمتی ماخذ کی بنیاد پر، جو ان کی دسترس میں تھے، مجھے ضروری معلومات فراہم کریں۔ مدتوں انتظار رہا۔ ان کی جانب سے یکسر خاموشی! پھر ایک خوشگوار صبح مجھے کالج کے پتے پر ان کا ۱۵۔ اپریل ۱۹۸۸ء کا خط ملا، جس نے مجھے حد درجہ شاد و شاد کام کیا۔

ناصرہ شمیم نے اپنے خط میں بابائے اردو کی شادی کے موضوع پر جو اطلاعات فراہم کیں اور مولوی عبدالحق کے دوسرے اقرباء کی نام بنام جو تفصیلات عطا کیں وہ بے حد قیمتی تھیں۔ ”تھیں“ اس لیے کہتا ہوں کہ یہیں سے خرابی، قسمت یا سوائے اتفاق کے منسحل کر دینے والے سانچے یا سلسلے سے دوچار ہونا پڑا۔

”شادی و غم زمانے میں تو ام ہے۔“ ناصرہ شمیم کا یہ خط میرے کاغذوں میں کہیں ادھر ادھر ہو گیا اور صد ہزار کوشش اور تلاش کے باوجود یہ مجھے نہ ملا۔ ان کا گھر کا پتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ خط کا مضمون اور خلاصہ تو ذہن میں رہا لیکن خط کے متن سے محرومی نے مجھے حد درجہ بے کیف کیا اور کوئی چودہ برس بے بس اور بے چین رکھا۔

”چودہ برس“ بعد حسن اتفاق سے پچھلے دنوں عزیزہ ناصرہ شمیم کا ۱۹۸۸ء کا لکھا ہوا خط مجھے رسالہ جوہر، دہلی کے عبدالحق نمبر منبوعہ ۱۹۴۰ء میں رکھا ہوا مل گیا۔ بابائے اردو میرا پہلا عشق تھے حالات اور حادثات مجھے اپنے اس محبوب موضوع سے دور لے گئے۔ کہنا یہ ہے کہ بابائے اردو کے احوال و آثار کے ادنیٰ طالب علم کے طور پر میں ناصرہ شمیم کے اس خط کو اپنے مضمولات کے اعتبار سے بہت اہم خیال کرتا ہوں، اس لیے اسے یہاں درج اور محفوظ کرتا ہوں۔ وہ لکھتی ہیں:

۱۵۔ اپریل ۱۹۸۸ء

گرامی قدر جناب پروفیسر سید معین الرحمن صاحب، السلام علیکم
امید ہے کہ آپ اور تمام اہل خانہ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا نوازش

نامہ اور خوب صورت قیمتی کتاب کا تحفہ گھر کے پتے پر ملا۔ بہت مسرت ہوئی، بے حد شکریہ۔ جواب تحریر کرنے میں اس لیے تاخیر ہوئی کہ میں (بنوں کے ایک گریڈ کالج میں) ایڈ ہاک لیکچرار ہوں۔ چھٹیوں میں گھر گئی تو خط موصول ہوا۔

میں آپ کو معلومات بھیج رہی ہوں، اگر مزید معلومات کی ضرورت ہو تو لکھیے گا..... تا حال ایڈ ہاک کی تلواریں سر پر ہے اور مستقل ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ میری ذاتی لائبریری میں ”ذکر عبدالحق“ ہے لیکن ”نقد عبدالحق“ ابھی تک پڑھنے سے محروم ہوں۔ جناب زہرا معین صاحبہ کی کتاب یونیورسٹی کے زمانے میں پڑھی تھی۔

کبھی آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے گا۔ خط ملتے ہی رسید ضرور بھیجے گا تاکہ اطمینان ہو کہ خط مل گیا ہے۔ آپ کو اور زہرا صاحبہ کو بہت سلام۔

خدا حافظ، خیر اندیش

ناصرہ شمیم

اپنے اس خط کے ساتھ عزیزہ ناصرہ شمیم نے بابائے اردو کی خانگی زندگی کے بارے میں جو قیمتی اطلاعات فراہم کی ہیں وہ ان کے حوالے اور شکریے کے ساتھ اردو ادب کے خوش ذوق قارئین اور بابائے اردو کے مداحوں کی نذر کرتا ہوں:

مولوی عبدالحق کے والد کا نام شیخ علی حسین تھا۔ بابائے اردو کی بہن فاطمہ بیگم کی شادی، ہاپوڑ کے ایک خوش حال گھرانے میں مولوی محمد الیاس کے بیٹے محمد حسن سے ہوئی۔ مولوی محمد الیاس کی دو بیٹیاں ذکر النساء اور جعفر النساء تھیں۔ مولوی عبدالحق کی والدہ لطیفن بیگم، ذکر النساء کا رشتہ لے کر مولوی محمد الیاس کے گھر گئیں۔ مولوی محمد الیاس اولے بدلے کی شادی کے سخت خلاف تھے لیکن اپنی بیوی کے مجبور کرنے پر رشتہ قبول کر لیا۔

مولوی عبدالحق صاحب دکن میں مقیم تھے اور انہیں رشتہ طے ہونے کی کوئی اطلاع

نہیں تھی، جب وہ ہاپوڑ آئے تو ان کی والدہ نے رشتے کے متعلق بتایا جس سے وہ بہت ناراض ہوئے اور شادی سے انکار کر دیا، اور والدہ کو قائل کرنے کوشش کی کہ وہ کسی کی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتے لیکن والدہ کے اصرار پر وہ والدہ کا حکم نہ ٹال سکے اور شادی ہو گئی۔ یہ غالباً ۱۸۹۵ء۔ سے ۱۹۰۰ء کے درمیان کا واقعہ ہے۔ جس دن شادی ہوئی، اسی دن اپنی والدہ کو طلاق نامہ تھا کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ والدہ نے طلاق نامہ ذکر النساء عرف ذکر بیگم سے چھپا لیا۔ ذکر النساء کچھ دنوں بعد اپنے والدین کے گھر ”محل“ میں واپس آ گئیں۔ ”محل“ کو ذکر النساء کے نانا مولوی محمد حسین نے جو جج اور صدر الصدور کے عہدوں پر فائز رہے، ہاپوڑ میں تعمیر کرایا تھا۔

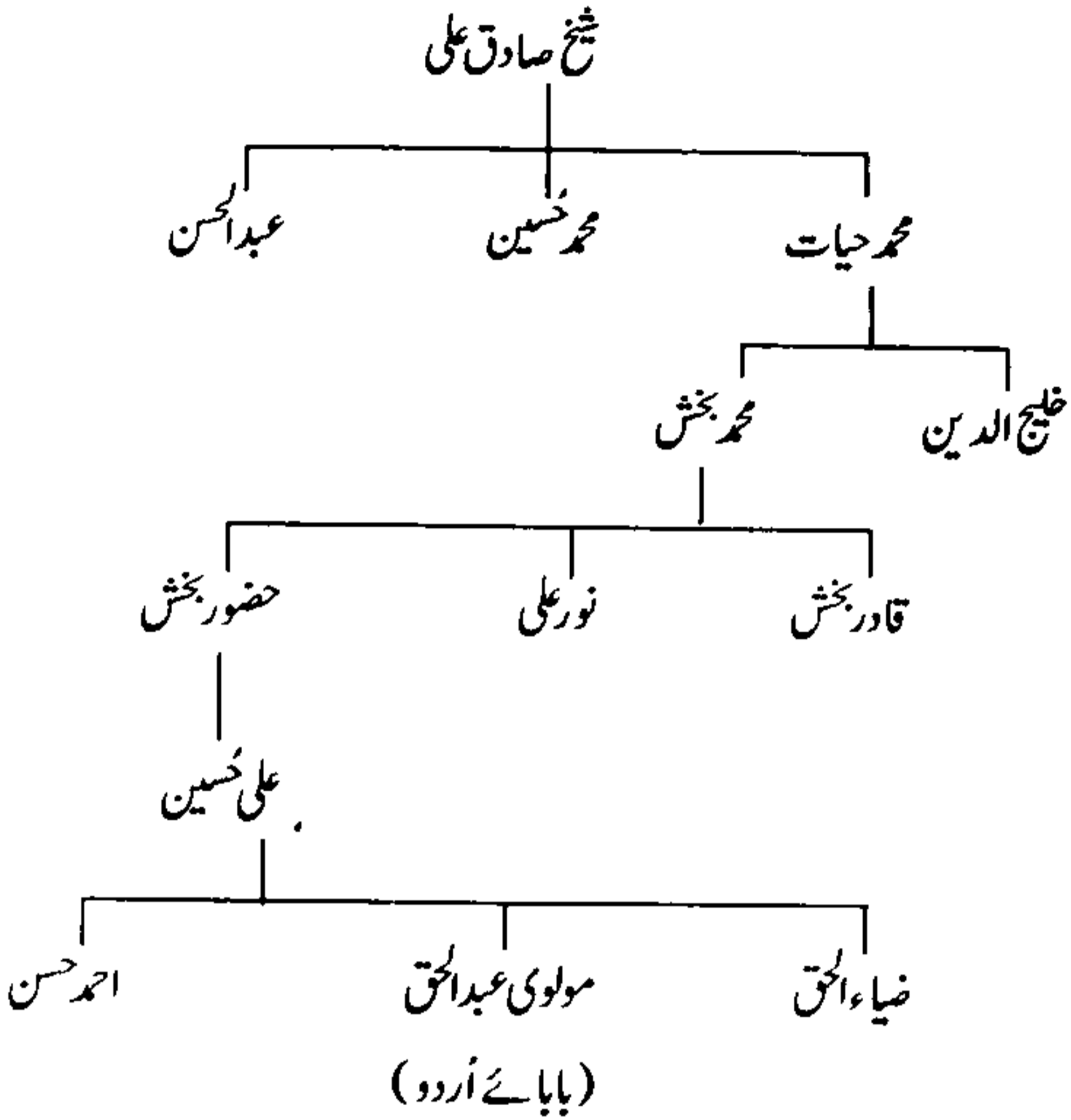
ذکر النساء چودہ (۱۴) سال گھر بیٹھی رہیں۔ اس دوران میں مولوی ممتاز احمد جو ہاپوڑ کے رئیس اور میونسپل بورڈ کے ممبر تھے، اور بابائے اردو کے قریبی دوستوں میں سے تھے، بابائے اردو کے پاس گئے اور ذکر النساء کا حال بیان کیا۔ بابائے اردو نے نہایت افسوس کیا اور اپنے حالات اور مجبوریوں سے مولوی ممتاز احمد کو آگاہ کیا۔

بابائے اردو نے دوبارہ طلاق کے کاغذ تیار کیے اور مہر کی رقم پانچ صد روپے ادا کی۔ مولوی ممتاز احمد کی پہلی بیوی فردوسی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ بابائے اردو نے مولوی ممتاز احمد سے کہا کہ آپ ذکر النساء سے شادی کر لیں اور اس طرح مولوی ممتاز احمد نے ذکر النساء سے شادی کی اور ان کے تین بچے ہوئے جن میں آمنہ بیگم بقید حیات ہیں۔

عزیزہ ناصرہ شمیم، ذکر النساء کے دوسرے شوہر جناب ممتاز احمد کی بیٹی آمنہ بیگم سے ملی ہیں۔ اس کے علاوہ خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بھی انہوں نے خاصی معلومات اکٹھی کیں۔ ان کی فراہم کردہ اطلاعات کا ایک ماخذ بابائے اردو کے ماموں محمد صدیق کے بیٹے جناب سلطان احمد قریشی بھی ہیں۔ ناصرہ شمیم کے بقول سلطان احمد قریشی صاحب ریٹائرڈ سی ایس پی آفیسر ہیں۔ ان کی پرورش خود بابائے اردو کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ سب ماخذ بڑے قریبی اور بے حد مصدقہ ہیں۔

ناصرہ شمیم نے اپنے چچا کے حوالے سے، بابائے اردو کا شجرہ نسب بھی فراہم کیا ہے

جس کی تفصیل یہ ہے:



میں عزیزہ ناصرہ شمیم سے از سر نو رابطے کے لیے کوشاں ہوں۔ میرے استفسارات کے جواب اور بعض دستاویزات کے حصول کی صورت میں، اس موضوع پر کسی اگلی فرصت میں کچھ کہنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے لیکن سر دست ”موجود اور حاضر“ مال اور مواد کو محفوظ اور عام کر دینا میرے نزدیک زیادہ اہم ہے۔

اس موضوع کا ایک دوسرا رخ بھی تحقیق طلب ہے کہ مولوی عبدالحق عمر بھر شادی نہ کرانے پر حد درجہ بغض اور مُصر اور اس سے بیزار اور نفور کیوں رہے؟ میں، اس بارے میں، اپنے طور پر تلاش و تحقیق کی روشنی میں ایک بہتی مفروضے پر پہنچا ہوں۔ لیکن اس سستی مفروضے (Directional Hypothesis) کو رتبہ اعتبار دینے کے لیے جن ضروری اور بنیادی دستاویزی یا یعنی شہادتوں کی ضرورت ہے، اس میں ابھی مجھے پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ اس

لیے نظر بظاہر اور بشرط حیات ” کچھ مزید“ پھر کبھی۔ خدا توفیقات مزید سے نوازے۔
یہاں ”تحقیق اور موضوع تحقیق“ کے بارے میں خود اپنی ایک پرانی تحریر کی طرف دھیان
جاتا ہے جس کا اس موقع پر اعادہ بے محل نہ ہوگا:

”تحقیق کا عمل مچھلی کا شکار کرنے سے مشابہ ہے۔ کنڈی ڈال کر ہمیں
بیٹھ رہنا ہے۔ صبر، ضبط، انتظار۔ اس میں حسن اتفاق، یا تائید ایزدی کو
بھی دخل ہے۔ کب، کہاں اور نا کہاں بہت کچھ ہاتھ آ جائے اور کب
ہم تادیر خالی ہاتھ رہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کیل کانٹے سے لیس، ہمیں یہ
بہر حال دیکھنا ہوگا کہ صحیح جولان گاہ ہے کہاں؟ یا کہاں ہو سکتی ہے۔ پانی
اتھلا ہے، آلودہ ہے، پرسکون نہیں یا نمکین ہے، یا بیٹھنا کس رخ ہے؟
بعد کے سارے مراحل خود ہماری محنت، نظر، خبر، مزاجی مناسبت اور

مقدر کا حاصل ہوں گے۔”

بابائے اردو مولوی عبدالمحی :

ضرورت مندوں کی مدد کر کے وہ خوش ہوتے تھے اور سب سے زیادہ خیال اپنے
شاگردوں کا رکھتے تھے۔ کسی شاگرد کی شہروانی پھٹ گئی ہے، مولوی صاحب نئی شہروانی کا انتظام
کر رہے ہیں۔ سائیکل ٹوٹ گئی ہے۔ مولوی صاحب اس کے لیے سائیکل منگوا رہے ہیں۔ کسی
کے گھر سے منی آرڈر نہیں آیا۔ کوئی فکر نہیں مولوی صاحب کی تنخواہ تو موجود ہے۔

ایک بار شاگردوں کی دعوت کی۔ کھانے کی میز پر خشک میوے بھی موجود تھے بہتوں
نے میووں سے جیبیں بھر لیں۔ سنجیدہ اور شرمیلے طالب علم اس حرکت سے باز رہے۔ مہمان
رخصت ہونے لگے تو حکم ہوا جن کی جیبوں میں میوے بھرے ہیں وہ ایک طرف کھڑے
ہو جائیں اور خالی جیب والے دوسری طرف۔ جن کی جیبیں بھری ہوئی تھیں شرم سے ان کے
سر جھک گئے مگر شامت ان کی آئی جن کی جیبیں خالی تھیں۔ فرمایا: تالا یقو، تمہیں یہ خیال نہ آیا کہ
تمہارے سوا میرا ہے کون، جو انہیں ٹھکانے لگائے گا۔ چلو اپنی اپنی جیبیں بھرو۔ یہ تھا اپنے
شاگردوں کے لیے مولوی صاحب کی شفقت کا حال!

— پروفیسر ڈاکٹر نوز الحسن نقوی

بابائے اُردو کا مقصدِ حیات

انجمن ترقی اُردو پنجاب کے زیر اہتمام جمعرات ۷۔ دسمبر ۱۹۸۹ء کی سہ پہر قائد اعظم لائبریری، باغ جناح لاہور کے ہال میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی یاد میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت انجمن ترقی اُردو پاکستان کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے فرمائی۔ اس تقریب میں مجھے بابائے اُردو کے مقصدِ حیات کے بارے میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ یہاں اس بات چیت کے ابتدائی کلمات محفوظ کیے جا رہے ہیں۔

[سید معین الرحمن]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق میرا پہلا ادبی عشق اور میرا پہلا موضوع تھے۔ میری اور اُن کی عمر میں بہتر برس کا فرق اور فاصلہ تھا۔ مجھے ان کی زندگی کے آخری دو برسوں میں ان کی خدمت میں حاضری کا اور کسی قدر خدمت کا موقع ملا۔

یہ تیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں نے بابائے اُردو کے قائم کردہ ادارے اُردو کالج، کراچی میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ کالج کی عمارت کے ایک حصے کی بالائی منزل ہی میں بابائے اُردو کا قیام تھا۔

اُردو کالج کراچی نے بابائے اُردو کی سترویں سالگرہ منانے کا اہتمام کیا اور بابائے اُردو کی ادبی خدمات کے موضوع پر ملک بھر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات کے درمیان مضمون نویسی کے مقابلے کا اعلان کیا۔ اس مقابلے میں میری معلمانہ کوشش انعام کی مستحق ٹھہری، کس قدر قابلِ لحاظ یہ میرا ادبی اور تنقیدی نوعیت کا پہلا مضمون تھا۔ پھر مجھے ”برگ گل“ کے بابائے اُردو نمبر کی ترتیب و ادارت کی عزت بھی حاصل ہوئی اور مولوی صاحب کی خدمت میں بار بار کی حاضری کی سعادت کے مواقع عام ہوئے۔

اوائل عمر میں جو ایک سبق مجھے مولوی صاحب سے ملا اور جو مجھے ہمیشہ یاد رہا، وہ تھا: ”باتیں کم، کام زیادہ۔“ باتیں بنانا مجھے کبھی نہ آیا، اور کام اپنی بساط کے مطابق میں نے کیا، اگرچہ اس کی طرف سے مطمئن کبھی نہیں ہو پایا۔

”بابائے اُردو..... احوال و افکار“ کے نام سے میری پہلی کتاب اب سے ۲۵ برس پہلے ”انجمن“ نے شائع کی پھر ترمیم اور اضافے کے بعد یہ کتاب یہاں لاہور

سے ۱۹۷۶ء میں چھپی کتاب کی تیسری اشاعت اب سے دس برس پہلے ۱۹۷۹ء میں دہلی سے عمل میں آئی..... اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

بابائے اردو کے بارے میں میری تین اور کتابیں: ”نقد عبدالحق“ (۱۹۶۸ء)..... ”ذکر عبدالحق“ (۱۹۷۵ء) اور ”فرمودات عبدالحق“ (۱۹۷۸ء) لاہور میں شائع ہوئیں اور ان کتابوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن نکلے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ بابائے اردو میرا پہلا ادبی عشق اور موضوع تھے۔ ان کو ہم سے جدا ہوئے ۲۸ برس ہو چلے۔ شوق اور ضرورتیں مجھے دوسرے موضوعات کی طرف لے گئیں لیکن مولوی صاحب کی یادوں اور ان کے اثرات سے میں نے اپنے آپ کو کبھی بے نیاز نہیں پایا۔

اپنی ذات کے حوالے سے ان تمہیدی کلمات اور اس پس منظر کا ایک جواز ہے۔ ایسی کوئی تقریب جو مولوی صاحب کے حوالے سے ہو اس میں حاضری کو میں اپنی پہلی ترجیح اور ذمہ داری خیال کرتا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے قیام کے ایک سو پچیسویں جشن سالگرہ کی مناسبت سے آج کالج کے بخاری آڈیٹوریم میں بڑے پیمانے پر ایک مباحثے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کالج میں سوسائٹیز بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے اس تقریب کے ایک منتظم اور میزبان کے طور پر میری موجودگی ضروری تھی۔ لیکن کسی ایسی تقریب میں جو بابائے اردو کی ذات سے منسوب ہو اور کسی ایسی تقریب میں شرکت جس کی دعوت ڈاکٹر وحید قریشی کی جانب سے ہو اور جو قائد اعظم لائبریری کے خوشگوار اور باوقار ماحول میں ہو..... اور ان سب پر مستزاد ایسی تقریب جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر کی زیر صدارت منعقد ہو شریک ہونا بڑے اعزاز اور عزت کی بات ہے اور میں نے اس سے محروم ہونا گوارا نہیں کیا..... اگرچہ تا آخر (یعنی چائے تک اگر یہاں یہ آج پروگرام میں شامل ہے) میں شاید نہ ٹھہر سکوں۔

میں نے ابھی ”صدر انجمن“ کے عالی رتبہ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ ”صدر انجمن“ ہونا ایک معنی رکھتا ہے اور ایک بڑی تاریخ بھی۔

دسمبر ۱۹۰۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سے جس کے صدر ہزہائی نہیں آغا خاں تھے دہلی میں اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے چار ذیلی شعبے قائم کیے:

ایک: مدارس کا۔

دوسرا: اصلاح تمدن کا۔

تیسرا: تعلیم نسواں کا اور

چوتھا: اردو کا۔

”اردو“ کا یہ آخری ذیلی شعبہ انجمن ترقی اردو کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ اور سیکرٹری مولانا شبلی قرار پائے۔

انجمن کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ، گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد تھے جہاں علامہ اقبال نے ان سے اکتساب کیا، خود آرنلڈ نے بھی اقبال سے فیض پایا اور ان سے عربی پڑھی..... خیر، تو انجمن کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ..... بعد کے صدور میں:

نواب عماد الملک، نواب مسعود جنگ، سر اس مسعود، سر تیج بہادر سپرو، سر شیخ عبدالقادر، داتا تریہ کیفی، خود بابائے اردو، گورنر اختر حسین، قدرت اللہ شہاب اور جناب نور الحسن جعفری۔

جناب نور الحسن جعفری کا آج، لاہور کی اس تقریب میں ہونا اور آج کی اس تقریب کی صدارت کرنا ہمارے لئے دل کشا ہے اور ایک معنیٰ تکریم رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق متفقہ طور پر بڑی شخصیت کے مالک تھے اور ”بڑی شخصیت کی مشکل یہ ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جا سکتا“۔ بابائے اردو کے کارنامے بھی اتنے زیادہ اور اس قدر رنگا رنگ ہیں کہ ایک مضمون یا کسی ایک نشست میں ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں یہاں اختصار کے ساتھ مولوی عبدالحق کے مقصد حیات کے بارے میں جو

ان کی زندگی کے ہر دور میں ایک ہی رہا، خود مولوی عبدالحق کی ایک بات کی جانب اشارہ کر کے اجازت چاہوں گا۔ وہ لکھتے ہیں:

”میری زندگی کا مقصد صرف دنیا میں ایک ہی ہے، وہ یہ کہ اردو کو ترقی ہو اور وہ علمی زبان بن جائے..... آئندہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ اہل ملک کو ”آزادی“ ملے گی (خدا کرے کہ وہ زمانہ جلد آئے)۔ (آزادی یا) حکومت کی کوئی صورت بھی ہوئی خواہ ملک امریکہ کی طرح مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو یا ایک انتظام (وفاق) کے تحت میں رہا، زبان کا سوال ناگزیر ہے۔ ہمیں ابھی سے اس کے لیے تیار رہنا چاہئے۔“

(۸ نومبر ۱۹۲۰ء بنام ڈاکٹر انصاری)

مولوی عبدالحق کے یہ کلمات، قیام پاکستان سے ۲۷ برس پہلے کے ہیں لیکن یہ ان کی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، دیدہ وری اور پیش قیاسی کے امین اور ان کے مقصد حیات کے منہ بولتے مظہر ہیں۔

علامہ اقبال کا مولوی عبدالحق کو یہ لکھنا بالکل بجا تھا کہ:

”آپ کی تحریک، اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں، جس کی ابتدا سر سید احمد نے کی تھی۔“

قیام پاکستان کے بعد اردو کو بوجہ اس کا صحیح منصب دینے میں بعض مصلحتیں اور کمزوریاں حائل رہیں۔ مولوی عبدالحق کو اس سے بڑی اذیت ہوئی۔ انتقال سے ایک برس پہلے انہوں نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے جو اپیل شائع کی وہ بے حد حزنیہ اور رقت آمیز ہے اور ہمارے نوجوانوں کو اسے پڑھنا اور اپنی ذمہ داری کو جاننا چاہئے۔

۱۹۶۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر نے کہا تھا کہ:

”خیرہ ذوقی اور اغراض جوشی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں مولانا عبدالحق جیسے کسی فرد کا پیدا ہونا بظاہر مشکل نظر آتا

ہے۔“

لیکن خود مولوی عبدالحق کے بقول تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقت میں جب دل بچھ گئے ہوں، سکوت اور سناٹے کا عالم ہو:

”ایسے باہمت جوان مرد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کر جاتے ہیں۔“

(لاہور ۷ دسمبر ۱۹۸۹ء)



انجمن ترقی اردو پاکستان

آرڈور روڈ - کراچی ۷۵

صدر دفتر: ۲۳۲۴۸۳
ٹیلیفون: اردو کالج: ۲۳۰۱۹۱
انجمن پریس: ۷۰۳۱۱

شمارہ
تاریخ ۲۱۹

برادر محترم معین، السلام علیکم وعلیٰ آئینہ مطہر۔

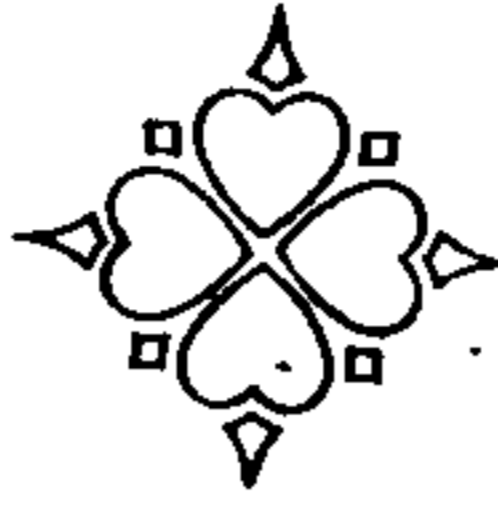
تراویح پڑھنا، شعرہ سننا اور عورتوں پر رحم رکھنا۔
ان ساری باتوں کو بچھڑانا اور ان کا ذکر نہ کرنا۔
ان ساری باتوں کو بچھڑانا اور ان کا ذکر نہ کرنا۔
ان ساری باتوں کو بچھڑانا اور ان کا ذکر نہ کرنا۔
ان ساری باتوں کو بچھڑانا اور ان کا ذکر نہ کرنا۔
ان ساری باتوں کو بچھڑانا اور ان کا ذکر نہ کرنا۔
ان ساری باتوں کو بچھڑانا اور ان کا ذکر نہ کرنا۔

انشاء اللہ، جس کا عالم سے وہم نہ رہا۔
میرا بے اندازہ ہر سونے والا۔ اس سے بے حد خوشی ہوئی اور نہ اس کے
نور و ہر دوں کے ساتھ وہ اس کے ساتھ ہیں۔
کامیابیوں میں کیا تھا۔ وہم نہ رہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہیں۔
بہتر اور بڑے۔ اس کے ساتھ ہیں۔
دعوت ناموں کو تقسیم ہے اور انشاء اللہ میں اعلان کرانے کے اہل
سوسائٹی میں فروغ دینے کے لئے۔
اپنی سبھی سوسائٹی کے لئے۔
دس سالہ عرصے میں عرصے عرصے اور اس میں رہا۔
گھنٹہ تا عرصے میں عرصے عرصے اور اس میں رہا۔

میرا بے اندازہ ہر سونے والا۔ اس سے بے حد خوشی ہوئی اور نہ اس کے نور و ہر دوں کے ساتھ وہ اس کے ساتھ ہیں۔ کامیابیوں میں کیا تھا۔ وہم نہ رہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہیں۔ بہتر اور بڑے۔ اس کے ساتھ ہیں۔ دعوت ناموں کو تقسیم ہے اور انشاء اللہ میں اعلان کرانے کے اہل سوسائٹی میں فروغ دینے کے لئے۔ اپنی سبھی سوسائٹی کے لئے۔ دس سالہ عرصے میں عرصے عرصے اور اس میں رہا۔ گھنٹہ تا عرصے میں عرصے عرصے اور اس میں رہا۔

بزمِ حق:

- ۱۳۵۔ بابائے اردو اور نواب معشوق یار جنگ
- ۱۳۶۔ بابائے اردو اور پروفیسر محمود احمد خاں
- ۱۵۱۔ بابائے اردو اور پروفیسر جمید احمد خاں
- ۱۶۷۔ بابائے اردو اور ڈاکٹر سنس ایس۔ اسے رحمن
- ۱۷۹۔ بابائے اردو اور حکیم اسرار احمد کریوی



کتاب میں سچی ”بزمِ حق“ کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ اس بزمِ لے پانچوں سوار، افسوس کہ اب ہم میں نہیں، لیکن بابائے اُردو کے بارے میں اُن کے بیانات، تخمینے اور تجزیے بابائے اُردو کے مزاج اور اُن کی افتادِ طبع کو سمجھنے کے لئے بالذات دائمی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اس سے قطع نظر بابائے اُردو کے ان ہم جلیسوں کی سحر آگیاں باتوں میں اپنائیت اور محبت کی جو خوشبو اور مہک رچی بسی ہے۔ وہ بجائے خود بھی ایک کشش اور خسن رکھتی ہے۔

— ڈاکٹر سید معین الرحمن

بابائے اردو اور نواب معشوق یار جنگ

[مکالمہ کراچی یکم اگست ۱۹۶۳ء]

یکم اگست ۱۹۶۳ء کو نواب معشوق یار جنگ سے بابائے اردو کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ مسودہ صاف کر کے میں ۴۔ اگست ۱۹۶۳ء کو نواب صاحب کی خدمت میں باروگر باریاب ہوا کہ احتیاطاً وہ اسے دیکھ لیں تاکہ کسی غلطی کی راہ پا جانے کا امکان نہ رہے۔

اس روز میری فرمائش پر انہوں نے اپنے مختصر حالات اور کوائف بھی اپنے قلم سے تحریر فرما کر عطا کیے جس کا عکس محفوظ کیا جا رہا ہے۔ ”وفیات مشاہیر پاکستان“ (مطبوعہ: مقتدرہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء) کے مولف پروفیسر محمد اسلم کے مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں نواب معشوق یار جنگ کا انتقال ہوا۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمن]

اجما عولی قالی قیتی اصحا عوا
محبی مراد سے ملنے کرنا ضرور نہیں کسی کہ کبھی ملک کیے جو انہوں
نورسوں نے اہتمام کے لیے کیا

عکس تحریر: نواب معشوق یار جنگ

برائے نام مشرف سے۔ بڑا دلہ خان بیاد در غنائت میں تین دن سرہارو انڈیا میں

مللاؤت میں ڈیٹی کلکٹر اور اہانت سپرنٹنڈنٹ میں وزیر عدالت تھے۔ سن

۱۸۸۰ء میں بدایون میں پیدا ہوئے۔ برٹش راج میں دعوتی تعلیم کا آغاز پھر ہی ایک

بڑے فاضل عالم سے کرے۔ وہاں پیدائش پھر شریانی اور ۱۹۰۱ء میں ماسٹر عالم

سے اور اہانت پھر لائی درسی کتابی اور ۱۹۰۵ء میں پائرس لیا۔ پھر مدرس

مکہ حیات خان صاحب صاحبزادہ بہت ڈالیا اور پھر سید صاحب صاحب مداح تھی

میں وہاں سے اہانت کر کے پھر تھیں وہاں سے تھیں۔

پھر وہاں سے تھیں وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

کا کرنا تھا پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

نے کبھی تعلیم نہیں دہریہ ۱۹۰۴ء تک پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

۱۹۰۹ء میں میں پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

تو وہ پید کرنا۔ پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

نے بہت لیا اور کبھی خلیفہ نہیں میں ڈیٹی کلکٹر کرنا۔ ان کے دنوں میں ایک

~~تھیں وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک~~

پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

۱۱۱۷ھ

میں پھر وہاں سے تھیں۔ ان کے دنوں میں ایک

نواب معشوق حسین یار جنگ بہادر، بابائے اُردو کے رفقاءے قدیم میں سے ہیں۔ بابائے اُردو سے آپ کی ملاقات ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور یہ ایسی ہوئی کہ پھر عمر بھر کا ساتھ ہو گیا۔ آپ کے والد ماجد خان بہادر عنایت حسین خاں۔ سرکار انگریزی کی ملازمت میں ڈپٹی کلکٹر اور ریاست بھوپال میں وزیر عدالت تھے۔ نواب صاحب ۱۸۸۰ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج سے الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں گلبرگہ شریف کے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ پھر سر علی امام۔ صدر اعظم ریاست حیدرآباد کے ایما پر ضلع بیڑ میں ڈپٹی کمشنر کے منصب پر ترقی پا گئے۔ یہاں سے آپ کا تبادلہ راجپور ہوا اور پھر وہاں سے گلبرگہ شریف گئے۔ یہاں دو سال کا سرکار انجام دینے کے بعد آپ کا تقرر بلدہ حیدرآباد یونیورسٹی میں شریک معتمد مال (جو اینٹ سیکرٹری) کے طور پر ہو گیا۔ وہاں سے آپ جج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور واپسی پر ۱۹۳۷ء میں ناظم عطیات (انعام کمشنر) کی خدمت تفویض ہوئی۔ اسی عہدے سے ۱۹۳۸ء میں وظیفہ حُسر۔ خدمت پایا اور اب کراچی میں خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نواب صاحب نے متعدد کتابیں تالیف و ترجمہ فرمائیں۔ تصوف سے خاص شغف ہے۔ پہلی صدی سے آٹھویں صدی ہجری کے متصوفین پر آپ کی تالیف لطیف "اخبار الصالحین" اس موضوع پر بڑی مستند خیال کی جاتی ہے۔ اس میں سوانح کے علاوہ کلمات طیبہ کو بھی بڑی کاوش اور صحت کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔

نواب صاحب حالی، شبلی اور ڈوٹی نذیر احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ سر
 راس مسعود۔ مولینا وحید الدین سلیم پانی پنی اور عبد الحلیم شریک کے ہم صحبت رہتے
 ہیں۔ بابائے اردو سے آپ کے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔
 انجمن ترقی اردو، پاکستان کی جانب سے یکم اگست ۱۹۶۴ء کو نواب صاحب
 سے انٹرویو لیا گیا۔ بتقاضائے احتیاط انٹرویو ترتیب دینے کے بعد موصوف
 کو دکھایا گیا ہے۔ اس طرح اب اس گفتگو میں واقعات اسرار اور سنیں وغیرہ
 کی غلطی کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

- سید معین الرحمن

انجمن کے قریب میں طے شدہ پروگرام کے مطابق بابائے اردو سے متعلق ایک غیر رسمی انٹرویو
 کے لیے نواب معشوق یا جنگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوف غالباً میرے منتظر ہی تھے۔
 چھوٹے سے جدید طرز کے روشن ڈرائنگ روم میں نشست دیتے ہوئے نواب صاحب
 نے فرمایا:

”میں لکھاؤں یا آپ کچھ پوچھیں گے؟“

میں کچھ پوچھنے کے لیے تو حاضر ہوا ہی تھا، پوچھنا ہی تھا اس لیے میں نے اول اُسے لکھ لینا
 غنیمت خیال کیا جسے از خود نواب صاحب لکھانے کی پیش کش فرما رہے تھے۔
 — مولوی صاحب کا عجیب طریقہ تھا۔ وہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔
 نئے گریجویٹس کو اپنے قریب آنے کا موقع دیتے اور انہیں اپنے ساتھ رکھنے کی
 کوشش کرتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ان کے ذوق کی تربیت اور تعمیر کر سکیں۔
 ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ سے بی اے کر کے واپس حیدرآباد پہنچا تو پہلے
 تو مولوی صاحب سے پہلی بار نیاز کا شرف حاصل ہوا۔ مولوی صاحب ان دنوں
 مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس تھے۔“

نواب صاحب ذرا کی ذرا کے اور ماضی کو اپنے ذہن میں اچھی طرح اُجال کر پھر گویا ہونے
 کا لچ سے ہم خام نکلتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہ کہ گویا سب کچھ ہو گئے۔ میرا حال اس سے

ذرا مختلف نہ تھا۔ مولوی صاحب کی صحبت نصیب ہوئی تو پتہ چلا کہ کس قدر تہی ہاں اور خام ہیں۔ اس احساس کی بیداری پر مولوی صاحب کی ترتیب صحیح نے بیش کلام کیا۔ میرا ہی نہیں مولوی صاحب کے ساتھ رہ کر بہت سے نوجوانوں کا یہ حال ہوا انہیں راہ مل گئی۔

میں نے اس ذیل میں کچھ اسماوریافت کرنے چاہئے تو جو اب نواب صاحب نے مولانا سید ہاشمی فرید آبادی اور جناب اختر حسین رائے پوری کا نام لیتے ہوئے فرمایا۔

یہ مولوی صاحب ہی کے صحبت یافتہ ہیں۔ ان کے ہاں ذوق صحیح کی نمو مولوی صاحب ہی کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب چھوٹوں پر شفقت تو فرماتے ہی تھے۔ ان سے بے تکلف بھی ہو جاتے۔ ان میں گھل مل کر رہتے۔ بے جا پندار نہ فرماتے اور تفوق تو ذرا بھی نہ جتاتے۔ طالب علموں میں تب ہی تو وہ بہت مقبول رہے۔ طالب علم انہیں گھیرے رہتے اور مولوی صاحب خود ان میں بالکل بچہ بنے رہتے۔ اور باتوں ہی باتوں میں انہیں کام کی باتیں تعلیم کرتے رہتے۔ میرے ایک چھوٹے بھائی لطافت حسین خان کار حجان میڈیشن کی طرف تھا۔ تب علی گڑھ میں بیالوجی نہیں تھی۔ وہ انٹر کر کے میرے پاس حیدرآباد دکن آگئے۔ یہاں میں نے طب کے بعض ہشیار اساتذہ سے ان کی تعلیم کا انتظام کرا دیا۔ انہیں لے کر میں مولوی صاحب کے پاس بھی گیا۔ مولوی صاحب نے بہت جلد لطافت کو اپنے آپ سے مانوس کر لیا۔

نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ سامنے کے دریچے سے باہر دو رکھیں نظریں گاڑے وہ شاید اُس وقت کو، ان دنوں اور لمحوں کو دیکھ رہے تھے جو خواب ہو چکے۔ ہلکی بادامی رنگ کی صوفیانہ سی شیروانی کے پورے بٹن لگائے، کچھ خمیدہ سے وہ صوفے پر گم مٹھے تھے اور میں سحر زدہ سا انہیں تک رہا تھا کہ ایسا ایسی وہ کھلکھلا پڑے۔ تب مجھ پر روشن ہوا کہ تسم میں ایک خاص مصیبت کا الوہیت، تازگی اور سرشاری صرف شیرخواروں کا حصہ ہی نہیں!۔ از خود رفتگی کے سے عام ہیں نواب صاحب جیسے اپنے آپ سے گویا تھے :

”مدرسہ آصفیہ کے سامنے ڈھال پر مولوی صاحب لطافت کے ساتھ خوب ہی تو
لوٹا کرتے تھے۔!“

اور میں یہ سن کر بدتمیزی سے ہنس دیا۔ نواب صاحب چونگ سے گئے اور مجھے اپنی حرکت
خفیہ کا احساس ہو گیا۔ اس دم بہکتے ماضی نے اپنا آنچل شاید لپیٹ لیا اور نواب صاحب پھر
اسی کثیف دنیا میں چلے آئے اور میں نے سنا وہ فرما رہے تھے =

لطافت کا لگاؤ حالانکہ میڈیسن کی طرف تھا۔ لیکن مولوی صاحب کی صحبت کا ان پر خوب
خوب اثر ہوا۔ ادب سے دل چسپی پیدا ہو گئی اور علمی مذاق ابھر آیا۔ پھر لطافت انڈین میڈیکل سروس
پاس کیا۔ لیفٹنٹ کرنل ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں وہ لندن سے واپس لوٹے تو مولوی صاحب
نے ان سے فرمائش کر کے باجین پریسیچرل صحت کے نام سے کتاب لکھوائی اور انجمن نے
اسے شائع کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ معروف جرمن پروفیسر EBERS کے ایک ناول تھا بھی بہت
غیر معمولی۔ اس کی کہانی تین تہذیبی ادوار پر پھیلی ہوئی تھی انگریزی میں اس کے ترجمے کا نام
”THE PRINCESS“ تھا مولوی صاحب کے ایسا پر لطافت نے اسے ایضاً حواشی
کے ساتھ اردو میں منتقل کیا۔ مولوی صاحب نوجوان صالح دیکھ کر اسکی ٹریننگ کرتے
تھے۔ اُس میں صحیح ذوق اور مذاق پیدا کر دیتے اور پھر اس کی حوصلہ افزائی کر کے اس کی مخفی
قوتوں کو پیدار کرتے اور اس سے اچھے اچھے کام لیتے۔ یہ ان کی خاص ادا تھی۔ مجھ میں بھی
لکھنے پڑھنے کا جو کچھ ذوق ہے مولوی صاحب ہی کا فیض اور عطیہ ہے۔ ورنہ ایک ذمہ دار
سرکاری ملازم ادب کی طرف کب متوجہ ہونکا ہے! انجمن کے لیے میں نے ”مبادئی سائنس“
کے نام سے ایک کتاب ترجمہ کی اور ”بجلی کا کرشمہ“ کے نام سے ایک کتاب جو تالیف کی تو
اسے بھی میں مولوی صاحب کی صحبت کے اثر ہی کی ایک یادگار خیال کرتا ہوں۔“

نواب صاحب نے ذرا ٹھہر کر پھر بتانا شروع کیا :

نومبر ۱۹۳۳ء میں لیفٹنٹ کرنل لطافت حسین خاں ناگپور میں انسپکٹر جیلز کے منصب پر
فائز تھے کہ شہید کر دیے گئے۔ نواب صاحب اتنا کہہ کر چپ ہو گئے اور اس ذکر سے ان
کے چہرے پر فسردگی نے جو سایہ ڈالا تو میں اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قدرے

توقف کے بعد نواب صاحب پھر گویا ہوئے :

”مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں اپنے دفتر میں مصروف کار تھا کہ ناگپور سے اس سانحہ کا تاثر ملا تو گھبرا کر میں اول مولوی صاحب کے پاس ہی دوڑا گیا تھا مولوی صاحب نے طبیعت پر اس کا بہت اثر لیا۔ وہ یہ خبر سنی کہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ یہ ان کی محبت اور انسان دوستی پر دلالت کرتا ہے“

نواب صاحب خاصی دیر خاموش رہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ذہن میں واقعات کی کڑیاں ترتیب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے میں بھی چپ سا دھے رہا۔ آخر نواب صاحب نے کہنا شروع کیا :

”اس زمانے میں جب مولوی صاحب نے طالب علمی کا دور ختم کر کے عملی زندگی اختیار کی وہ بہت خاموش خاموش رہا کرتے تھے۔ لیکن ان میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ دبتے کسی سے نہیں تھے۔ بہت دبنگ تھے۔ سرفسر الملک مدرسہ آصفیہ کے صدر اور بانی تھے۔ مولوی صاحب انہیں کے مدرسے میں رہتے ہوئے ان سے کبھی دب کر نہ رہے۔ ایک دفعہ سرفسر الملک نے باقاعدہ وقت طے کر کے کسی ضرورت سے مولوی صاحب کو بلایا۔ یکے میں بیٹھ کر میں بھی مولوی صاحب کے ساتھ گیا۔ راستے میں میں نے پوچھا ”آپ کتنی دیر لگائیں گے۔؟“ فرمایا ”بس ایک منٹ میں آیا، دیکھو تو“ میں حیران ہوا۔ خبر یہ گئے۔ سرفسر الملک نے آنے میں دیر کی اور یہ وہاں ایک مختصر پیغام چھوڑ کر اٹھ آئے کہ ”مجھے اتنی فرصت نہیں کہ بیکار بیٹھ کر وقت ضائع کروں۔ یہی رویہ مولوی صاحب کا گاندھی اور نہرو وغیرہ کے ساتھ رہا۔ کسی سے بے جا وہ خائف ہوئے نہ مغلوب۔ حیدرآباد میں مولوی صاحب کی قدر بھی خوب ہوئی۔ ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ حیدرآباد میں ایک علمی و ادبی جلسہ ہوا“

میں نے درمیان میں پوچھا ”یہ انداز اکب کی بات ہوگی؟“ نواب صاحب نے ذرا غور کے بعد فرمایا۔ سن تو مجھے صحیح یاد نہیں رہا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری تھے۔ ان کی صدارت میں ہی جلسہ ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے اکبر بادشاہ

لے مولوی عبدالحق کے مضمون کا عنوان تھا: ”اکبر کی تمدنی اصلاحیں“ یہ طویل مضمون حیدرآباد یونیورسٹی کے فونڈیشن کے دوپروٹھا گیا اور رسالہ ”زمانہ“ کانپور نومبر ۱۹۰۶ء ص ۲۹۱ تا ۲۹۰ میں شائع ہوا۔ (سید معین الرحمن)

پر مضمون پڑھا۔ خوب داد ملی۔ خود مولوی عزیز مرزا صاحب نے فخریایا۔ میں بھی اکبر پر مضمون لکھ کر لایا تھا لیکن یہ مولوی صاحب کے پر مغز مضمون کے سامنے ہیچ ہے۔ میں اسے پھاڑ کر پھینکتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر داد اور قدر افزائی بھلا اور کیا ہو سکتی تھی؟ مولوی صاحب کو اردو مخطوطات کی تلاش کا جنون تھا۔ سچ یہ ہے کہ ان کی فراہمی میں انہوں نے بہت محنت کی اور اس میں بہت لکھیریں اٹھائیں۔ میں ۲۷-۱۹۲۵ء میں رانچور میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہاں ایک گاؤں ”اناہ سور“ میں مشائخین کے مزارات اقدس ہیں۔ جہاں مجھے اردو کے نادر مخطوطات کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ مولوی صاحب کے ہم راہ میں نے بھی وہاں کا سفر کیا۔ مولوی صاحب کو یہاں بعض کارآمد کتابیں دستیاب ہوئیں۔ بیجاپور کے ایک معزز خاندان کے بانگے صاحب سے میں نے مولوی صاحب کی ملاقات کرادی تھی ان صاحب کے توسط مولوی صاحب کو بہت سی کتابیں ملیں۔“

رانچور کے زمانہ قیام ہی میں میں نے مولوی صاحب کے اشارے ہمت افزائی اور مذاق صحیح کی رہنمائی میں موسیورنیاں کی کتاب ”فلسفہ ابن رشد“ کے نام سے ترجمہ کی۔ ۱۹۲۷ء میں میری تبدیلی کلبرگہ تشریف ہو گئی۔ یہاں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو داز کے مزار اقدس پر مولوی صاحب قدیم اردو کتب کی تلاش میں تشریف لائے اور بعض نادر نسخے فراہم کیے۔ ان دو ایک مواقع پر میری موجودگی سے انہیں جو قدرے آسانی ملتی تھی، اسے انہوں نے بے وجہ ہمیشہ یاد رکھا۔ یہ بھی ان کی ایک وضع تھی۔“

نواب صاحب نے کچھ توقف کے بعد مولوی صاحب کی خوش مذاقی اور ظرافت کے ذیل میں ایک واقعہ بیان کیا۔ زمانہ وقوع یہاں بھی ان کے ذہن سے جاتا رہا تھا۔ اسے نواب صاحب نے اس طرح متعین کیا:

جس زمانے میں اورنگ آباد میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بڑے بھائی نواب رضا جنگ بہادر ڈپٹی کمشنر تھے۔ وزیراعظم فرانس موسیو کلیمینٹو تشریف لائے۔ مولوی صاحب راجہ درانی کے مقبرے کے قریب رہا کرتے تھے۔ موسیو، ایلورہ وغیرہ کے غار و پکنے آئے تھے۔ کئی روز رہے میں اس زمانے میں ”جالنے“ میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ ہم سب ایلورہ دیکھنے ایک

ساتھ گئے۔ کئی روز لطفِ مجلس رہا۔ موسیٰ کو مولوی صاحب سے بوجہ بہت دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب بھی موسیٰ سے بہت آزادی سے گفتگو کرنے لگے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب موسیٰ کو سیکرٹری۔۔۔ کے ساتھ رابعہ کے مقبرے پر ٹہل رہے تھے کہ سیکرٹری نے فرانسیسی میں مولوی صاحب سے کچھ دریافت کیا مولوی صاحب کچھ نہ سمجھے اور بظاہر لغو رسنا اور پھر کمال متانت سے انہوں نے خود سادہ زبان میں ”آواں بیواں شیوں شاں“ ایسے بے ربط کلمات میں جواب دینا شروع کر دیا۔ سیکرٹری کئی زبانوں سے واقف تھا لیکن یہ زبان اور ہی تھی کہ نہ کبھی پڑھی اور نہ سنی سمجھ گیا کہ اس میں ضرور گڑبڑ ہے۔ قہقہہ مار کر مولوی صاحب سے لپٹ گیا اور مولوی صاحب بدستور بنے رہے۔ چہرے پر ذرا بھی تو مسکراہٹ نہ آنے دی۔ فرانسیسی خود بڑے خوش طبع ہوتے ہیں۔ سیکرٹری مولوی صاحب کی اس ظرافت سے خوب مخطوط ہوا۔ مولوی صاحب طبعاً خوش مذاق تھے لیکن پاکستان آنے کے بعد مولوی صاحب کے مزاج میں شوخی اور زندہ دلی بہت کم ہو گئی تھی۔ میں ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد سے بوجہ آزر وہ خاطر ہو کر اپنے لٹکے کے پاس کراچی آ گیا تھا لیکن جلد ہی مولوی صاحب کے پاس اٹھ آیا اور ایک کمرہ لے کر مولوی صاحب کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ اس زمانے میں مجھ سے مولوی صاحب نے آکسفورڈ کٹری کے ترجمے کی نظر ثانی کا کام لیا۔ پھر کالج میں توسیع ہوئی اور انجمن کے دفاتر وغیرہ کے لئے گنجائش کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں از خود مولوی صاحب کے پاس سے چلا آیا لیکن مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر برابر ہوتا رہا۔

نواب صاحب نے ذرا رک کر پھر کہنا شروع کیا :

مولوی صاحب مستغنی طبیعت کے آدمی تھے حکومت نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن مدتوں انہیں اس کے اٹھانے میں تامل رہا وہ خود پریشان ہو لیتے۔ لیکن اپنی پریشانی کو کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ پاکستان میں ان پر ایک وہ وقت بھی آیا کہ ایک اعتبار سے ان پر کڑھی نگرانی ہونے لگی۔ ان کے ملنے جلنے والوں تک پر نظر رکھی جاتی۔ ایک صاحب

زلوے سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے۔ میں سب موالغات کے باوجود گاہ گاہ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ اس زمانے میں وہ قید تنہائی کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی ملنے والا پہنچ جاتا تو بہت مسرور ہوتے انہی دنوں کی بات ہے کہ ان کے وادنت میں تکلیف تھی اور وہ اسے نکلوانا چاہتے تھے۔ لیکن کوئی مددگار نہ تھا۔ مجھ سے ذکر لیا تو میں نے ہم راہ لے جا کر اپنے ایک عزیز سے جو نیول ہسپتال میں ڈسٹنٹل اسکیرٹ تھے ان کا وادنت نکلوا دیا۔ اس عرصے میں بھی وہ صاحبزادے ہمارے ساتھ رہے انھیں تنہا مولوی صاحب کا میرے ساتھ جانا بھی شاید خلاف احتیاط نظر آیا۔ کہ مبادا میں خلوت میں مولوی صاحب کو کوئی پٹی پڑھا دوں۔ وہ ناوان کیا جانے کہ اس قسم کی سیاست سے میں ہمیشہ غیر متعلق رہا۔“

نواب صاحب نے پھر ذرا رک کر سانس لے کر کہنا شروع کیا :

آخر وہ وقت بھی آپہنچا کہ مولوی صاحب مریض الموت میں مبتلا ہوئے۔ مجھے اس کی دیر سے اطلاع ملی۔ مزاج پرسی کے لیے میں جناح ہسپتال ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہ جاتی۔ پیر دانا چاہتا تو وہ کھنچ لیتے۔ خاموش بیٹھ کر چلا آتا۔ اس بیماری نے انھیں بہت چڑھا کر دیا تھا۔ اور ہم کج بخت ان کے دوستوں نے ان کا ذرا خیال نہ کیا۔ ذرا بھی زوا دار می کا ثبوت نہ دیا۔ وہ بے خیال تکبر کا اظہار کرتے۔ اس کے سہنے میں ہمیں تامل ہوتا اور اس طرح ان کے احباب ٹوٹتے گئے۔ الحمد للہ مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی کہ میں ان کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ اسی علالت کے دوران ایک روز ان کی یاد فرمائی پر حاضر ہوا تو فرمایا کہ ”علاج کے لیے سوٹزر لینڈ جانا چاہتا ہوں۔ صحیح یاد نہیں۔ غالباً پندرہ بیس ہزار روپے انھوں نے فرمایا کہ ”مجھے علاج کے لیے دیکار ہیں۔ اگر حکومت فرض حسنہ کا انتظام کر دے تو یہ رقم بعد میں میری حیدرآباد می پنشن سے وضع ہوتی رہے گی۔“ مولوی صاحب نے صدر مملکت کے نام اسی مضمون کا ایک خط مجھے دیا کہ میں اسے اپنے داماد فائنانس منسٹر محمد شعیب کے ذریعے صدر مملکت کو بھجوادوں۔ شعیب اتفاق سے ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے صدر ایوب کے نام مولوی صاحب کا خط ان کے حوالے کیا اور ان کے سامنے حیدرآباد کی مثالیں

دے کر اس امر پر زور دیا کہ ایسے بڑے آدمی کے معالجے کو تو خود حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ صدر مملکت سے پہلے ہی مولوی صاحب کے علاج کے لیے آمادہ ہو چکے تھے۔ شعیب کی ملاقات نے دو آتشے کلام کیا اور ازراہ معارف نوازی مولوی صاحب کو اپنے مہمان کے طور پر ملٹری کلب ہسپتال علاج کے لیے بلوایا۔

نواب صاحب نے جو کچھ کہنا تھا کہہ لیا اور اب میری باری تھی۔ میں نے ان سے چند سوالوں کی اجازت لی۔ تب میرے ایک استفسار کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

مولوی صاحب اپنے والد کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ بالکل پرانے وقتوں کی سی ادا تھی یعنی ان کے سامنے بالکل سمٹ کر مودب ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے والد علی حسن صاحب بہت مذہبی آدمی تھے۔ مجھے کئی بار ان کے نیاز کی عزت حاصل ہوئی۔ وہ حیدرآباد میں آتے تو میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کچھ میری مذہب پسندی کی وجہ سے وہ مجھ پر خصوصی شفقت فرمانے لگے تھے اکثر وہ مجھے نصیحتیں کا کرتے لیکن کسی خانگی بات کا انہوں نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ میں نے کبھی کچھ پوچھا۔ مولوی صاحب اپنے بڑے بھائی ضار الحق صاحب کا بھی بہت لحاظ اور احترام کیا کرتے تھے۔ میری بھی ان سے ملاقات تھی لیکن سرسری، بس ایک دو بار کی۔

میرے ایک اور سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا :

تجربہ پسندانہ زندگی کی نعمتوں یا متاہلانہ زندگی کی برکتوں کا بھی کوئی ذکر مولوی صاحب نے مجھ سے نہیں کیا۔ بلکہ کسی سے بھی نہیں کیا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی ہو گئی تھی۔ لڑکی والوں نے بعض پرانی رسموں کی انجام دہی پر اصرار کیا تو مولوی صاحب بدک گئے اور وہاں سے بلبلی بھاگ آئے۔ یہاں سے کچھ دنوں بعد حیدرآباد چلے گئے۔ بعد میں سنا طلاق ہو گیا تھا۔

نواب صاحب بات کہہ کر ذرا ٹھٹکے اور فرمایا :

یہ میں کوئی شہادت نہیں دے رہا۔ یہ سماعی بات ہے۔ میں نے جیسے سنا، آپ کو بتا دیا۔

اب صحیح صورت کیا تھی اللہ جانے!

میں نے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک سوال کیا تو نواب صاحب نے فرمایا :

”مولوی صاحب کو بے دین کہا جاتا ہے۔ ایسا نہیں تھا۔ مولانا شاہ عبدالوحید قادری مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ ”اس شخص کا ایمان بڑا پختہ ہے ایسا پختہ ایمان تو میں نے کم کسی کا دیکھا ہے“ مولوی صاحب بچپن میں بڑے نمازی تھے لیکن جب ذرا ہوش سنبھال کر انہوں نے مولویوں کے کردار اور افعال کو دیکھا تو وہ ”مولویت“ سے باغی ہو گئے۔ لیکن صحیح طور پر سچے مولویوں سے انہیں تب بھی انس رہا۔ نبی کریم صلعم سے انہیں بے حد محبت اور عقیدت تھی لیکن اس کا اظہار عام طور پر کسی کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب اولیاء اللہ سے بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے۔ بیجا پور میں اردو مخطوطوں کے لیے مارے مارے پھرنے پر جو ہاتھ لگے انہیں بغور پڑھا۔ تو اندازہ ہوا کہ یہ دین کا صحیح راستہ بتانے والے بزرگ تھے۔

اس بات نے مولوی صاحب کی طبیعت پر اثر کیا اور اولیائے کرام کی محبت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ بیدم شاہ وارثی سے بھی مولوی صاحب کی ملاقات تھی۔ وارثی صاحب اچھی نثر اور نظم لکھتے تھے۔ مولوی صاحب وارثی صاحب کی نظم کو بہت پسند کرتے۔ یہی امر ان دونوں میں تعلق کا باعث بن گیا تھا۔ مولوی صاحب سخت عقیدہ تھے۔

علمائے ظاہر سے انہیں بے عقیدگی تھی رسوم و روایات کو جنہیں اصل احکام مذہب سے زیادہ اہمیت دے لی گئی تھی۔ وہ ذرا خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یوں وہ بہت گہرے باطن کے شخص تھے۔ اپنے باطن کا انہوں نے کسی سے انکشاف نہیں کیا۔

معتقدات کے ذیل میں میرے ایک ضمنی سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا :

”یہ صحیح نہیں کہ مولوی صاحب وہابی العقیدہ تھے۔ وہ پچھے سٹی تھے۔ اہل تشیع حضرات

سے تعصب تو نہ تھا لیکن وہ انہیں بھٹکا ہوا ضرور سمجھتے تھے، اہل تشیع حضرات میں صرف

نواب سراج یار جنگ اور نواب عماد الملک سے ان کے تعلقات تھے اور یہ بھی صرف علمی مذاق

کی ہم آہنگی کی وجہ سے۔ خود یہ دونوں بزرگ متعصب نہیں تھے۔ نواب عماد الملک سے

تو مولوی صاحب خردانہ ملتے۔ اور ان کا بہت ادب کرتے تھے اس مرحلے پر بہت سچ بچا کر

میں نے نواب صاحب سے کچھ اس قسم کا سوال کیا کہ مولوی صاحب ایک عام شخص کے لیے

پیکرِ علم، غرضِ مہز میں بے باک لیکن کسی حد تک ضدی۔ اکھڑ اور تنگ مزاج تھے۔ کیا آپ نے انہیں پنج میں بھی ایسا ہی پایا اور نہیں تو کیا وہ دہری زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ نواب صاحب نے میرے اس سوال پر خاصی برہمی کا اظہار فرمایا۔

دہری زندگی سے آپ کی مراد منافقت ہے ناں؟ لاجول ولاقوة!

مولوی صاحب منافقت سے حد درجہ متنفر اور منقبض ہوتے۔ وہ اس لعنت سے بہت دور تھے۔ کوئی منافق ان کی مجلس میں بار تک نہیں پاسکتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ انہیں اس کا علم اور احساس ہو جائے۔ پھر وہ منافق کو ذرا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اثر پذیر ہونے تو اخلاق اور محبت سے اور اسی کی قدر کرتے اور اسے بہت سی باتوں پر افضل ٹھہراتے۔ میرے اور ان کے مابین تعلق کی بنیاد خلوص اور مودت ہی تھی۔ ورنہ ایک تو میری اور ان کی ملاقات کم رہتی۔ پھر میں شعبہ ماگزارمی کا ایک ملازم، ادب سے ربط ضبط واجبی ہی سا تھا بس! وہ خوب بڑے مخلص تھے۔ سچے اور صاف گو تھے اور حق کہنے میں بہت بے باک۔ وہ متاثر ہوتے تو کسی شخص کے اخلاص سے۔ حالی سے ان کی عقیدت کاراز یہی ہے۔ حالی سے ان کے ایسے مراسم تھے جیسے بیٹے کے باپ سے اور کسی مرشد کے اپنے پیر سے ہوں۔ میرے ایک اور سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا:

ضیاء الدین اور حافظ ولایت اللہ وغیرہ مولوی صاحب کے ہم جماعت تھے مولوی صاحب کے سیشن میں حافظ ولایت اللہ نے امتحان میں فرسٹ پوریشن حاصل کی تھی مولوی صاحب کے ایک اور ہم جماعت مولانا حمید الدین فراہی شبلی کے عزیز تھے۔ انہیں عربی زبان اور علم القرآن پر بے حد قدرت تھی۔ مولوی صاحب کے ان سے بہت مراسم تھے مولوی صاحب ان کی قدرت کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی صلاحیتوں کے بھی مولوی صاحب معترف تھے لیکن وہ انہیں پرگوناظم سمجھتے تھے۔ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی سے ان کے بے تکلفانہ اور گہرے مراسم تھے۔ سر اس مسعود سے تو انہیں بے حد محبت تھی یا اس مسعود ان کے بہت منہ چڑھے اور لاڈلے تھے۔ اس کا ایک واقعہ میں آپ کو سناؤں:-

مسعود حیدرآباد سے دلی یا علی گڑھ جا رہے تھے۔ مولوی صاحب انہیں الوداع کہنے

اسٹیشن پر آئے مسعود انھیں اپنے کپارٹمنٹ میں لے گئے۔ گاڑی نے وسیلہ دیا۔
 مولوی صاحب نے اترنا چاہا تو مسعود نے انھیں پکڑ لیا۔ اترنے نہ دیا۔ گاڑی چلی تو
 مسعود نے مولوی صاحب کو تنگ کرنا شروع کیا۔ اب ٹکٹ کلکٹر آیا اور آپ کو پکڑا۔
 بے ٹکٹ اور وہ بھی فرسٹ کلاس میں جوصلے تو دیکھئے۔ مختصر یہ کہ مسعود نے مولوی صاحب
 کو بہت بنایا۔ یہاں تک کہ انھیں اوپر برتھ پر جا لایا کہ نہیں تو کوئی آن دھر گیا پھر یہاں
 کوئی بڑا اسٹیشن آتا مسعود مچاتے کہ ”ایسا بے ٹکٹ کلکٹر اور مولوی صاحب واقعی دیک
 سے جاتے۔ یہاں تک کہ آخر ہی اسٹیشن آیا۔ نہ کسی نے پکڑا یا اور مولوی صاحب کو
 کو اسٹیشن سے صاف نکال لے گئے۔“

ایک اور سوال کے جواب میں نواب نے فرمایا۔

دوروں میں میرا ان کا ساتھ کم رہا۔ بیجا پورا اور جالندہ وغیرہ کے سفر میں ضرور ساتھ تھا اور میں
 نے محسوس کیا کہ سفر میں ان کے مزاج کا اعتدال جاتا نہیں تھا۔ ”سفر سوار تو نہیں ہوتا تھا؟
 سے غالباً آپ کا منشا یہی پوچھنا تھا۔“

میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہ آب و نمک کا کیسا ذوق رکھتے تھے نواب صاحب فرمایا :
 ”کھانا مولوی صاحب اچھا کھاتے اس معاملے میں ان کا اصول یہ تھا کہ کھانا کم ہو لیکن
 اچھا میسر نہیں ہوتا تو چٹنی روٹی سے پیٹ بھر لیتے کچھ شکوہ اور شکایت کسی سے
 نہ کرتے۔“

ایک دوسرے سوال کے جواب میں نواب صاحب نے ایسے کسی واقعہ سے لاعلمی کا اظہار فرمایا
 جس سے اہل علم کے مقابل صاحبان ثروت کی طرف مولوی صاحب کے جھکاؤ کا پتہ چلتا ہو۔
 میرے ایک اور سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا :

مولوی صاحب سے میرے مخلصانہ تعلقات ضرور تھے۔ لیکن رازہ و رازہ نہیں، اس
 لیے میں اس اوتھا کے ساتھ کوئی بات آپ کو نہیں بتا سکتا کہ صرف میں ہی اس سے
 واقف ہوں،“

کیا حالی مولوی صاحب کی کمزوری تھی؟ میرے اس استفسار کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا۔

حالی سے مولوی صاحب کو بڑی عقیدت تھی۔ معین صاحب اسے آپ کمزور ہی کہہ لیجئے
میں تو اسے پختگی کہوں گا۔ حالی کے خلاف وہ کوئی بات نہیں سن سکتے تھے۔ جو حالی سے
کبیدہ خاطر ہوتا، مولوی صاحب اس سے خوش نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چند
وہ شبلی کے کام کے قدردان تھے لیکن طبیعت ان سے ملتی نہیں تھی۔“

نواب صاحب آپ آخر حیات تک مولوی صاحب کی خدمت میں باریاب رہے کوئی ایسی تفصیل
آپ بتا سکیں گے جسے مولوی صاحب کی ”خواہش نامہ“ کا درجہ دیا جاسکے؟ نواب صاحب
نے جواباً فرمایا۔

مولوی صاحب بہت زندہ دل تھے۔ دل زندہ ہو تو خواہش کبھی مراٹھا نہیں کرتیں۔
بہر نوع میں اس ضمن میں کچھ تفصیل نہیں دے سکتا۔ ایک بات ہے آخری علالت کے
دنوں میں انہیں اپنے پھیلائے ہوئے منصوبوں اور کاموں کے ادھورارہ جانے کا غم کھائے
جاتا تھا۔ اس لیے بیماری سے جس نے خود ان کو بقول انہیں کام کرنے سے روک دیا تھا
پریشان تھے۔ کچھ ماخول کی ناسازگاری نے ان کی پریشانی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بہت
بھولے اور فیاض تھے دنیا کے مکر و فریب سے واقف نہیں تھے اپنی شرافت نفس اور ساوگی
کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے ایسا قیاس کر لیتے تھے اور ہر شخص کی بات پر اعتما و کر بیٹھتے یہی
ان کا بھولا پن تھا۔ خدا انکی مغفرت کرے! (قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء ص ۱۳۱-۱۳۹)



نواب معشوق یار جنگ کا انٹرویو (قومی زبان“ کے) اس نمبر (اگست ۱۹۶۴ء) کی
ایک خاص چیز ہے۔ معین الرحمن نے اس امر کی پوری کوشش کی ہے کہ نواب صاحب
سے مولوی صاحب کے بارے میں جو کچھ پوچھا جاسکتا ہے، پوچھ لیا جائے۔“

(مقالہ: ۶۴ء کے ادبی رسائل کا جائزہ، ماہنامہ چراغِ راہ، کراچی، مارچ ۱۹۶۵ء)

بابائے اردو اور پروفیسر محمود احمد خاں

[ولادت: ۱۸۹۳ء وفات: ۱۹۶۵ء]

[مکالمہ لاہور ۲۹-نومبر ۱۹۶۵ء]

پروفیسر محمود احمد خان، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دیرینہ ہمدموں میں سے ہیں۔ وہ ان معدودے چند خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں بابائے اردو نے تاحین حیات بہت عزیز رکھا۔ میں نے بابائے اردو کے رفیق کار جناب حکیم اسرار احمد کدیوہی کی زبانی پروفیسر محمود احمد خان کا اتنا، اور کچھ اس طرح، ذکر سنا تھا کہ شمار شوق کا اندازہ نہیں، بس اتنا معلوم ہے کہ ان سے ملنے کے لیے میرا دل سخت آرزو مند تھا۔ لاہور آئے ہوئے مجھے دو ماہ بہرہ چلے تھے۔ جہاں تہاں خان صاحب کی تلاش میں رہا، ٹیلیفون ڈائیکٹری میں خان صاحب کا پتا دیکھا۔ بعض احباب سے معلوم کیا۔ اسی فکر میں اک روز پروفیسر سید وقار عظیم سے بھی ذکر آیا۔ یہ کوئی قبولیت کی گھڑی تھی۔ فرمایا ”چاہیے تو آج ہی مل لیجئے۔ وہ سہ پہر کو لواریہ ٹریف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی کی ہفتہ وار میٹنگ میں آرہے ہیں۔ ساتھ چلئے گا۔ مل لیجئے گا تفصیلی ملاقات کے لیے وقت لے لیجئے گا۔“

پروفیسر محمود احمد خان ۱۸۹۳ء میں پنجاب کے ایک انتہائی علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ پروفیسر حمید احمد خان کے بڑے اور مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی کیا۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ کیمیا میں اسٹنٹ پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے اور بعد میں انہیں کے لفظوں میں اس منصب کا لقب ”ریڈر“ ہو گیا۔ اڑھائی برس تک جامعہ عثمانیہ کے رجسٹرار بھی رہے۔ ۱۹۲۸ء میں اس خدمت سے ریٹائر ہوئے تو پاکستان تشریف لے آئے۔ یہاں ”مجلس زبان و فترمی“ کی نظامت آپ کو تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے ارشاد پر ”انسائیکلو پیڈیا آف اسلام“ کے لیے

متعدد تحقیقی مقالات لکھے۔ نظر ثانی کی خدمت انجام دی "فرینکلن" کے لیے نظر ثانی اور ترجمے کا کام کیا۔ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمہ سے وابستہ ہیں۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔۔۔۔۔ ادارہ تالیف و ترجمہ کے دفتر ہی میں پروفیسر محمود احمد خان سے نیا حاصل ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد میٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ اس لیے بہت مختصر اور سرسری نشست رہی اور میں بابائے اردو کے بارے میں بہت کچھ جاننے۔ سننے اور پوچھنے کا شوق لیے اُن سے رخصت ہوا۔۔۔۔۔ بابائے اردو سے خان صاحب کے تعلقات اور مراسم کی داستان زمانی اعتبار سے نصف صدی پر محیط ہے۔ یہ داستان ابھی لکھی نہیں گئی۔ خان صاحب کا حافظہ غضب ناک حد تک قابل رشک ہے۔ ایک ایک پل کی تصویر ان کے ذہن پر نقش ہے۔ کاش وہ یہ داستان قلم بند فرمادیں اور یا محفوظ کر سکے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ بابائے اردو سے ابتدائی ملاقات کا کوئی نقش شاید آپ کے دل میں ہو۔ پروفیسر محمود احمد خان نے فرمایا۔

مولوی صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا اور میری عمر ہوگی کوئی پندرہ سولہ سال۔ مولوی صاحب والد مرحوم و مغفور سراج الدین احمد صاحب بانی و مدیر "زمیندار" کے انتقال پر تعزیت کے لیے ہمارے آبائی گاؤں کرم آباد تشریف لائے۔ یہ ہے پہلا نقش۔۔۔۔۔ پھر ۱۹۱۳ء میں ایک بار مولوی صاحب علی گڑھ تشریف لائے۔ میں وہاں تھروڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ مجھے اطلاع ملی تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن بس چند منٹ کے لیے مولوی صاحب کے پاس ٹھہرا۔

ان ملاقاتوں کی کچھ تفصیل۔۔۔۔۔ خان صاحب نے فرمایا :

"صرف ایک بات یاد ہے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی جب علی گڑھ میں مولوی صاحب کو دیکھا۔ پوچھا :

کس جماعت میں ہو؟" میں نے بتایا، کہا: شاباشس

اس ملاقات کی "تفصیل" یوں ایسا ایسی ختم ہوئی تو بات بڑھانے کے لیے میں نے عرض کیا

”مولوی صاحب کہیں ٹھہرے ہوں گے؟ - خان صاحب نے زچ ہوئے بغیر جواب دیا:
”جی ہاں۔ مولوی صاحب عبد الکریم فاروقی کے ہاں ٹھہرے۔ یہ علی گڑھ کے
کالجیٹ اسکول میں ٹیچر تھے اور کبھی حیدرآباد میں رہ چکے تھے۔ وہاں مولوی
صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ اب جو مولوی صاحب علی گڑھ آئے تو فاروقی
صاحب ہی کے ہاں قیام کیا۔“

مولوی صاحب سے آپ کی باقاعدہ ملاقات کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ - خان صاحب نے
جواباً ارشاد فرمایا:

”باقاعدہ ملاقات کے سلسلے کی عجب داستاں ہے۔ ۱۹۱۵ء میں میرا تقریر
مدرسہ فرقانیہ مشرقیہ (اورینٹل ہائی اسکول) اوزنگ آباد میں ہو گیا۔“
یہاں ضمناً میں یہ پوچھ بیٹھا کہ اس ادارے میں کیا خدمت آپ کے سپرد ہوئی تھی؟ - خان صاحب
نے مسکراتے ہوئے کچھ یوں فرمایا:

”آپ کو ٹھیک ترودو ہوا اس ادارے کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ مولوی اور منشی
کے درجنوں کی تعلیم بھی اُردو میں دی جاتی تھی۔ ایک خصوصیت اس کی یہ
تھی کہ منشی وغیرہ کے درجے میں بھی سائنس اور ریاضی کے مضامین لازمی تھے۔“
یہاں پہنچ کر خان صاحب نے خوشدلی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

”امید ہے اس وضاحت کے بعد اورینٹل اسکول میں ایک سائنس
گریجویٹ کے تقریر پر آپ کا ترودو جاتا رہا ہوگا۔“

میں نے موضوع کی طرف متوجہ کیا تا صاحب نے سلسلہ کلام ماقبل سے مربوط کرتے
ہوئے فرمایا:

”اس مدرسے میں میرا تقریر ہوا تو مولوی صاحب کا مستقر بھی اوزنگ آباد تھا۔
وہ مقبرہ رابعہ دورانی کے پاس ایک سرکاری کمرے میں چند کمرے زائد اپنی
ضرورت کے لیے بنا کر رہتے تھے۔ مجھے تقریر نامہ حیدرآباد ہی میں مل گیا تھا۔
اس کے مطابق میں اوزنگ آباد پہنچا۔ مولوی صاحب ان دنوں معتد تعلیمات

انسپیکٹر آف اسکولز آتھے اور دورے پر گئے ہوئے تھے۔ میں ان کی عدم موجودگی کے باوجود ان کے ہاں فرودکش ہو گیا۔ لیکن اس طرح کہ قبضہ کرتے ہی مکھ دیا کہ آگیا ہوں اور آپ ہی کے ہاں قیام ہے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ ”بہت خوشی ہوئی آپ آگئے ہیں، طینان سے رہتے۔“ لیکن مولوی صاحب کے ہاں ٹھہرے چند روز ہوئے ہوں گے کہ اتنے میں انکے مکان کا انتظام ہو گیا۔ میں وہاں اٹھ گیا۔ بعد میں مولوی صاحب دورے سے آئے تو ملاقات ہوئی اور ایسی ہوئی کہ پھر ہر ہفتے ان سے ایک بار ملاقات ضرور ہو جاتی۔ میں اورنگ آباد میں چار سال رہا اور اس پورے عرصے میں برابر مولوی صاحب سے نیاز حاصل کرتا رہا۔ ان کی عادات و خصائل کا میری زندگی پر بہت اثر ہوا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔“

میں نے اس کی تفصیل چاہی تو خان صاحب نے فرمایا:

یہ تو بے معنی بات ہے۔ اس کی تفصیل میں پڑنے سے کیا حاصل۔ یہ تو میرا اشتہار بن جائے گا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا پبلک کو آخر اس سے

کیا فائدہ ؟

جی نہیں۔ یہ غالباً اتنی اپنے اشتہار کی بات نہیں، جتنی مولوی صاحب کے اُفتاد مزاج کے اظہار کی بات ہوگی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ مولوی صاحب کے قدیم رنسیق نواب معشوق یار جنگ صاحب نے اثنائے گفتگو میں ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ مولوی صاحب نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ یہ ان کی ایک خاص ادا تھی وہ ذرا کسی میں استعداد دیکھتے تو اسے اپنے قریب آنے کا موقع دیتے اپنے ساتھ کام میں لگاتے اس طرح کہ اُس کی محض صلاحیتیں لوگ و بار لے آتیں۔۔۔۔۔ آپ مولوی صاحب سے بہت قریب رہے ہیں۔ یقیناً انہوں نے آپ کو چھوٹ نہیں دی ہوگی۔ مختلف کاموں میں لگایا اور اُبھایا ہوگا۔۔۔ خان صاحب نے فرمایا:

”میں اورنگ آباد میں چار سال رہا۔ اسی دوران میں دارالترجمہ بنا

اور یہ ان کی کوششوں سے بنا۔ وہ اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ مجھ سے انہوں نے شروع ہی میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ مثلاً اسکول کی سائنس کی کتاب ہمدی خان کوکب کی ترجمہ کی ہوئی نظر ثانی کے لیے مجھے دی۔ یہ ہمدی خان کوکب ایک اعلیٰ عہدیدار ایرانی تھاد تھے۔ ان کی کتاب ہوگی کوئی سو، ڈیڑھ سو صفحات کی۔ میں نے نظر ثانی کی۔

۱۹۱۸ء کی بات ہے مولوی صاحب نے حسین بلگرامی مرحوم کے پچاس برس پہلے کے لکھے ہوئے ایک مضمون کا ترجمہ کرنے کے لیے مجھ سے فرمایا۔ ترجمہ کیا بہت پسند فرمایا۔ یہ ترجمہ کئی سال بعد اردو کے پہلے پرچے میں چھپا اور میرے نام کے حوالے کے بغیر میرے پاس وہ ترجمہ اب بھی محفوظ ہے۔ اب جو پڑھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ میں نے اتنا اچھا ترجمہ کیا۔ مولانا وحید الدین سلیم اور مولانا ہاشمی فرید آبادی نے بھی کہ میرے علی گڑھ کے ساتھی تھے، اب مرحوم ہوئے، اس ترجمے کو پسند کیا تھا۔

آپ نے فرمایا: کہ آپ اورنگ آباد میں چار سال رہے۔ آیا اس کے بعد آپ وہاں سے چلے آئے؟

”جی ہاں، دراصل اسی زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک جگہ نکلی میں نے اس کے لیے ایٹالی کیا اور اپنے اس ترجمے کا حوالہ بھی دیا جس کا ابھی آپ سے ذکر کیا اور سچی بات ہے کہ تقریر میں اُس سے مدد ملی اس لیے کہ میں نے سنا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جو انتخابی کمیٹی کے رکن تھے اس ترجمے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کہا کہ جس کا یہ ترجمہ ہے، ہمیں اُس سے مدد ملے گی۔“ میں اس جگہ پر لے لیا گیا اور حیدر آباد چلا آیا۔ دیکھیے تو بالواسطہ اس تقریر میں بھی مولوی صاحب کا تصرف شامل حال تھا....“

کیا مولوی صاحب بھی کم و بیش اسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ سے وابستہ نہیں ہو گئے تھے؟..... جو ابا پرود فیسیر محمود احمد خان صاحب گویا ہوئے؛

”جی اسی زمانے میں مولانا وحید الدین سلیم کے بعد مولوی صاحب کئی برس جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ اُردو کے منصب پر فائز رہے۔ حیدرآباد کی ملازمت کے سلسلے میں انہیں ۶۰۰ روپے پنشن ملتی تھی۔ پروفیسری کے کُل ۱۰۰۷ روپے۔ یہ خلافِ قاعدہ تھا، لیکن سر حیدری مولوی صاحب کے بہت قدر دان تھے۔ اُن کے ایہار سے مولوی صاحب کو یہ مشاہرہ ملتا رہا....“

حیدرآباد میں بھی مولوی صاحب کے علمی مشاغل کا وہی عالم رہا۔ اس زمانے میں بھی آیا آپ کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا؟..... خان صاحب نے فرمایا: مولوی صاحب کام کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں بھی وہ کام کرتے رہے۔ ایک علمی رسالہ ”سائنس“ نکالا اس رسالہ میں ہم سے کام لیا۔ میجر آفتاب اس رسالے کی مجلسِ ادارت میں تھے....“

اس لمحے میں نے میجر آفتاب صاحب سے مولوی صاحب کی کشاکش کا ذکر کیا تو خراج نے بلا تامل فرمایا کہ:

”آفتاب صاحب مولوی صاحب کے بڑے دوست تھے۔ پاکستان اگر اُن سے اخیر میں معلوم نہیں کیوں اختلاف پیدا ہو گیا.... میں نے مولوی صاحب کا لکھا ہوا ”المیہ“ دیکھا یہ مجھے پسند نہیں آیا میں مولوی صاحب کا بہت مداح ہوں۔ ان کی بے حد تعظیم کرتا ہوں لیکن بائیں ہمہ میری رائے یہی ہے کہ وہ ”المیہ“ انہیں نہ لکھنا چاہیے تھا۔ ان کی شان اس طرح کے کاموں سے بہت ارفع و اعلیٰ تھی“

میں نے اس قہقہے کو ہمیں چھوڑا اور خان صاحب سے پوچھا کہ رسالہ ”سائنس“ میں آپ نے مولوی صاحب سے کس طرح کا کام لیا؟..... خان صاحب نے ذرا کی ذرا توقف

کیا اور پھریوں گویا ہوئے:

”رسالہ سائنس“ میں مستقل عنوانات قائم کیے گئے تھے اور یہ عنوانات بعض اشخاص کے سپرد تھے۔ یہ اصحاب اپنے اپنے عنوانات کے تحت رسالے میں لکھا کرتے۔ دو عنوان ”دلچسپ معلومات“ اور سائنس کی دنیا“ میرے سپرد تھے۔ میں انہیں دیکھتا اور ان کے تحت لکھتا بعض اچھے مضامین کا ترجمہ بھی مولوی صاحب نے کرایا لیکن یہ سب کام اعزازی تھا اور صرف مولوی صاحب کی وجہ سے ہم خوشی خوشی اس میں لگے رہتے۔“

اس رسالے کے علاوہ کسی اور علمی منصوبے میں مولوی صاحب کے شریک رہوں تو اس کی تفصیل...؟ خان صاحب نے فرمایا:

”تفصیل تو کیا۔ ویسے جامعہ عثمانیہ کے دوران قیام میں ایک اور اہم کام، اصطلاحات کی نظر ثانی کا ہوا۔ فزکس اور کیمسٹری کی اصطلاحات جو وہاں وضع ہوئیں اور یکجا کی گئیں، ایک کمیٹی اس پر نظر ثانی کرتی۔ اس کمیٹی میں چند آدمی تھے۔ مجھے بھی مولوی صاحب نے اس میں رکھا۔“

وضع اصطلاحات کی میننگ شروع ہونے والی تھی۔ اس کے دوسرے ارکان آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجبوراً مجھے گفتگو کو سمیٹنا پڑا اورنگ آباد کے روز و شب کے بارے میں بتاؤ گے جواب میں خان صاحب نے فرمایا:

”اورنگ آباد میں جب مولوی صاحب تھے۔ انجمن کے کام میں زیادہ تقویت پیدا کی۔ دفتر بنایا۔ باقاعدہ کام کیا۔ کام بڑھا تو اسسٹنٹ رکھا۔ اورنگ آباد میں پہلے اسسٹنٹ سیکرٹری سید سجاد ہوئے اور سالہا سال تک کام سنبھالے رہے۔ دفتر کا کام سید غلام ربانی بھی کرتے رہے جو خود بھی اچھی اُردو لکھتے تھے۔ سید سجاد بعد میں جامعہ عثمانیہ میں اُردو لیکچرار ہو کر چلے گئے۔ لندن سے ڈاکٹریٹ بھی کیا اور جامعہ میں ریڈر ہو گئے ان کے بعد مولوی صاحب نے عبد الحلیم شرر کے لڑکے صدیق کو کھنوسے

بلايا۔ یہ پریس کا کام کرتے تھے۔ ”اُردو“ اور ”سائنس“ ان کے اہتمام میں چھپتے۔“

میرے ایک سوال کے جواب میں خان صاحب نے فرمایا:
 ”مولوی صاحب بہت فیاض تھے۔ طلبہ کے ساتھ بہت سلوک کرتے تھے۔ ایک ہندو طالب علم کو جس میں گانے کے جوہر تھے وظیفہ دے کر موسیقی سکھانے کے لیے پونا بھیجا۔ اچھے ذہین طلبہ سے تو وہ بہت محبت کرتے تھے۔ جب مولوی صاحب حیدرآباد آگئے تھے، اختر حسین رائے پوری ایک سال مولوی صاحب کے پاس رہے۔ عزیز احمد بھی مولوی صاحب کے پاس رہے۔ یہ اصحاب، مولوی صاحب کے فیضِ تربیت کے رہنِ منشا ہیں۔“

میرے ایک دوسرے سوال کے جواب میں خان صاحب نے قدرے سختی سے فرمایا کہ:
 ”میں شادی کے بارے میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ شادی کے بارے میں مجھے پتا ہے لیکن جسے مولوی صاحب نے راز رکھنا پسند فرمایا، مجھ سے اُس سلسلے میں کچھ نہ ٹوٹے۔ لیے، اسے (ROMANCE) ہی رہنے دیجئے۔“

اس موضوع پر میرا کوئی استدلال مسموع، گزارش کا کوئی انداز قبول اور کوشش کا کوئی طریق نتیجہ خیز نہ ہوا تو خان صاحب نے فرمایا کہ ایک لطیفہ سن لیجئے اور اس قصے کو چھوڑیے:

”میری شادی ہونے سے ایک دو برس پہلے کی بات ہے ایک اینگلو انڈین لڑکی مولوی صاحب کو ملی۔ مولوی صاحب اُس سے متاثر ہوئے اور ایک روز ترنگ میں آکر کہا کہ ”اس کی شادی کراؤ“ احباب نے نام تجویز کرنا شروع کر دیئے۔ مولوی صاحب نے ہاشمی فرید آبادی سے کہا کہ ”اور سب کو چھوڑ دو بھئی، محمود سے کراؤ“ اس پر بڑی چہل

رہی اور مولوی صاحب اُطفًا مدثوں اس واقعے کا ذکر کرتے رہے۔
چلتے چلتے میں نے مراسلت کے بارے میں بھی سوال کر لیا۔ خان صاحب نے
بتایا کہ :

”کبھی کبھی مولوی صاحب مجھے خط لکھا کرتے تھے لیکن ۱۹۴۹ء میں
حیدرآباد سے پاکستان آیا تو کچھ سا تھ نہیں لاسکا۔ بہت سے کاغذات
تلف کرنے پڑے۔ اس طرح مولوی صاحب کے سب خط ضائع ہو گئے
اور اب میرے پاس ان کا کوئی خط محفوظ اور موجود نہیں۔“

اُٹھتے اُٹھتے خان صاحب نے فرمایا :

”مولوی صاحب عمر میں مجھ سے ۲۱، ۲۲ سال بڑے تھے۔ میں اُن کا
بہت ادب کرتا تھا۔ اُن کی زندگی بالکل علمی تھی۔ سیاسی گفتگو بھی کرتے
تھے۔ اظہارِ رائے میں بہت جری اور بے باک تھے۔ (He used
to speak without mental reservation)

خدا اُن کی مغفرت کرے۔“

پروفیسر محمود احمد خاں سے یہ ملاقات جیسا کہ ابتدا میں کہیں لکھ چکا ہوں نومبر ۱۹۴۵ء
میں ہوئی لیکن اس کی رُو د ادا کرنے کی توفیق آٹھ نومبر ۱۹۴۶ء میں ہوئی یہاں ایک
بات اور عرض کر دینا شاید بے محل نہ ہو۔۔۔ اصحابِ انجمن کا اصرار تھا کہ خان صاحب کی
تصویر بھی بھیجی جائے۔ ادارہ تالیف و ترجمہ کی میٹنگ ۱۹ جولائی ۱۹۴۶ء ساڑھے چار بجے
سہ پہر کو ہو رہی تھی۔ خان صاحب عادتاً پندرہ بیس منٹ پہلے تشریف لے آتے ہیں میں
نے اس موقع گو کافی خیال کرتے ہوئے اپنے ایک کرم فرما جناب اسلم عامر کو جو مفصلات
میں رہتے ہیں اور فنِ تصویر کشی میں ورک رکھتے ہیں خصوصیت سے اس خدمت کے لئے لاہور
آنے کی زحمت دی لیکن یہ سب اہتمام و انصرام خان صاحب کی اس وضع کی نذر ہو گیا میں اپنا
اشتہار دینا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ کہ ”میری تصویر رسالے میں چھاپنے کی آخر تک کیا ہے۔“

(قومی زبان، کراچی، بابائے اردو نمبر، اگست ۱۹۴۶ء، ص ۲۵۲-۲۵۸)

بابائے اردو اور پروفیسر حمید احمد خاں

[ولادت: لاہور، یکم نومبر ۱۹۰۳ء]

[وفات: لاہور، ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء]

[مکالمہ لاہور جون ۱۹۶۵ء]

انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی کی جانب سے بابائے اُردو کی ذات گرامی سے متعلق پروفیسر حمید احمد خاں صاحب سے گفتگو کرنے کے لئے، میں بہاول نگر سے لاہور پہنچا تھا۔ یہ ۱۴ جون ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں صبح سے کوشاں تھا کہ ملاقات کے لئے وقت لیا جاسکے۔ کئی بار اقامت گاہ اور یونیورسٹی میں ٹیلی فون پر رابطے کی ناکام کوشش کر کے مضمحل ہو چکا تھا کہ کہیں پانچ بجے کے قریب حمید احمد خاں صاحب سے بات ہو سکی اور جس محبت، اپنائیت اور شفقت سے انہوں نے گفتگو فرمائی اس نے مجھے نئے سرے سے تازہ کار کر دیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں تعلیم اور تعلم سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ ان کی ساری عمر درس و تدریس میں گزری ہے۔ ان کا شمار ملک کے انے گئے ماہرینِ تعلیم میں ہوتا ہے۔ پچھلے چھتیس سال سے وہ مختلف ادبی و فکری اور تعلیمی و تاریخی موضوعات پر فکر انگیز اور پر مغز مقالات و مضامین لکھ رہے ہیں۔ وہ خوب گھومے پھرے بھی ہیں انہوں نے دُنیا دیکھی ہے۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک وہ ہمہ جہتی مقاصد سے برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، ترکی، یونان، امریکہ، ملائیا اور انڈونیشیا وغیرہ کی سیاحت کر چکے ہیں۔ خدا کی طرف سے انہیں فکر و روشن عطا ہوئی ہے۔ سیاحت نے اس پر برش کا کام کیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۴ء میں جب وہ اسلامیہ کالج، لاہور میں شعبہ انگریزی کے صدر تھے، کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کیا۔ دس سال شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور صدر رہنے کے

بعد ۱۹۵۸ء میں وہ اسلامیہ کالج، لاہور ہی کے پرنسپل ہو گئے اور اب اگست ۱۹۶۳ء سے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خان اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں انہوں نے امریکن فرینڈز سرورس انٹرنیشنل سینار کا افتتاح کیا۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں وہ ایشین امریکن اسمبلی منعقدہ کوالالمپور میں شریک ہوئے اور گروپ چیئرمین کی باوقار خدمت انجام دی۔ جون ۱۹۶۳ء اور پھر اس سال مارچ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایفرو ایشیائی اسلامی کانفرنسوں میں پاکستانی وفد کے قائد کے طور پر شرکت کی اور بڑی سرگرمی دکھائی۔ ان کی بھر جہت علمی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں ”ستارہ امتیاز“ کا اعزاز عطا کیا گیا۔

پروفیسر حمید احمد خان بڑی دل نواز شخصیت کے مالک ہیں۔ طبعاً وہ بزرگوں کی اُس نسل کی باقیات میں سے ہیں جو وضع نبھانا اور تہذیبی اقدار کو برتنا جزو ایمان جانتی ہے۔ برائیں ہمہ وہ مدت، اختراع اور اپج کے دشمن نہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کے ورثہ دار ہیں لیکن جدید علوم و افکار اور ان کے فضائل سے مجتنب نہیں۔ وہ بے حد شائستہ اور شستہ ہیں اور اچھی سچی اور کام کی بات کو قبول کرنے اور پھر اسے چلن دینے میں بڑے جری ہیں۔ آرٹس اور سائنس کے مسابین میں اردو کو اعلیٰ مدارج تک ذریعہ تعلیم کے بطور اختیار کرنے کی تحریک اور پنجاب یونیورسٹی میں عملاً اس کا نفاذ، ان کا یادگار اور سدا بہار کارنامہ ہے۔ وہ انگریزی کے استاد ہیں اور اردو کے سچے عاشق ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے انہیں بے انتہا ارادت ہے۔ وہ ایک اعتبار سے بابائے اردو ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور ان طالع دروں میں ہیں جنہیں بابائے اردو کی رفاقت کار کا موقع تو بے شک نہ ملا لیکن ان کی چشم نگران ضرور میسر آئی۔

میں لاہور میں جنہیں نہیں تھا لیکن راہوں اور شاہراہوں سے کچھ ایسا واقف بھی نہ تھا۔ آٹھ بجے مجھے یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ مغل پورہ سے (جہاں میرا قیام تھا) میں سات بجے

ہی چل دیا سینٹ ہال پہنچا تو آٹھ بج چاہتے تھے۔ حمید احمد خاں صاحب کام میں منہمک تھے مگر بڑے تپاک سے ملے، فرمایا:

”میں بچپن سے مولوی عبدالحق صاحب کے نام اور کام سے واقف ہوں مجھے ان کے رفیق کار ہونے کی سعادت تو نصیب نہیں ہوئی تاہم میرا شمار قوم کے ان بے شمار افراد میں کیا جاسکتا ہے جنہیں بابائے اردو کے جذبہٴ ایثار و جہاد سے بے انتہا عقیدت تھی۔ مجھ پر ان کی شفقت ہمیشہ رہی اور نیاز مندی کا ربط اور رشتہ آخر دم تک قائم رہا۔“

آپ مولوی صاحب کے رفیق کار نہ رہے ہوں اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ میں مولوی صاحب سے متعلق کسی خاص بات کی کرید میں آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ مولوی صاحب سے آپ کے لحاظ اور نیاز کے رشتے کی داستان سننے کا چکا مجھے کشاکش آپ کی خدمت میں لایا ہے۔ آپ کا حافظہ شاید ساتھ دے مولوی صاحب کا نام آپ نے پہلی بار کب سنا۔“

حمید احمد خاں صاحب مسکرائے، لیکن مسکراتا بقول شخصے کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہارِ طلاقت لسانی پر، لیکن میں بھی جبار رہا۔
”آپ بچپن سے مولوی صاحب کے نام سے واقف رہے ہیں۔ کوئی ایسا نقش کہ پہلا نقش کہہ سکیں جسے، آپ کے ذہن میں ضرور ہوگا۔“ حمید احمد خاں صاحب کچھ دیر یادوں کا تعاقب کرنے کے بعد کچھ یوں گویا ہوئے:

”میرے علاقے برادر بزرگ مولانا ظفر علی خاں اور بابائے اردو نے علی گڑھ میں سید احمد خاں مرحوم کے زیر سایہ ایک ہی زمانے میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن میں بھی دونوں کسی نہ کسی حیثیت سے باہم وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں جب والد مرحوم و منقرض سراج الدین احمد خاں بانی دہلی ”زمیندار“ کا انتقال ہوا تو مولانا ظفر علی خاں، حیدرآباد سے خارج البلد ہو کر واپس وطن پہنچ چکے تھے۔ میں اُس وقت چھ برس کا بچہ تھا لیکن

مجھے اطلاع ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اُس زمانے میں والد مرحوم کی وفات پر تعزیت کے لیے ہمارے گاؤں کرم آباد تشریف لائے تھے۔
 بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ سلیکشن بورڈ کے ارکان یا شاید تاریخ ادب اُردو پر مامور اصحاب نے آنا شروع کر دیا۔ غالباً کوئی میننگ تھی۔ حمید احمد خاں صاحب نے معذرتاً مجھ سے فرمایا:

”اس ہنگامے میں کچھ نہ ہو سکے گا۔ آپ دوسرے کمرے میں تشریف رکھیے۔ میننگ سے فرصت ملے تو اطمینان کے ساتھ آپ سے باتیں ہوں گی۔“
 اور ساتھ ہی انہوں نے اپنے سکریٹری اصغر احمد نثار صاحب کو کچھ اس طرح کی ہدایت کی کہ مجھے بٹھایا جائے۔ کچھ کھلایا پلایا جائے۔
 وائس چانسلر روم میں میننگ کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران میں نثار صاحب مختلف النوع کاموں میں اُلجھے رہنے کے باوجود میری دل داری سے غافل نہیں ہوئے۔ میننگ کے بعد حمید احمد خاں صاحب نے یاد فرمایا، تعظیم دے کر بٹھایا، شرمسار کیا، اور اس پر بے حد افسوس کا اظہار فرمایا کہ مجھے کافی انتظار کرنا پڑا۔ خاصی دیر بیکار بیٹھے رہنا پڑا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں کہ بابائے اُردو سے پہلی ملاقات کیونکر ہوئی۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا:

”اپنے ہوش میں اُن کو پہلی بار دیکھنے کا شرف غالباً ۱۹۲۳ء کے اواخر میں حاصل ہوا۔ میں اُن دنوں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ایف اے کا طالب علم تھا اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک شام بابائے اُردو بھائی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنا نام ظاہر نہ فرمایا مگر میں نے قافیے سے سمجھ لیا کہ مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔ دراصل ہوا یوں کہ انہوں نے آتے ہی کہا ”کیوں بھئی محمود کہاں ہیں، اور یہ تم اس وقت گھر کے اندر کیوں بیٹھے ہو؟“ میں نے کتاب کا کپڑا، یہ شام کا وقت تھا اور مولوی صاحب سیر کے علاوہ۔ ذرا

کی ذرا میں ان نووارد بزرگ کی باز پرس پر گھبرایا لیکن معاً اندازہ ہو گیا
کہ ”اد ہوا یہ تو مولوی صاحب ہیں“

یہ تھا مولوی صاحب سے میرا پہلا سامنا!

میرے ایک اچھے ہوئے سوال کے جواب میں کہ بعد کی ملاقاتوں میں کوئی بات چسپے
راز کہہ سکیں، یعنی کوئی واقعہ یا کسی واقعے کا عقب یا وہ مخصوص حالات جس کے تحت
انہوں نے کوئی فیصلہ کیا ہو اور آپ اُس میں شریک یا اُس سے واقف رہے ہوں اور
یا بعض اشخاص اور اداروں وغیرہ کے بارے میں آپ کے سامنے کبھی اظہار خیال
کیا ہو تو اُس کی تفصیل؛ حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا:

”۱۹۳۶ء میں جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کا لیکچرار تھا
مولوی صاحب سرسکندر حیات کی حکومت سے اُردو زبان کے بارے
میں گفت و شنید کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ اُن کے قیام لاہور
کے درمیان میں اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے یاد ہے کہ سر
سکندر حیات کے نوجوان پارلیمنٹری سکرٹری نواب مشتاق احمد گورمانی سے
اُردو کی سرکاری حیثیت کے بارے میں مولوی صاحب کی ایک لمبی گفتگو
ہوئی اور میں بھی اس گفتگو کے دوران میں موجود تھا“

حمید احمد خاں صاحب نے قدرے توقف سے فرمایا اور پھر کچھ یوں گویا ہوئے:
”ایک واقعہ مجھے اور یاد آتا ہے غالباً ۱۹۳۶ء ہی کا ذکر ہے مولوی صاحب
انجمن ترقی اُردو کو حیدرآباد سے منتقل کرنے کا خیال کر رہے تھے، شاید
اسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو میں نے گزارش کی کہ انجمن کو لاہور
لے آئیے۔ مولوی صاحب کو اس میں تاثر تھا اور جب ایک محفل میں
میرے دوست ڈاکٹر تاثیر مرحوم، مولوی صاحب سے کبھی قدر و قدر
سے پیش آئے تو مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اسی وجہ سے لاہور
آنے کا فیصلہ کرنے میں متاثر ہوں۔ میں نے بعض دوسرے صاحبوں کی

طرف اشارہ کیا جو اس محفل میں موجود تھے کہ انہوں نے اس بحث میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مولوی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ لائی کرگس کے قانون کے مطابق ان لوگوں کے لیے تازیانے کی سزا ہے جو ایسے وقت سکوت اختیار کریں جب سچی بات کہنے کا موقع ہو۔

میرے ایک سوال کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا:

”اس کے بعد مولوی صاحب سے کب کب اور کہاں کہاں ملاقات کے مواقع ملے اس کے بیان میں حائقہ ساتھ نہیں دیتا۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک میرا قیام دہلی میں رہا اور اس دوران میں مولوی صاحب اور سید ہاشمی فرید آبادی صاحب دونوں انجمن کے دفتر کی دریا گج والی عمارت میں مقیم تھے۔ یہاں بارہا مولوی صاحب کی خدمت میں باریابی ہوتی رہی۔ جو بات خاص طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب تقریباً ہر ملاقات کو کھانا کھانے یا چائے پلانے کا موقع ضرور بنا لیتے تھے۔“

میرے ایک سوال کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے ارشاد فرمایا:

”جلسوں وغیرہ میں مجھے مولوی صاحب کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا ہے بلکہ اینگلو عربک کالج کے ایک جلسے میں مولوی صاحب کی زیرِ مہداری میں نے ایک ادبی مقالہ بھی پڑھا اور مولوی صاحب نے اسے رسالہ ”اُردو“ میں چھاپنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ افسوس ہے کہ میں ان دنوں اس مقالے کو اشاعت کے قابل بنانے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ وہ جلسے میں حتی الوسع وقت پر پہنچنے کی کوشش فرماتے اور جلسے کی غایت اور نوعیت کا پورا پورا خیال رکھتے۔“

بابائے اُردو سے اپنی ملاقاتوں کے ضمن میں حمید احمد خاں صاحب نے ایک تقریب کا کچھ یوں ذکر فرمایا:

”دسمبر ۱۹۵۸ء جنوری ۱۹۵۹ء میں میں نے مولوی صاحب سے یہ

درخواست کی کہ وہ اُردو کانفرنس کے ایک اجلاس کی بھارت کے لئے، جس کا اہتمام ہم لاہور میں کر رہے ہیں، لاہور تشریف لائیں۔ بالآخر فروری میں یہ کانفرنس ہوئی اور مولوی صاحب تشریف لائے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب ایک تقریب میں مہمانِ خصوصی کے طور پر اسلامیہ کالج لاہور میں بھی تشریف لائے جہاں میں نے ”بزمِ فروغِ اُردو“ کی طرف سے مولوی صاحب کی خدمت میں ایک سپا سنامہ پیش کیا۔ اس کے متعلق تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی روداد رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ صرف یہ کہنا مناسب ہے کہ مولوی صاحب پر اس تقریب کے دوران میں وقت طاری ہو گئی اور سپاسنامے کے جواب میں انہوں نے جو تقریر کی اُس کا آغاز، اُن کی طرف سے ایسی گلوگیر آواز میں ہوا کہ حاضرین میں سے کوئی

مجھے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔“

۱۹۵۹ء کے بعد چند برس مولوی صاحب زیادہ تر کراچی ہی میں رہے۔ آپ سے مراسلت ہوئی ہو شاید؟ اور کراچی میں بھی کیا آپ میں بھی کیا آپ کی ان سے کوئی ملاقات ہوئی؟ حمید احمد خاں صاحب نے جواب میں فرمایا:

”جی ہاں! آخری چند برس مولوی صاحب زیادہ تر کراچی میں رہے اور کبھی کبھی بذریعہ خط کسی خدمت کی تکمیل کے لئے یاد فرماتے رہے۔ جب میں کراچی جاتا تو انجمن کے دفتر میں مولوی صاحب کی ملاقات کو حاضر ہوتا۔ کراچی کی آخری ملاقات کی یہ کیفیت یاد ہے کہ مولوی صاحب نے کافی منگوائی اور ایک بڑے غیر معمولی گھیر کا بسکٹ کھلایا، خود بھی کھلایا۔ اس موقع پر منٹا میں نے دریافت کیا کہ اس دوران میں وہ کس نوع کی خدمات کی تکمیل کے لئے ارشاد فرماتے رہے؟ حمید احمد خاں صاحب مسکراتے ہوئے گویا ہوئے:

”یہ بڑی عام سی باتیں ہوتی تھیں، مثلاً: کسی صاحب کا تبادلہ کراچی سے لاہور ہوا تو وہ مولوی صاحب سے ایک تعارفی رقعہ لے کر میرے

پاس آئے۔ یا کسی صاحب نے لاہور سے مولوی صاحب کو لکھا کہ فلاں مقصد کے لئے پیغام بھیجئے یا فلاں مقصد کے لئے مجھے مالی امداد دیکھئے تو مولوی صاحب کا خط میرے نام آگیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ بتائیے پیغام بھیجوں یا نہ بھیجوں، مالی امداد دوں یا نہ دوں؟“

میں نے حمید احمد خاں صاحب سے آخری ملاقات کی تفصیل جانا چاہی تو وہ پٹنہ سے ہو گئے اور بہ کوشش سنبھلے ہوئے لمحے میں فرمانے لگے:

”مُعین صاحب! مولوی صاحب کے ساتھ میری آخری دو ملاقاتوں کی یاد دردناک ہے۔ یہ دونوں ملاقاتیں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ریل کے ڈبے میں ہوئیں۔“

حکیم اسرار احمد صاحب نے مجھے خط لکھا کہ مولوی صاحب صدر ایوب خان کی دعوت پر معاہدے کے لئے جاتے ہوئے فلاں وقت لاہور سے گزریں گے۔ اس ملاقات میں میرے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب اور حامد علی خاں صاحب دونوں شریک تھے۔ مولوی صاحب کی حالت غیر اطمینان بخش نہیں تھی۔ لیٹے لیٹے بھی وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی گفتگو میں شگفتگی اور بذلہ سنجی کا ثبوت دیتے رہے۔ مثلاً گوہ مری کے متعلق فرمایا کہ مقام بے صحت افزا اور نام پوچھیے تو جواب ملتا ہے کہ ”مری“ اس کے بعد مولوی صاحب کی ژین روانہ ہوئی تو ہم سب دل میں یہ اُمید لئے ہوئے واپس آئے کہ مولوی صاحب کا سرکاری اہتمام سے ہسپتال میں رہنا ضرور کوئی بہتر صورت پیدا کرے گا، لیکن ۛ

اے بسا آرزو کہ ناک شدہ!

حکیم اسرار احمد صاحب کے خطوں سے مولوی صاحب کی صحت کے متعلق بدخبر تشویشناک خبریں آتی رہیں تاکہ یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب علاج سے مایوس ہو کر واپس کراچی جا رہے ہیں۔“

حمید احمد خاں صاحب خاموش ہو گئے وہ بہت نمٹکے نمٹکے بچھے بچھے سے دکھائی دے رہے تھے۔ خود میری طبیعت بھی اس احساس سے کہ میں ان کے اضمحلال کا موجب ہوں، بوجھل ہو گئی۔ میں کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے ان کی آواز سنائی دی جیسے وہ کہیں بہت دور سے بول رہے ہوں، لرزاں لرزاں مدھم مدھم!

”مولوی صاحب سے آخری ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن پر پھر اسی طرح رہی کے ڈبے میں ہوئی۔ اب مولوی صاحب کی حالت دگرگوں تھی۔ بے سند نحیف ہو چکے تھے حکیم اسرار احمد صاحب مجھے پلیٹ فارم پر الگ لے گئے اور اشکبار آنکھوں سے کہنے لگے کہ اب مولوی صاحب کی زندگی کی امید باقی نہیں رہی حکیم صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب کبھی کبھی فرماتے ہیں ”کسی پہلو چین نہیں آتا“ جب میں مولوی صاحب سے ملا تو انہوں نے بہت نحیف آواز میں حکیم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

”ان کو بتا دیا؟“

اس سے زیادہ مولوی صاحب کچھ نہ کہہ سکے۔ اور حکیم صاحب نے تسلی دی کہ میں نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا ہے۔“

حمید احمد خاں صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

”اس اشارے سے مراد یہ تھی کہ مولوی صاحب نے انجمن ترقی اُردو کی رکنیت سے متعلق اپنی چند خواہشات کا اظہار فرمایا تھا اور یہ چاہا تھا کہ مولانا سلاح الدین احمد، کہ وہ بھی اب مرحوم ہیں اور میں انجمن کے ارکان میں شامل ہوں۔“

میں نے بدتمیزی سے ایک سوال اور کر ڈالا کہ آپ نے مولوی صاحب کے انتقال کی خبر کس طرح سنی؟ حمید احمد خاں صاحب نے اس بے نیکی کے سوال کے جواب میں بڑے تمہل سے فرمایا:

” لاہور ریلوے اسٹیشن پر جب مولوی صاحب کو خدا حافظ کہا تو دل میں یہ یقین تھا کہ اب اس عالم اسباب میں پھر ملاقات نہ ہوگی۔ میری اپنی صحت بھی اُن دنوں اچھی نہ تھی اور لاہور میں گرمی کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ میں خود دوسرے تیسرے دن چند روز کے لئے مری چلا گیا۔ مجھے مری پہنچے دوسرا ہی دن تھا کہ میں شام کو گھومنے کے لئے نکلا اور ایک بنگلے میں سے شام کی ریڈیو کی خبریں سٹرک پر سنائی دیں۔ اس طرح مولوی صاحب کی وفات کی اطلاع ہوئی۔ باوجود اس کے کہ یہ خبر خلاف توقع نہ تھی دل کو ایک دھکا سا لگا۔ اب مری میں قیام کا سوال ہی نہ تھا طبیعت اُچھاٹ ہو گئی۔ صبح میں نے رختِ سفر باندھا اور لاہور چلا آیا تاکہ یہاں کے ماتمی جلسوں اور قرار دادوں میں شریک ہو سکوں۔“

اب دبے دبے میں اُن خطوں کا طلب گار ہوا جو مختلف مواقع پر بابائے اُردو نے انہیں لکھے۔ حمید احمد خاں صاحب نے بڑی خوش دلی سے فرمایا:

کل صبح آٹھ بجے بلکہ نہیں، آٹھ سے پہلے ہی تشریف لے آئے،

خط لے لیجئے، اس بہانے ایک نکلاتا آپ سے اور سہی!

میں سر اپنا تیار، زیر بار رخصت ہوا۔ اگلی صبح حمید احمد خاں صاحب نے بابائے اُردو کے مکاتیب مرحمت فرمائے، یہ تعداد میں چھ تھے۔ ان میں سے ایک خط جسٹس ایس بی رحمن کے نام تھا۔ میں نے ان خطوں کی نقل اُن کے پاس بیٹھ کر ہی کی۔ نقل تو ایسی کے اس خشک اور بیزار کُن کام میں بھی میں اُن کی عنایت اور توجہ سے مستمتع ہوا، یعنی سیون اپ نے فریش اپ کیا۔ آخر آخر میں نے اُن سے سوانحی خاکے کی فرمائش کی تو انہوں نے بے اختیار فرمایا:

” ۱۹۰۳ء میں لاہور میں پیدا ہوا اور ارادہ بھی یہیں مرنے کا ہے۔“

تاریخ وفات کا پتہ نہیں۔“

ان کے سکرپٹری اے۔ اے۔ نثار صاحب کی عنایت سے سوانحی خاکہ میسر آ گیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے انجمن اور اصحاب انجمن کے بارے میں اخلاص اور محبت آمیز جذبات اور کلمات کے ساتھ بڑی عزت و منزلت سے رخصت کیا اور میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ افلاق و انکسار اور عجز و نیاز کی دولت کس قدر ناقابل تسخیر ہے اور انسان چاہے تو یہ کتنی آسانی سے ہاتھ آجانے والی بھی ہے لیکن خدا کے ایسے نیک نفس بندے ہیں بڑے خال خال جنہیں یہ نصیب ہوتی ہے — اور انسان ذرا سوچے اور غور کرے تو محض اسی ایک بات میں عبرت اور بصیرت کے بڑے سامان پوشیدہ ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے نام بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مرکاتب، حمید احمد خاں صاحب کے دلی شکرے کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں:

①

کراچی

۲۷۔ دسمبر / رجب طرہ

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا خط اور جناب امیں۔ اے۔ رحمن صاحب کا عنایت نامہ دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور دونوں کو میں نے ساتھ ساتھ پڑھا۔ میں حیران تھا کہ میں اب بھی اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا ہوں۔ شاید آپ نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک لاہور میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو قدیم تہذیب کے دل دادہ ہیں۔ ورنہ لاہور میں ایسے باکمال حضرات موجود ہیں جن کے سامنے میری کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے میں اسے آپ کی عنایت اور قدامت پرستی پر محمول کرتا ہوں۔ طوالتِ عمر جس سے میں سخت بیزار ہوں، آخر آج کام آہی گئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسی اہم کانفرنس کی صدارت کا مستحق نہیں۔

(سید معین الرحمن)

لہ ڈاک خانے کی سر کے مطابق سنہ تحریر ۱۹۵۸ء

یہ ازراہ انکسار نہیں بلکہ ازراہ حقیقت ہے۔

آپ نے میری اطلاع کے لیے جو امور لکھے ہیں ان سے آگاہی ہوئی۔ مصلحت کا لفظ دیکھتے ہی تلملا اُٹھتا ہوں۔ ان مصلحتوں نے ہمیں کیوں کا نہ رکھا اور آخر کار ان مصلحتوں نے ہی ہم کو ڈبوایا۔ جو کچھ کہنا ہے صاف کہو اور دو ٹوک کہو ہم کب تک مصلحتوں کی خاطر حق گوئی سے آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے۔ زیادہ کیا کہوں، حالات آپ کے سامنے ہیں۔

آپ کی کانفرنس ۱۸ جنوری کو شروع ہونی ہے۔ وہاں کب حاضر ہو جاؤ۔ میں وہاں کم سے کم دن رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی ملاقات کا منتظر رہوں گا۔

خیر طلب،

عبدالحمق

(۲)

کراچی

۱۲ جنوری ۱۹۵۹ء

عزیز مکرم زاد لطفہ

آپ کا خط پہنچا۔ اچھا ہوا آپ نے کانفرنس کی تاریخیں بدل دیں۔ آج کل لاہور میں غضب کی سردی ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ جس روز آپ کا خط پہنچا ہے اسی روز مس فاطمہ جناح کا بیان موجودہ نظام تعلیم کے خلاف شائع ہوا ہے۔ اس میں زبان کا بھی ذکر ہے۔ ایسے میں کانفرنس کے افتتاح کے لیے ان کا انتخاب بہت موزوں اور مناسب معلوم ہوا۔ میں آپ کے وفد میں شریک ہونے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔ مس فاطمہ جناح ہماری درخواست قبول کریں، اس کی مجھے بہت کم توقع ہے۔ بہر حال کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ اگر انہوں نے یہ درخواست قبول کر لی

تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ جو وفد آپ تجویز کریں اس میں لاہور کے دو ایک شخص ضرور ہونے چاہئیں۔

خیر طلب،

عبداللہ الحق

(۳)

کراچی

۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء

مکرمی و عزیز سلیمان

آپ کا خط پہنچا۔ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا کہ جسٹس رحمان کا خط فضلی صاحب کے پاس ہے اور وہ مس فاطمہ جناح کی خدمت میں وفد لے جائیں گے فضلی صاحب نے اس بارے میں مجھے کوئی اطلاع ابھی تک نہیں دی۔ آپ نے یہ ضرور لکھا تھا کہ ایسا وفد ترتیب دیا جائے گا اور مجھے بھی اس میں شرکت کے لیے لکھا تھا۔ میں منتظر رہا۔ مجھے مطلق اس کا علم نہیں کہ وفد گیا یا نہیں اور گیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ امید ہے فضلی صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع آپ کی یا جسٹس رحمان صاحب کی خدمت میں پہنچ گئی ہوگی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب دو ایک روز میں آنے والے ہیں ان سے پوری کیفیت معلوم ہوگی۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ لاہور میں اس تحریک کی مخالفت کی جا رہی ہے میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اردو کی اس قسم کی تحریک کی حمایت اہل پنجاب، خاص کر اہل لاہور کریں گے اور پاکستان میں اردو پنجاب والوں ہی کے دم سے زندہ رہے گی اور ترقی کرے گی۔ عجیب بات ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے اردو ان تمام علاقوں میں مقبول تھی جو اب

پاکستان میں شامل ہیں اور اُسے قومی زبان سمجھتے تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد سب سے اول مشرقی پاکستان سے مخالفت کی آواز آئی اور اس کے بعد دوسرے صوبوں نے منحرف ہونا شروع کیا۔ باوجود اس کے اب بھی مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان میں پنجاب ہی کی بدولت اسے فروغ ہوگا۔

خیر طلب
عبدالحق

(۴)

کراچی

۱۵۔ فروری ۱۹۵۹ء

شفیقہ وغزیری سلمہ

آپ کا خط ابھی ملا۔ تیز گام میں جبکہ منہیں ملی۔ اس لئے شاہین سے ۲۰ فروری کو روانہ ہو کر ۲۱۔ فروری کو پونے بارہ بجے لاہور پہنچوں گا۔

میں اپنا خطبہ آج ہی سید عبداللہ صاحب کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے زیادہ تر ذریعہ تعلیم سے بحث کی ہے اور یہی مجھے اس کانفرنس کا مقصد بتایا گیا تھا۔ سنا ہے کہ سردی وہاں بہت شدت سے پڑ رہی ہے بعض احباب نے لکھا ہے کہ ادھر کا رخ نہ کروں۔ لاہور تو ضرور جاؤں گا۔ اگر سردی کی ایسی ہی شدت ہے تو ۲۳ کے بعد قیام میرے لیے مناسب نہ ہوگا۔ ویسے اب میں لوگوں سے ملنے کے قابل محسوس نہیں رہا۔ آپ لوگ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے تو اب آپ لوگوں کے سامنے کچھ کہنے ہونے شرم معلوم ہوتی ہے۔

اب باقی ملاقات ہی کے وقت ہوں گی۔

خیر طلب
عبدالحق



(کراچی)

۱۹- فروری ۱۹۵۹ء

عزیز مکرم سلمہ

آپ کا خط ابھی ملا۔ اس سے پہلے آپ کے خط کا جواب لکھ چکا ہوں منجے
 گیا ہوگا۔ انشاء اللہ ۲۱- فروری کو شاہین گاڑی سے پونے بارہ بجے آپ کی خدمت
 میں حاضر ہو جاؤں گا۔

آپ نے یہ سہانے کی پتلی لگا دی۔ میں اس قابل نہیں رہا۔ سہانے
 دزدوں اور لیڈروں کے لیے ہوتے ہیں۔ اب تک غریب مہاجر ہوں جو کچھ کیا
 تھا اس پر پانی پھر گیا اور یہاں آکر جو کرنا چاہتا تھا وہ نہ کر سکا بلکہ میرے
 ساتھیوں نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ کچھ کر سکوں۔ اب سپاس نامہ کس بات
 کا؟ حرماں و محرومی کا؟ پیٹھی کی بات ہوگی۔ آپ میرے دل کے داغ کیوں تازہ
 کرتے ہیں اور سپاس نامہ پیش کر کے مجھے کیوں شرماتے ہیں۔ اردو کا جو حشر بھارت
 میں ہوا اور ہو رہا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا اور یہاں جو ہو رہا ہے وہ بھی آپ دیکھ
 رہے ہیں۔ یہ زمانہ سپاس ناموں کا نہیں کچھ کر گزرنے کا ہے۔ آپ اسے موقوف
 ہی رکھیے تو اچھا ہے۔ میں اسی کو سب سے بڑا سپاس نامہ سمجھوں گا۔ امید ہے
 آپ میرا مشا سمجھ گئے ہوں گے اور اصرار نہ فرمائیں گے۔ خیر طلب

عبدالحمید

(قومی زبان کراچی بابائے اردو نمبر اگست ۱۹۶۶ء، ص ۲۸۸-۲۹۸)

"حمید احمد خاں) کو شادی کی مبارک باد ابھی سے میری طرف سے پہنچا دیکھے گا وہ بھی ہاتھ
 گئے۔ شاید اسی وجہ سے محمود احمد خاں وطن گئے ہیں، انہوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

(بابائے اردو، ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء، مکتوبات عبدالحمید، جیل قدوائی، ص ۲۵۱)

بابائے اُردو اور جسٹس ایس اے رحمن

[ولادت: ۴۔ جون ۱۹۰۳ء]

[وفات: ۱۱۔ فروری ۱۹۷۹ء]

[مکالمہ: لاہور ۱۷۔ جون ۱۹۶۵ء]

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن کو اردو سے دلی لگاؤ ہے۔ وہ شعر بھی کہتے ہیں، نثر بھی خوب لکھتے ہیں اور تقریر بھی بڑی پُرکار کرتے ہیں۔ ان کے خطبات کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ "ترجمانِ اسرار" رحمن صاحب کا ایک اور کارنامہ ہے۔ یہ یادگار تالیف "کاروانِ ادب" نے شائع کی اور اب کمیاب ہے۔ حال ہی میں مرکزی ترقی اور پڑھنے رحمن صاحب کی ایک گراں قدر کتاب "سفر" شائع کی ہے۔ اس میں چند چھوٹی چھوٹی نظموں کے علاوہ ایک طویل نظم ہے جس میں ایک مہاجر کے سفر کی صورت میں بڑی ایمائیت اور بلاغت کے ساتھ پاکستان کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم کے بعد ایک بڑھا مشرقی پنجاب سے ہجرت کرتا ہے۔ راہ میں تھک کر وہ بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی آنکھ لگ جاتی ہے اور تاریخِ ہند کے مناظر اُس کی نظروں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح علامتوں کے ذریعے آریوں سے لے کر انگریزوں کے عہد تک ساری تاریخ اُس پر روشن ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پاکستان کی تاریخ کا ذکر آیا ہے اور گویا پاکستان کی سرحد میں پہنچنے پر اس کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے پاکستان کی تخلیق کی تمثیل ہے اور رحمن صاحب نے اسے انتہائی سوجھ بوجھ اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۲۸ء میں بطور اسٹنڈٹ کوشنر ہوئے اور اس میں داخل ہوئے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں عدالت انجام دیں حکومت پنجاب کے مشیر قانونی ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں لاہور ہائیکورٹ کے جج ہوئے۔ ۱۹۵۰-۱۹۵۲ء میں جسٹس منیر سپریم کورٹ میں گئے تو رحمن صاحب لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب پر ترقی پا گئے۔ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور یہاں

سے ۱۹۵۸ء میں سپریم کورٹ چلے گئے۔

رحمن صاحب مرکزی اُردو بورڈ کے صدر ہیں۔ بزم اقبال اور مجلس ترقی ادب کے ساء بھی وہ شروع ہی سے وابستہ ہیں۔ مرکزی ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بورڈ آف گورنرز میں ہیں اور انجمن ترقی اُردو کے لائف ممبر وہ ایک مدت سے ہیں۔ غرض اُردو کے خدمت گزاروں میں رحمن صاحب کا درجہ بڑا بلند ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی جلسے کی صدارت فرمائیں اُردو ہی میں تقریر فرماتے ہیں، الا یہ کہ نضاہی دوسری ہو! ۵۱-۱۹۵۰ء میں جب رحمن صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، انہوں نے علوم شرقیہ کے طالب علموں کو سنڈین عطا کیے جانے کے موقع پر ہمیشہ اُردو میں خطبے دیئے۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رحمن صاحب کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان پر بڑا اعتبار رکھتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان (کراچی) کے ایما پر بابائے اُردو کے بارے میں بعض دیگر بزرگوں کے بشمول جسٹس ایس۔ اے رحمن صاحب کے تاثرات محفوظ کرنے کے لیے میں بہاول نگر سے لاہور پہنچا یہ ۱۴۔ جون ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ رحمن صاحب کے ہاں ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا کہ ”دفتر“ گئے ہوئے ہیں۔ دو بجے تک لوٹیں گے اور دفتر پر ٹیلیفون نہیں تھا۔ دو بجے کے قریب معلوم ہوا کہ آرام فرما رہے ہیں۔ چار بجے کے بعد بیدار ہوں گے۔ عرض کیا؛ بیدار ہونے پر اطلاع کرا دی جائے کہ میں بہت دُور سے حاضر ہوا ہوا ہوں۔ پانچ بجے پھر رابطہ قائم کیا۔ رحمن صاحب خود تھے۔ ارشاد ہوا کہ بے شک ابھی آجائے۔

گلاب کا خوبصورت علاقہ، کوٹھی سفید اور کشادہ، ہر طرف سکوت اور سناٹا، پھر رحمن صاحب کی شخصیت کا ہیولا۔ میں بڑی عقیدت و اداوت لیے رحمن صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا اور لطف و مرحمت اور مہر و مکرمت سے سرفراز واپس آیا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے بارے میں رحمن صاحب نے فرمایا:

”وہ خود گویا اپنی ذات میں انجمن ترقی اُردو! جس تندھی سے اور سرگرمی سے انہوں نے اُردو کی خدمت کی اس کی مثال نادر بلکہ

معدوم ہوگی۔ سب کچھ انہوں نے اُردو کی خاطر قربان کر دیا۔ ساری زندگی گویا اُردو ہی کے ہو کر رہے۔ قوم نے انہیں جو "بابائے اُردو" کا خطاب دیا وہ ان کی ذات کے علاوہ اور کسی پر سچ ہی نہیں سکتا، بات تو دراصل یہی ہے۔"

سفید کرتا پاجامہ پہنے، رحمن صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے، چھوٹی سی میز پر بابائے اُردو کے مکتوبات اپنے سامنے پھیلائے، دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے فرما رہے تھے!

"ہر نقشِ خونِ نگر کے بغیر ناتمام ہے، اقبال کا یہ فرمان بالکل بجا ہے۔ تنہا مولوی صاحب کے اخلاص اور سوزِ جگر نے وہ کام کیا جو کئی انجمنوں کا کام تھا۔ انہوں نے خونِ جگر استعمال کیا اور اُردو کا نقش تمام رعنائیوں کے ساتھ اُبھرا، اور اُردو نے اپنا سکہ منوایا۔ وہ زندگی بھر اس کی حنا چومکھی لڑائی لڑتے رہے، کہیں مغربِ زدہ طبقے سے اُلجھ رہے ہیں، کہیں کانگریس سے، کہیں ہندوؤں کے قدامت پسندوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ محض اس لیے کہ اُردو کا بول بالا ہو اور یقیناً زندگی میں انہیں بہت حد تک کامیابی ہوئی۔ اُن کی کامیابی میں ان کے شگفتہ اسلوبِ بیان کو بہت دخل تھا۔ وہ زبان ایسی سادہ، پیاری اور دلکش لکھتے تھے کہ جو اُن کی بات سنتا تھا، یقین کرتا تھا کہ یہی ہماری زبان ہے۔"

میرے ایک استفسار کے جواب میں رحمن صاحب نے فرمایا:

"رسالہ "اُردو" میں مطبوعہ مولوی صاحب کے مضامین اور خطبات وغیرہ سے میں استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پہلے پہل مجھے غالباً مولانا عبدالحق کے مضامین سے اُس وقت آشنائی ہوئی جب مولانا ظفر علی خاں "پنجاب ریویو" شائع فرماتے تھے۔ مولوی صاحب اس میں غالباً جہاں تک مجھے یاد ہے "مجدوب کی بڑ" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ وہ رسالے اب میرے پاس نہیں ہیں۔ بڑی مدت ہوئی وہ میری نظر سے گزرے تھے۔ یہ غالباً

۱۳-۱۹۱۲ء کی بات ہوگی "پنجاب ریویو" اچھا رسالہ تھا۔ یہ کچھ عرصہ چلا اور پھر بند ہو گیا۔ مولوی صاحب کے علاوہ اس میں اسمعیل میرٹھی کی نظمیں اور مولانا ظفر علی خاں کے مضامین اور افسانے بھی ہوا کرتے تھے؛

رحمن صاحب نے میرے ایک اور استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"مولوی صاحب عام طور پر لاہور ایک آدھ روز کے لیے آتے تھے اور میاں بشیر احمد صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ ہر چند کہ جب تک وہ حیات رہے مجھ پر کرم فرماتے رہے! کچھ خط بھی آئے جو میں آپ کی نذر کرتا ہوں لیکن مجھے ان کی قربت کا ایسا زیادہ شرف حاصل نہیں رہا۔ بس خط و کتابت ہوئی یا جلسوں میں دیکھ لیا، دعوتوں میں ملاقات ہو گئی یا پھر مرض الموت میں مری دیکھا۔ آخری بار ملٹری ہسپتال مری میں گیا۔ اس وقت وہ نحیف تھے اور عام طور پر لوگوں کو پہچانتے نہیں تھے۔ ڈاکٹر کرنل عبدالرشید، نگران تھے اور علاج میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ ڈاکٹر سے پوچھا تو انہوں نے حالت کی طرف سے اطمینان دلایا لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ یوں..... چھوڑے چلے جا رہے ہیں۔"

رحمن صاحب نے آخری جلد خاصی دل گرفتگی سے مکمل کیا۔ چند ثانیے کے لیے وہ خاموش سے ہو گئے لیکن پھر فوراً ہی اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے شگفتہ اور سنجیدہ انداز میں گویا ہوئے تو اعتماد اور اطمینان کی لہران کے لب و لہجہ میں جاری و ساری تھی :

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے لوگ شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں زندہ قوموں ہی میں ایسے لوگ اُبھرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے مستقبل سے متعلق بالوس نہ ہونا چاہیے جو کام انہوں نے ادھورا چھوڑا ہے اسے آگے بڑھا کر ہی ہم ان کی روح کو تسکین پہنچا سکتے ہیں۔ استعمال سے ہی زبانیں بنتی اور منجھتی ہیں۔ اردو کو اعلیٰ فنی اور سائنسی علوم کے لیے اختیار کر لیا گیا ہے۔ اس کے دور رس نتائج ہوں گے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ

ایک اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ وہ تو نہ ہوا لیکن کراچی میں ایک اردو کالج
ان کی زندگی میں قائم ہو گیا جو بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ یہ گویا ان کی زندہ
یادگار ہے۔ ان کی تصانیف کے علاوہ“

اب رحمن صاحب نے بابائے اردو کے چند مکاتیب مرحمت فرمائے کہ میں ان کا شمار
کریوں! میں نے احتراماً عرض کیا ”اس کی کیا ضرورت ہے، جیسے اور جتنے آپ فسرما
رہے ہیں بس ٹھیک ہیں۔“ فرمایا ”لفافے ضرور چھپیں لیکن خط تعداد میں سات ہیں، یعنی
دو خط ایک ساتھ ملفوف ہیں، معین صاحب آپ ان کی نقل لے کر اصل خط مجھے
واپس کر دیجئے گا۔“ تب مجھے پتہ چلا کہ ”احتیاطی“ تدبیر کیوں اختیار کی جا رہی تھی!
رحمن صاحب کے لیے یہ خط واقعی ایک یادگار اہمیت کے حامل ہیں کہ مکتوب نگار
فردوس نشین ہوئے اور پھر مکتوب نگار بھی وہ کہ جن کی شخصیت پورے ایک عہد پر حاوی ہے۔
جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن صاحب کے نام بابائے اردو کے مکاتیب رحمن صاحب کے
دلی شکرے کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں : ۷

①

۱۶ فروری ۱۹۵۰ء

(بھیغہ رجسٹری)

مخدوم و مکرم زاد لطفہ السلام علیکم
کئی بار لاہور جانے کا ارادہ کیا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا کام
آگیا کہ میں قاصر رہا۔ لاہور جانے کا ایک مقصد آپ کی ملاقات بھی تھا
اور آپ سے بعض امور پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔
اس وقت یہ خط خاص غرض سے لکھ رہا ہوں..... صاحب پنجاب

۱۷ لفافے پر ڈاک خانے کی نمبر ۱۹۵۱ کی ہے غالباً پولوی صاحب سے التباس ہوا کہ نیا سال چڑھے

زیادہ دن نہیں ہوئے

یونیورسٹی میں اردو کے سینئر لیکچرار ہیں۔ عربک کالج دہلی کے لیے کوئی ایک درجن امیدواروں میں سے میں نے انہیں کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں انہوں نے بحیثیت صدر شعبہ اردو بہت قابل تعریف کام کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی وہ میرے لکھنے اور اصرار پر آئے کیونکہ میں چاہتا تھا کہ قابل اور کام کے لوگ کسی نہ کسی طرح پنجاب یونیورسٹی میں آجائیں۔ عربک کالج نے طویل رخصت دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے انہیں استعفیٰ دینا پڑا اور پاکستان آجانے کی وجہ سے انہیں موروثی جائیداد سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ نہایت قابل سلیم الطبع اور پر جوش نوجوان ہیں۔ علم و ادب سے خاص شغف ہے اور یہی ان کا اڑھنا بچھونا ہے۔ ان کی کتاب... جو انہوں نے بڑی قابلیت اور جامعیت سے لکھی ہے، انجمن ترقی اردو چھپوا رہی ہے۔ ان وجوہ سے میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے اور میں انہیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ آج کل انہیں بعض ایسی مشکلات پیش آگئی ہیں جن کی وجہ سے وہ بہت پریشان خاطر اور دل شکستہ ہیں۔ ان مشکلات کو صرف آپ رفع فرما سکتے ہیں۔ میں انہیں لکھا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مشکل پیش کریں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضر فرمائیں گے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔

نیاز مند
عبدالحق

(۲)

۱۳ مارچ ۱۹۵۱ء

(بذریعہ رجسٹری)
جناب مکرم و معظم زاد مجدہ۔ السلام علیکم

انجمن ترقی اُردو پاکستان نے ایک اُردو کانفرنس اعلیٰ پیمانے پر انعقاد کرنے کا اہتمام کیا ہے جس کے اجلاس ۱۳-۱۴-۱۵ اپریل کو ہوں گے پہلے دو اجلاس کی صدارت جناب عبدالرب نشتر صاحب نے منظور فرمائی ہے۔ افتتاح کانفرنس کی درخواست، عالی جناب لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم سے کی جائے گی۔ اس کانفرنس میں دو شعبے خاص طور پر رکھے گئے ہیں۔ ایک علمی و ادبی نمائش ہے جس میں قدیم اُردو مخطوطات، خوشخطی کے نمونے، جامعہ عثمانیہ دائرہ المعارف حیدرآباد دکن اور انجمن ترقی اُردو کی مطبوعات، ٹائپ کی مطبوعہ قدیم کتابیں، جدید اُردو ٹائپ کے نمونے، قدیم مصوروں کی تصاویر، اُردو ٹائپٹر وغیرہ وغیرہ پیش کیے جائیں گے۔ اس کے افتتاح کے لیے عالی جناب خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل پاکستان سے درخواست کی گئی ہے۔ دوسرا شعبہ تعلیمی ہے جس کے دو اجلاس ۱۵-۱۶ اپریل بروز یکشنبہ ہوں گے پہلے اجلاس میں جو دن کے وقت ہوگا علمی مقالات پڑھے جائیں گے شب کے اجلاس میں ہم عملی طور پر اس بات کا مظاہرہ کریں گے کہ اُردو زبان میں سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم اُسی خوبی اور آسانی سے دی جاسکتی ہے جیسی انگریزی میں۔ اس کے لیے ہم نے خاص اہتمام کیا ہے۔ اس تعلیمی شعبے کے لیے انجمن کی بہ ادب درخواست ہے کہ اس کی صدارت آپ ازراہ نوازش قبول فرمائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ انجمن کی اس استدعا کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

نیاز مند

عبدالحق

(۳)

۲۰-۱ اپریل ۱۹۵۱ء

مخدوم و مکرم زاد لطفہ۔ السلام علیکم

اُردو کانفرنس بہ خیر و خوبی ختم ہوگئی اور ہر شعبے کا کام خوش اسلوبی سے انجام

پایہ پاکستان کے ہر علاقے کے نمائندوں نے شرکت کی اور اپنے تعاون سے کانفرنس کو کامیاب کیا۔

آپ کے پیغام کو جو اُردو تار کے ذریعے موصول ہوا لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کانفرنس کے کامیاب بنانے میں آپ نے جو اعانت فرمائی اس کا انجمن کی طرف سے تمہارے دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نیاز مند

عبدالحق

(۴)

۸۔ مئی ۱۹۵۱ء

مخدوم و مکرم زاد لطفہ۔ السلام علیکم

آپ کی خدمت میں اُردو کمیٹی کا ایجنڈا اور کاغذات پہنچ گئے ہوں گے۔ اس کمیٹی کو قائم ہوئے تخمیناً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس کی کارروائی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ابھی تک ہم نے کچھ نہیں کیا۔ سب سے اہم مسئلہ ذریعہ تعلیم کا ہے، اس کرسائنس کی تعلیم میں اس پر سالہا سال سے بحث ہوتی چلی آ رہی ہے اور اب جب پھر یہ معرض بحث میں آتا ہے تو وہی فرسودہ دلائل پیش کی جاتی ہیں اور کوئی بات طے نہیں ہونے پاتی۔ وجہ یہ ہے بعض صاحب جو اپنے آپ کو ماہر سائنس خیال کرتے ہیں نہیں چاہتے کہ اُردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ ڈال کر ایسی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں کہ معاملے میں تاخیر ہوتی چلی جائے۔ اب اس جلسے میں بھی یہی صورت پیش آنے والی ہے۔ اس لیے میری یہ عین خواہش ہے کہ آپ اس جلسے میں ضرور شرکت فرمائیں۔ جب تک آپ جیسے اہل الرائے حضرات اس میں شریک ہو کر ان مسائل پر غور نہیں فرمائیں گے یہ امور طے نہیں ہوں گے اور عزیز وقت فضول بحثوں میں ضائع ہوگا۔ میں مولوی سید ہاشمی صاحب جو انٹرنٹ سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کو آپ کی

خدمت میں بھیجتا ہوں۔ وہ آپ سے تمام حالات عرض کریں گے۔ آپ کی مصروفیت کا حال مجھے معلوم ہے۔ آپ کی صرف ایک دن کی شرکت کافی ہوگی۔ آپ ہوائی جہاز سے آکر واپس جاسکتے ہیں۔ اس میں ایک دن سے زیادہ صرف نہ ہوگا۔

نیازمند

عبدالحق

⑤

کوئٹہ۔ لٹن روڈ نمبر ۲۶

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

مخدوم و مکرم زاد لطفہ۔ السلام علیکم

گرامی نامہ پہنچا۔ تمہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بلاشبہ آپ پر کام کا ہجوم ہے اور اس پر اتنے کام اور ذمہ داریاں۔ ایسی صورت میں آپ کا کوئٹہ آنا دشوار تھا اور آپ کا عذر بالکل بجا ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے المناک سانحے کی وجہ سے کانفرنس ملتوی کرنی پڑی۔ اب آئندہ سال مئی کی ۸۔۹۔۱۰ کو قرار پائی ہے۔ اگر اس زمانے میں ایک دو روز کے لیے زحمت فرمائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ ہم سب کی یہی آرزو ہے کہ آپ ہی بلوچستان کی پہلی اردو کانفرنس کو اپنی صدارت سے عزت بخشیں۔ امید ہے کہ ہماری درخواست قبول فرمائی جائے گی۔

نیازمند

عبدالحق

⑥

۲۲ اگست ۱۹۵۲ء

مکرم و معظّم بندہ زاد لطفہ، السلام علیکم

انجمن ترقی اردو بلوچستان کی صدارت کے متعلق گذشتہ سال آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ اس وقت آپ نے عدم فرصت کا عند فرمایا تھا۔ چودھری محمد علی صاحب نے میری درخواست بخوشی منظور فرمائی تھی مگر ان کی علالت کی وجہ سے کانفرنس ملتوی کرنی پڑی۔ وہ اب بھی تیار تھے مگر ڈاکٹروں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ لہذا اب میں پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ ازراہ کرم انجمن کی درخواست قبول فرمائی جائے۔ اہل انجمن یہ کانفرنس ماہ ستمبر ہی میں کرنا چاہتے ہیں ۱۲-۱۳-۱۴ ستمبر کی تاریخیں تجویز ہوئی ہیں۔ اگر یہ مناسب نہ ہوں تو ۱۹-۲۰-۲۱ ستمبر ہو سکتی ہیں یا تو تاریخیں آپ مناسب خیال فرمائیں۔ امید ہے جواب جلد عنایت فرمایا جائے گا۔

نیازمند

عبدالحق

⑤

۲۶- دسمبر ۱۹۵۸ء

(رجسٹرڈ)

کرم و معظّم زاد مجدّم - السلام علیکم

گرامی نامہ شرف صدور لایا، بہت ممنون فرمایا۔ آپ کی دعوت شکر و احسان مندی کے ساتھ بسر و چشم قبول کرتا ہوں۔ کانفرنس کی صدارت کا انتخاب میرے لیے موجب عزت و افتخار ہے۔ حسب ارشاد مقررہ تاریخوں میں حاضر ہو جاؤں گا۔

نیازمند

عبدالحق

۱۷ جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن صاحب کے نام بابائے لوہا کا یہ خط پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ذخیرہ مکاتیب سے میسر آیا۔

مخدوم و مکرم زاد لطفکم۔ السلام علیکم۔

آپ کی توجہ اور سرپرستی سے اردو کا تفرسن بخیر و خوبی اور کامیابی سے ہوئی۔ اس کی قراردادیں عام طور پر پسند کی گئیں اس کام کے انجام دینے میں جو محنت اور کوشش کی گئی ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس کا ضرور اثر ہوگا۔

خلیفہ عبدالحکیم کی وفات بھی ایک سانحہ ہے۔ خصوصاً ادارہ ثقافت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم بہت اچھا کام کر رہے تھے اور بڑے شوق اور خلوص سے کر رہے تھے ان کی جگہ کسی ایسے شخص کا انتخاب ہونا چاہیے جو اس کام کو نبھالے جائے۔ میری نظر میں ڈاکٹر عابد احمد علی اس کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ عربی زبان اور علوم اسلامی پر ان کی اچھی نظر ہے۔ دائرۃ المعارف اسلامی کے لیے جو دو تین مضمون انہوں نے لکھے ہیں ان سے مجھے ان کی قابلیت کا اندازہ ہوا۔ آپ انہیں طلب کر کے گفتگو فرمائیں۔ گفتگو کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس کام کے اہل ہیں یا نہیں۔

ان کے والد سید احمد علی، سر سید احمد خاں کے نواسے تھے۔ ڈاکٹر عابد احمد علی بہت شریف النفس اور محنتی شخص ہیں۔ اگر ان کا انتخاب ہوا تو وہ خلیفہ صاحب مرحوم کا بدل ثابت ہوں گے۔

اگر آپ ملاقات کے لیے انہیں طلب کرنا پسند فرمائیں تو ڈاکٹر میو لوی محمد شفیع صاحب کی وساطت سے طلب فرما سکتے ہیں۔

نیاز مند

عبدالحمق

(قومی زبان، کراچی، بابائے اردو نمبر، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۹-۲۸۷)

لہ ڈاک خانے کی مرے سے سنہ تحریر ۱۹۵۹ء طے پاتا ہے۔

بابائے اردو کے رفیقِ دیرینہ

حکیم اسرار احمد کرپوی سے ایک مکالمہ

[ولادت: کورئی، الہ آباد، یکم مارچ ۱۹۰۶ء]

[وفات: کراچی، ۲۔ جنوری ۱۹۹۱ء]

[طویل تحریری مکالمہ: اکتوبر ۱۹۷۵ء]

عس تجرید حکیم اسرار احمد کریمی

تکمیل (تکمیل) اسرار احمد کریمی

والد مرحوم کا نام :-

شیخ احمد وحید

کوئی

بائے ولادت :-

تعمیر الہ آباد تحصیل الہ آباد پریگنچ جیل کا ایک جبرائیل نامہ ذرا پھر الہ آباد کے
۱۳ اپریل ۱۹۰۸ء میں دریا گڑھا کے دائیں کنارے پریگنچ جیل کے بڑی کھیتی
بٹھاڑے میں منویہ میں واقع پر۔ گواہ کی آگے سو گوردوں پر شکل پر۔
تاریخ

تعمیر الہ آباد کے سلطان علی محمد، ۱۹۰۸ء میں ۷۰ برس پر الہ آباد میں ولادت ۱۹۱۶ء
میں کیموں آریوں والدہ وجود مبارک کی تحسین میں اپنے لیے ساتھی ڈاکٹر اعظم کریم کے
نومال چھوٹا پیرن جملہ والدہ صاحبہ مرحومہ زینبہ بیگم کے ساتھ بی بی کا پلنگہ
ایک صفحے پر درج ہے۔ میں نے ۱۹۰۸ء میں ماں باپ اور بہن پریموں کو سکڑاؤں میں داخل
کرانے وقت تمام طور سے صحیح معرے ایک سال کم لگاتے ہیں۔

①

ضلع الہ آباد اور تحصیل الہ آباد (یوپی، انڈیا) کے پرگنہ چایل کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کورئی۔۔۔۔۔ جو شہر الہ آباد سے تیرہ میل مغرب میں دریائے گنگا کے دہنی کنارے پر چایل کی سب سے بڑی بستی مہگاؤں سے دو میل جنوب میں واقع ہے۔۔۔۔۔ اس گاؤں (کورئی) کی آبادی سو گھروں سے زیادہ پر مشتمل نہیں رہی۔

اس چھوٹے سے گاؤں کے ایک سفید پوش متوسط زمیندار گھرانے کے سربراہ فیاض احمد مرحوم کے دو بیٹوں نے اردو زبان و ادب کے خدمت گزار کی حیثیت سے بڑا نام پایا۔۔۔۔۔۔۔ ان میں سے بڑا بیٹا پیٹھے کے اعتبار سے ”ڈاکٹر“ تھا اور چھوٹا ”حکیم“۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہیں اردو کے مشہور افسانہ نگار دیہی زندگی کے ترجمان اور عکاس پریم چند کے معاصر ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم۔۔۔۔۔ اور معروف صحافی، معلم، صاحب تدبیر سیاسی کارکن آشفٹہ مزاج لیکن بڑے مہم جو، منصوبہ ساز، اردو کے قدیم خدمت گزار اور بابائے اردو کے دیرینہ ہم دم اور دمساز: حکیم اسرار احمد کریوی مرحوم۔

حکیم اسرار احمد کریوی کے انتقال پر انجمن ترقی اردو پاکستان کے ترجمان رسالہ ”قومی زبان“ نے لکھا:

تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما، ماہر تعلیم اور شی کالج (کراچی) کے سابق پرنسپل اور بزرگ صحافی مولانا اسرار احمد کریوی۔۔۔۔۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۱ء کو انتقال کر گئے انا اللہ وانا الیہ راجعون۔۔۔۔۔ نماز جنازہ کے شرکاء میں سیاسی رہنما احباب و اعزہ سابق وزراء علمائے دین اور میئر کراچی شامل تھے۔

حکیم اسرار احمد کریوی نے تحریک پاکستان میں قائد اعظم محمد علی جناح، مولانا حسرت موہانی، چودھری خلیق الزماں اور نواب صدیق علی خاں کی معیت میں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے تیس برس تک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی کام کیا۔۔۔۔۔ وہ اردو کش اسکیموں، واردہا اور وریا مندر کے خلاف جہاد میں بابائے اردو کے ساتھ رہے۔

حکیم اسرار احمد کریوی نے ایک معرکتہ لآرا کتاب ”سی پی میں کانگریس راج“ لکھی۔ وہ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ حکیم اسرار احمد کریوی نے پس ماندگان میں چار بیٹیاں اور تین بیٹے چھوٹے ہیں۔ عزیز اکرم، نصیر اکرم اور زہیر اکرم ندیم۔۔۔۔۔ آخر الذکر، کونسلر ایم پی اے اور سابق صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔“

[قومی زبان کراچی، جنوری ۱۹۹۱ء ص ۸۳]

جناب شمیم صبا می متھراوی نے ان کا قطعہ تاریخ وفات موزوں کیا:

”حکیم اسرار احمد کریوی نگہبانِ قصرِ خلد“

۱۹۹۱ء

تمہیں اب کہاں دہر میں وہ ملیں گے
کریوی تو جنت میں کرسی نشین ہیں
شمیم ان کی تاریخِ ترحیل لکھ دو
”کریوی بہشتِ بریں کے امیں ہیں“

۱۳۱۱ھ

”تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما، ماہر تعلیم شی کالج کراچی کے سابق پرنسپل اور بزرگ صحافی حکیم اسرار احمد کریوی نے ۳۔ جنوری ۱۹۹۱ء مطابق ۱۶ جمادی الآخر بروز پنج شنبہ۔۔۔۔۔ کراچی میں انتقال فرمایا مرحوم کو سرشاہ سلیمان روڈ پر واقع قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا ہے“

[قومی زبان، کراچی فروری ۱۹۹۲ء ص ۵۵]

حکیم اسرار احمد کریوی کے مزاج آشنا اور تربیت یافتہ بردارم متین الرحمن مرتضیٰ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

حکیم اسرار احمد کریوی پٹھے کے لحاظ سے طبیب، جوانی کے مشغلے کے اعتبار سے سیاسی کارکن، علمی مذاق کے اعتبار سے ادیب و شاعر اور افتاد طبع کے اعتبار سے سیلانی تھے۔ گھر سے زیادہ حلقہ یاراں میں خوش رہنے والے۔ ہجرت سے قبل حکیم صاحب اپنی متوسط زمیندرا نہ حیثیت میں کسی مشغلے ذریعہ معاش کے پابند نہیں رہے۔ مشغلے کے طور پر سیاست کی اور ضرورتاً صحافت کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ وہ روزنامہ ”انجام“ کراچی کے اسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔

حکیم اسرار احمد کریوی مرحوم بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے سیاسی مشیر رہے، خصوصاً اردو ہندی تنازعے کی تحریک میں وہ بابائے اردو کے ساتھ بہت زیادہ فعال رہے۔ انہوں نے سی پی میں مسلم لیگ کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ”سی پی میں کانگریس راج“ حکیم اسرار احمد کی وہ معرکتہ آرا تصنیف ہے جس نے بڑی شہرت پائی اور قائد اعظم کے صد سالہ جشن ولادت

پر یہ کتاب قائد اعظم اکیڈمی سے مسلم لیگ کے یادگاری و بنیادی
لٹریچر کے طور پر دوبارہ بھی شائع ہوئی۔۔۔۔۔“

[اداریہ ہفت روزہ تکبیر، کراچی، ۱۶ جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷]

○

حکیم اسرار احمد کربوی سے میرا تعارف ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ یہ تعلق ان کے وصال
تک کوئی تیس برس سے زیادہ تک قائم اور برقرار رہا۔۔۔۔۔ بہاول نگر سے انٹرمیڈیٹ
کرنے کے بعد میں نے اگست ۱۹۵۹ء میں بابائے اردو کے بنا کردہ اردو کالج کراچی
میں تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا۔۔۔۔۔ اردو کالج میں پڑھنے والے ہر طالب علم کا بابائے اردو
کی خدمت میں باریاب ہونا، محالات میں نہ سمی، کچھ ایسا آسان اور ضروری بھی نہیں تھا
یہ حسن اتفاق اور میری خوش قسمتی کہ مجھے اول دن ہی سے ان کی خدمت میں حاضری کی
عزت حاصل ہوئی۔

صدر انجمن بابائے اردو کے کتب خانے میں بابائے اردو کے رفیق دیرینہ حکیم
اسرار احمد کربوی سے تعارف کی خوشی میسر آئی۔۔۔۔۔ ان سے نیاز مندی کا یہ سلسلہ کچھ
ایسا جڑا۔۔۔۔۔ اور یہ بندھن گزران وقت کے ساتھ ساتھ اس درجہ مضبوط اور قوی تر ہوا
کہ وہ میرے اور متین بھائی کے معاشی، ادبی و تعلیمی، یہاں تک کہ ہمارے شخصی اور خانگی
معاملات اور مسائل تک میں دخیل ہو گئے۔۔۔۔۔ اور ایک مہربان اور قدر دان سرپرست
کے طور پر وہ ہم دونوں بھائیوں کو کچھ اپنی ذمہ داری سی خیال کرنے لگے۔ حکیم صاحب کا
توسط بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ذات اور خدمات سے میرے گہرے شغف اور عشق کا
ایک باعث بنا۔

حکیم صاحب بابائے اردو کے بے حد مقرب اور معتمد اور ان سے بڑے مخلص
تھے۔ وہ بابائے اردو کی زندگی کی آخری چوتھائی صدی کی سرگرمیوں میں ان کے ہم قدم
اور شریک غالب رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور پھر پاکستانی دور کی سالانہ رودادوں
میں، نیز مختلف اصحاب کے نام بابائے اردو کے خطوں میں حکیم صاحب کا ذکر بڑے تواتر

کے ساتھ اور بڑے اچھے لفظوں میں آیا ہے۔ ”انجمن“ کی پنجاہ سالہ تاریخ (مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی) بھی حکیم اسرار احمد کے ذکر خیر سے خالی نہیں۔

حکیم صاحب بابائے اردو کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے ایامِ آخر کے چشم دید رفیق اور گواہ تھے۔ صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی دعوت پر بابائے اردو کو علاج کے لئے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال، مری لے جایا گیا تو حکیم صاحب ان کے ساتھ تھے صحت سے مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں حکیم صاحب ہی بابائے اردو کو لے کر مری سے بذریعہ ٹرین کراچی لائے۔ بابائے اردو کے مزاج دان ہونے کی حیثیت سے حکیم صاحب کی متعدد نگارشات بابائے اردو کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بڑی خیال افروز اور معلومات افزاء ہیں۔ وہ ان پر ایک مستقل اور مفصل کتاب لکھنے کے آرزومند بھی تھے جو بڑی چونکا دینے والی ہوتی۔

کسی دوسرے موقع پر یہ لکھ چکا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت: ”حقیقہ طور پر عظیم تھی۔۔۔۔۔ اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے عظیم شخصیت کی نشانی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔ بابائے اردو کی پہلو دار اور عظیم شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے کارنامے بھی اتنے ہی زیادہ اور متنوع ہیں کہ ایک مضمون، ایک نمبر یا ایک کتاب میں بیان نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ بیان کیے بھی نہیں جاسکتے کہ بڑی شخصیت کا متحمل ہونا آسان نہیں۔ اس کے لئے بجائے خود بڑی شخصیت کا حامل ہونا ضروری ہے اور یہ خود اختیاری بات نہیں!

مولوی عبدالحق کی بلند اور غالب شخصیت اپنے بھر پور احاطے اور تجزیے کے لیے کسی حالی کی منتظر ہے۔۔۔۔۔ یہ حکیم اسرار احمد کر پوی بھی ہو سکتے ہیں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی۔۔۔۔۔“

[۱۹۶۸ء]

افسوس، صد افسوس کہ اب نہ ڈاکٹر شوکت سبزواری ہم میں رہے نہ حکیم اسرار احمد کرپوی!!

○

حکیم اسرار احمد کرپوی اس نقطہ نظر کے بڑے پُر جوش موجد اور حامی تھے کہ مولوی عبدالحق کی کتاب ”چند ہم عصر“ میں قدم قدم پر خود مولوی عبدالحق کے اپنے مزاج، ان کی پسند ناپسند اور ان کے رہن سہن رویوں اور طرز فکر کی تصویریں آویزاں ہیں۔ حکیم صاحب کی رہنمائی میں میں نے ”چند ہم عصر“ کے آئینے میں مولوی عبدالحق کی سیرت اور شخصیت کو پانے کی کرید اور جستجو کی۔۔۔۔۔ اس تلاش و تھص میں مجھے کوئی دو برس لگے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کا بڑا حصہ حکیم صاحب کے پاس بیٹھ کر ”چند ہم عصر“ کو سمجھنے اور دیکھنے بھالنے میں صرف ہوا۔ میری اس کاوش کے حاصل نے رسالہ ”نقوش“ لاہور شمارہ ۱۰۲ مئی ۱۹۶۵ء میں جگہ پائی۔۔۔۔۔ اور بعد میں اس مطالعے نے بابائے اردو کے بارے میں بعض تالیفات میں بھی اپنی جگہ بنائی۔

۱۹۷۵ء میں اپنے اس مطالعے اور جائزے پر ایک طائرانہ نظر (Air view) کے نتیجے میں میرے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوئے جن کے تحریری جوابات کے لیے میں نے حکیم اسرار احمد کرپوی سے رجوع کیا۔۔۔۔۔ میں اس زمانے میں اپنی منصبی ذمہ داری پر فیصل آباد (لاائل پور) میں تھا۔۔۔۔۔ اور حکیم صاحب بدستور کراچی میں فرؤکش تھے۔

میں نے اپنی الجھنیں ان کی خدمت میں لکھ بھیجیں اور بابائے اردو کی زندگی اور ان کے مزاجی رویوں کے بارے میں حکیم صاحب سے تائید و تصدیق یا تصحیح کی صورت میں کچھ تفصیل عطا کرنے اور اپنی شہادتوں کو قلم بند کرنے کی بہ بجز اور بہ شدت درخواست کی۔۔۔۔۔ جس کے جواب میں انہوں نے ازراہ معین نوازی اپنی مصروفیات اپنی طویل العمری اور خرابی صحت کے باوجود مجھے اٹھائیس تیس سطرے مسطر کے اٹھارہ انیس فل اسکیپ اور اتنی گھنی اور گھٹی ہوئی لکھائی میں گھسیٹ بھیجے۔

سوچتا ہوں کہ اس شفقت اور کرم فرمائی کا مظاہرہ میں حکیم صاحب کی عمر اور

مٹکی صحت کو پہنچ کر اگر یہ میری قسمت میں لکھی ہے، اپنے کسی عزیز کے لیے روارکھ پاؤں گا؟!

○

اس تمہید و تجید کے بعد میرے اور حکیم اسرار احمد کریوی کے مابین تحریری بات چیت قارئین کی نذر ہے آغاز تحریر میں حکیم صاحب کا ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کا گرامی نامہ ہے جو انہوں نے اپنے طویل جواب نامے کے ساتھ ارسال کیا۔۔۔۔۔ پھر میرے سوالات کے جواب میں حکیم اسرار احمد کریوی کے اپنے قلم سے خود ان کے کوائف حیات اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں آئے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزاجی اوصاف امتیازات اور روتوں اور ان کے بہت سے واقعات حیات کے بارے میں حکیم صاحب نے اپنے مشاہدے قلم بند کیے ہیں۔

میرے ذخیرے میں حکیم اسرار احمد کے دو اور خط بھی نکلے، ایک ۱۹۶۳ء کا دوسرا ۱۹۷۷ء کا۔۔۔۔۔ یہ ایک طرح سے خالصتاً نجی خط ہیں لیکن ان دونوں میں بھی ضمناً بابائے اردو کا حوالہ ضرور آیا ہے۔۔۔۔۔ اس لیے پیش نظر طویل تحریری سلسلہ سوال و جواب کے آخر میں حکیم صاحب کے ان دونوں خطوں کو بھی بطور ”ضمیمہ“ محفوظ کر دینا مجھے زیادہ بے محل دکھائی نہیں دیتا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن

۲۶ مئی ۲۰۰۲ء

②

J/۱۵۸

P.I.B Colony

karachi-----۵

۱۵۸/جے

پی۔آئی۔بی کالونی کراچی

۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء

میاں معین! اللہ تم کو ہمیشہ خوش و خرم خوش حال اور

صحت مندر رکھے۔ شاید تم کو یاد نہیں کہ شبیر احمد مرحوم ۳ کے بے وقت انتقال کے بعد میں دو سال تک خون کے شدید دباؤ کا مریض رہا، جس کا رجحان خاص طور سے دماغ کی طرف تھا۔ میرے معالج ڈاکٹر حبیب الرحمن خاں نے جو میرے شاگرد بھی ہیں مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں بھول کر کوئی ایسا کام نہ کروں جس کا اثر میرے دماغ پر پڑ سکے لیکن تم نے جو سوالات بھیجے تھے ان کے بارے میں مجھے گھنٹوں مسلسل سوچنا پڑا اور تب کہیں جا کر یہ صفحات کھل ہوئے۔۔۔۔۔ غالباً کام نکالنے کا یہ گرتم نے بابائے اردو مرحوم کی زندگی کے مطالعے سے حاصل کیا ہے۔ وہ بھی اسی طرح کام نکال لیا کرتے تھے۔

تمہارے ان سوالات نے مجھے یہ حوصلہ دیا ہے کہ میں بابائے اردو مرحوم کی زندگی کے حالات قلم بند کر سکوں۔ میرا اردو جلد ہی ہندوستان جانے کا ہے۔ اگر ویزہ مل گیا تو ایک دو ماہ کے اندر ہی تین ماہ کے لئے وہاں جاؤں گا اور واپس آ کر اگر خدا نے چاہا اور اس کی توفیق شامل حال ہوگی تو اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔

مستعین میاں ۳ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہی مسودہ لے کر یونیورسٹی جا رہے ہیں۔ کل وہ رجسٹری کے ذریعے تمہیں بھیج دیں گے۔ اپنی بیوی، بچی اور بچے کو میری جانب سے دعا کہنا۔۔۔۔۔ تم کہو گے کہ آخر بے زبان بچے کو کیوں کر دعا پہنچائی جائے تو بھائی بچوں کو دعا کہنے کی آسان صورت یہ ہے کہ انہیں خوب بھیج بھیج کر پیار کیا جائے۔ یہی پیار ان کے حق میں دعا کا کام کرے گا۔

ارے میاں، ڈاکٹر افتخار احمد سلمہ ۵ سے ضرور ملنا اور ان سے میری

دعا کہنا اور یہ بھی کہہ دینا کہ میں بالکل اچھا اور معاشی اعتبار سے مطمئن ہوں۔ لڑکے لائق اور فرماں بردار ہیں۔

دعا گو

اسرار احمد

○

نام: (حکیم) احمد اسرار

والد مرحوم کا نام: فیاض احمد صاحب

جائے ولادت: ضلع اور تحصیل الہ آباد پرگنہ چایل کا چھوٹا سا گاؤں کورئی جو شہر الہ آباد سے تیرہ میل مغرب میں دریائے گنگا کے دہنی کنارے پر چایل کی سب سے بڑی بستی مہگاؤں سے دو میل جنوب میں واقع ہے۔ گاؤں کی آبادی سو گھروں پر مشتمل ہے۔

تاریخ ولادت: تعلیمی اسناد کے مطابق یکم مارچ ۱۹۰۸ء لیکن میرا اپنا خیال ہے سال ولادت ۱۹۰۶ء ہے کیوں کہ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم سے نو سال چھوٹا ہوں جو والد صاحب مرحوم کی زمینداری کے حساب و کتاب کی کاپی کے ایک صفحے پر درج ہے۔ یوں بھی ماں باپ اور سرپرست بچوں کو اسکولوں میں داخل کراتے وقت عام طور پر صحیح عمر سے ایک دو سال کم لکھاتے ہیں۔ بابائے اردو سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟

غالباً اپریل ۱۹۳۵ء میں ناگ پور (سی۔ پی۔ انڈیا) میں گاندھی جی کی صدارت میں ”آکھیل بھارتیہ سہتیہ پریشد“ (آل انڈیا لٹریری کانفرنس) کا اجلاس ناگ پور میں سائنس کالج کے اس ہال میں ہوا جس کے دروازے کے اوپر دو ناگ بنے ہوئے تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم بھی اس کانفرنس میں خاص طور سے مدعو کیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ (ڈاکٹر) اختر حسین رائے پوری بھی تھے جو ان دنوں بابائے اردو مرحوم ہی کے ساتھ بابائے اردو مرحوم کی قیام گاہ نادر منزل سیف آباد حیدر آباد دکن میں رہتے تھے۔ میں اس دوران ناگ پور میں مقیم تھا اور ”امید“ کے نام سے ایک اردو

ہفت روزہ اخبار نکالتا تھا۔

کانفرنس کے ہال میں بابائے اردو مرحوم سے میری ملاقات صاحب سلامت کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بابائے اردو مرحوم کے بارے میں جو روایتیں میرے کانوں تک پہنچی تھیں ان کے زیر اثر میں کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو گیا تھا۔ کانفرنس کے ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ (ڈاکٹر) اختر حسین رائے پوری کے ساتھ ایک ٹانگے پر شاید اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کانفرنس کے کارکنوں سے ان کے قیام کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔

بابائے اردو سے ملاقات سے پہلے آپ کی مصروفیت؟

۱۹۳۰ء میں (رہی) تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ناگ پور کے انجمن حامی اسلام کے ہائی اسکول میں عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اسکول میں میرا منصب ”ہیڈ مولوی“ کا تھا کیوں کہ عربی فارسی اور اردو کے ایک اور مدرس بھی تھے جن کی تنخواہ اور میری تنخواہ اگرچہ برابر برابر تھی لیکن اسکول کے رجسٹر میں ان کا منصب ”سکینڈ مولوی“ کا تھا۔

ناگ پور کے انجمن حامی اسلام کی درس گاہ میں ۱۹۳۰ء میں میرا تقرر عربی کے استاد کی حیثیت سے ہوا تھا (لیکن) اسکول کی فضا مجھے کچھ راس نہ آئی اور ڈیڑھ سال ہی کی مختصر مدت میں اس ملازمت سے بیزار ہو گیا اور مستعفی ہو گیا۔

معلمی کے پیشے سے دستبرداری کے بعد آپ کے مشاغل کیا رہے؟

آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔۔۔۔۔۔ اسکول کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پہلے کچھ دنوں مطب کیا اور بعد میں اردو کا چھاپہ خانہ قائم کیا اور ”امید“ کے نام سے اردو کا ایک ہفتہ روزہ نکالا۔

”مطب اور صحافت“ کی کچھ تفصیل بتائیے:

اپنے ایک دوست سلام الدین خاں صاحب سے جو ناگ پور کے محکمہ ڈاک سے وابستہ تھے کچھ روپے قرض لے کر شہر کے ایک مسلمان محلے کے قریب ایک مکان

کرائے پر لے کر مطب شروع کیا اور اس میں وہ برکت ہوئی کہ ایک سال کے اندر ہی میں نے اردو کا ایک پریس قائم کر لیا۔ یہ شہر کا واحد اردو چھاپہ خانہ تھا۔ چھاپہ خانہ میں نے شہر کے بالکل وسط میں محلہ نال صاحب میں قائم کیا۔ یہ نیم پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے چھاپہ خانہ تھا اور اوپر میں خود رہتا تھا۔

جب چھاپہ خانے کا کام چل نکلا تو جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ”امید“ کے نام سے ایک ہفت روزہ اردو اخبار نکالنے کا ڈول ڈالا۔ کچھ دنوں کے بعد اخبار کو ناگ پور میونسپل کمیٹی کی جانب سے اشتہارات ملنے لگے۔ اس ضمن میں مولانا ابوالحسن ناطق گلاٹھوی نے جو برائے نام گلاٹھوی تھے لیکن پیدا بھی ہوئے تھے ناگ پور ہی میں اور وہیں کی خاک میں آج بھی آرام فرما ہیں۔۔۔۔۔ میری خاصی مدد کی۔

مولانا مرحوم مرزا داغ مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں تھے لیکن کئی سال سے ناگ پور میونسپلٹی کے رکن منتخب ہو رہے تھے۔ محلہ نال صاحب میں میرے گھر کے قریب ہی ناگ پور میونسپلٹی کے ایک مسلمان رکن جناب محمد ابراہیم خان فنا رہتے تھے۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے ان سے بھی یاد اللہ ہو گئی۔ یہ ناگ پور میونسپلٹی کے بڑے جان دار ممبر تھے۔ ان کی دیانت اور انصاف پسندی کی وجہ سے میونسپلٹی کے ہندو اراکین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔

ناگ پور میونسپل کمیٹی سے جب کبھی ”امید“ میں درج شدہ اشتہارات کے بلوں کے ادا ہونے میں دیر ہو جاتی تھی تو خان صاحب میری بڑی مدد کرتے تھے۔ غرض کہ چھاپہ خانے اور اخبار کی آمدنی سے ملازمت چھوڑنے کے بعد میرے دن آرام سے کٹنے لگے اور میں نے مقامی اور ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا جس کی وجہ سے بعد میں مجھے بڑی مشکلات سے بھی دو چار ہونا پڑا۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ وہیں دو بار سرکاری مہمان خانے کی بھی سیر کی۔

اچھا، حکیم صاحب اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں کچھ بتائیے:

موجودہ مصروفیت (۱۹۷۵ء): خانہ نشینی کے سوا کچھ نہیں۔۔۔۔۔ یہاں (۱۹۴۷ء

کے بعد) کراچی پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ”نئی دنیا“ کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا جو کئی ماہ تک کامیابی سے چلا لیکن کچھ تو میری تلون مزاجی اور کچھ کارکنوں کی بے پروائی سے بند ہو کر رہ گیا۔ اس اخبار کے بند ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ”نقاش“ کے نام سے دوسرا ہفتہ وار اخبار نکالا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو ”نئی دنیا“ کا ہو چکا تھا۔

کچھ دنوں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے پندرہ روزہ ”قومی زبان“ کا بھی ایڈیٹر رہا لیکن یہ خدمت بالکل اعزازی تھی۔ تقریباً ایک سال تک روزنامہ ”انجام“ (دور ثانی) کراچی کا بھی اسٹنٹ ایڈیٹر رہا۔

کراچی میں اسلامیہ کالج، نیشنل کالج، نیشنل سٹی کالج اور بنی باغ کالج میں عربی، فارسی، اردو اور تاریخ اسلام کے لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔۔۔۔۔ ایک سال تک نیشنل سٹی کالج کراچی کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی کام کیا۔۔۔۔۔ کالجوں کے سرکاری تمویل میں آنے کے بعد تعلیم و تدریس کے شغل کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔

بابائے اردو سے آپ کی پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی لیکن آپ کا احساس ہے کہ یہ ملاقات صاحب سلامت کی حد سے آگے نہ بڑھی۔۔۔۔۔ پھر بعد میں آپ ان سے بے حد قریب ہوئے اور وہ آپ پر حد درجہ اعتماد کرنے لگے۔ اس حوالے سے آپ تقسیم ہند سے قبل تک بابائے اردو سے اپنے مراسم اور تعلق کی نوعیت پر روشنی ڈالیے:

تقسیم ہند سے قبل بابائے اردو مرحوم سے میرے تعلق کا آغاز اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کے مقدس کام سے ہوا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر امبید کار ہندوستان کے اچھوتوں کے مشہور لیڈر تھے۔ وہ ماہر قانون دان اور کامیاب بیرسٹر تھے ۳۳۔۔۔۔۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ اور ان کے پیرو جلد ہی ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیں گے۔ اگرچہ ڈاکٹر امبید کار کا یہ اعلان جیسا کہ بعد کے حالات اور واقعات سے ثابت ہوا، خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ تھا لیکن تھا تو بہر حال ایک انقلابی اعلان۔ (اس اعلان سے) نہ صرف ہندوستان کے عیسائی مشنوں بلکہ یورپ اور امریکہ کے عیسائی تبلیغی

اداروں میں اچھی خاص مل چل پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے سکھ بھی اس صورت حال اور اس کے مفروضہ نتائج کے زیر اثر میدان میں کود پڑے۔

ناگ پور اچھوتوں کی ایک شاخ میاروں بڑا مرکز تھا۔ میاروں کو دکن کے بعض علاقوں میں ڈھیز بھی کہتے تھے۔ ناگ پور کے میاروں کے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد کپڑے کے کارخانوں میں کام کرتی تھی۔ میرے چھاپے خانے میں بھی کچھ میار لڑکے اور نوجوان کام کرتے تھے۔ ناگ پور کے اچھوت خصوصاً میار ڈاکٹر امبید کار کی اس ”مذہب چھوڑ“ تحریک میں پیش پیش تھے۔ اس ”مذہب چھوڑ“ تحریک کو وہ مرہٹی زبان میں ”دھرمانتر“ کہتے تھے اور ناگ پور اس ”دھرمانتر“ تحریک کا اچھا خاصہ مرکز بن گیا تھا۔

یہ تحریک ابتدا میں تو دکن تک محدود تھی بعد میں شمالی ہندوستان تک پھیل گئی اور لکھنؤ اور آس پاس کے اچھوت لیڈروں نے لکھنؤ میں اسی مقصد کے پروگرام کو آخری شکل دینے کے لیے ایک آل انڈیا اچھوت کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ مجھے بھی اپنے پریش کے مرہٹہ کارکنوں کے ذریعے اس تحریک سے اچھی خاصی دل چسپی پیدا ہو چلی تھی۔ اس لیے میں نے طے کیا کہ اس کانفرنس میں شرکت کی جائے۔

میں نے اس کا ذکر اپنے مخلص کرم فرما اور صاحب دل رئیس نواب محی الدین خاں صاحب مرحوم سے کیا، جو اس علاقے کے سب سے بڑے مسلمان زمیندار اور تعلقہ دار تھے۔ انہوں نے میری اسکیم سے مکمل اتفاق کا اظہار کیا اور پھر باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ ناگ پور سے ایک لاری کے ذریعے ناگ پور اور ملحقہ علاقوں کے ان اچھوت لیڈروں کو لے کر جو اسلام اور اسلامی خیالات و نظریات سے کسی حد تک اتفاق اور ہمدردی رکھتے تھے، لکھنؤ کی کانفرنس میں ضرور شرکت کی جائے۔

نواب محی الدین خاں صاحب مرحوم نے آنے جانے کے پٹرول کے مصارف اور شرکائے سفر کے قیام و طعام اور دیگر مصارف کا ذمہ لیا۔۔۔۔۔ اور ناگ پور ہی کے چند ان مسلمانوں نے جو لاریوں اور بسوں کے مالک تھے اور جن کی لاریاں اور بسیں

صاحب کی ملاقات ہو گئی تھی اور انہوں نے سب کچھ بابائے اردو کو بتا دیا تھا۔
 بابائے اردو مرحوم نے اس سلسلے میں مجھ سے تنہائی میں کئی بار گھنٹوں باتیں
 کیں۔ میں نے یہ طریقہ کار طے کیا تھا کہ اگر مسلمان براہ راست اس معاملے میں ہاتھ
 ڈالیں گے تو اونچی ذات کے ہندو ہوشیار ہو جائیں گے اور پھر ان کے سرمایہ دار اپنی
 دولت کے بل بوتے پر ہماری ساری کوششیں ناکام بنا دیں گے۔۔۔۔۔ اس لیے جو کچھ
 کرنا ہے وہ ان اچھوت لیڈروں کی معرفت کیا جائے جو اسلام کی طرف مائل ہیں۔

ان اچھوت لیڈروں میں سب سے زیادہ پر جوش اور مخلص بابا اشت پاون
 تھے۔ یہ وردھا کے رہنے والے تھے۔ آتش بیان مقرر اور ہندو دھرم کی چھوٹی سے چھوٹی
 تفصیلات سے بھی واقف تھے۔ بابا اشت پاون بظاہر اچھوت اور ہندو تھے لیکن وہ بطور
 خود اسلام قبول کر چکے تھے۔۔۔۔۔ تو بابائے اردو کے مشورے سے طے پایا کہ جو کچھ بھی
 کرنا ہے وہ بابا اشت پاون کے توسط سے کیا جائے اور پھر ہمارا کارواں اسی راہ پر چل
 پڑا۔

بابائے اردو کا آپ کی اس مساعی میں جسے دراصل تبلیغ اسلام کی ایک مخلصانہ
 کوشش کہنا چاہیے کیا کردار رہا؟ اور اس کے کیا اثرات اور نتائج مرتب
 ہوئے؟

بابائے اردو مرحوم نے اس مہم میں بھرپور اور جی کھول کر حصہ لیا اور اس سلسلے
 کے مصارف کا بڑا حصہ وہ برسوں اپنی تنخواہ سے اس طرح ادا کرتے رہے کہ کسی کو کانوں
 کان خبر نہ ہوئی۔۔۔۔۔ اس خاموش تبلیغ سے بڑا فائدہ پہنچا اور ناگ پور میں متعدد میار
 خاندان اسلام کی دولت سے سرفراز ہو گئے اور ناگ پور سے ملحق بعض دوسرے علاقوں
 کے اچھوت بھی بابا جی کے اثر سے اسلام سے آشنا ہو گئے۔ مثال کے طور پر تحصیل کوہی
 کے ایک گاؤں دلتور کے سارے اچھوت (میار) حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اگرچہ اس کی
 انہیں بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

ہماری بدبختی کہ اس کام کی بھنگ شمالی ہندوستان کی بعض پیشہ ور تبلیغی انجمنوں

اور بمبئی کے بعض موقع طلب مسلمان لیڈروں کے کانوں تک پہنچ گئی اور انہوں نے اپنے کارکن ناگ پور بھیجنے شروع کر دیئے اور جو کام آہستہ آہستہ خاموشی کے ساتھ ہو رہا تھا اس میں دھوم دھام اور دکھاوے کا عنصر غالب آ گیا اور اس طرح بابائے اردو مرحوم کی نجی امداد اور اعانت سے اب تک جو کام ہو گیا تھا آگے نہ بڑھ سکا۔۔۔ سرمایہ دار ہندوؤں کا کیا ذکر خود گاندھی جی مدافعت پر آمادہ ہو گئے اور ان کے اثر اور تلقین سے ہندو سرمایہ داروں نے اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے۔

میں نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی تھی۔ میں اور میرے چند احباب بابا اشت پاون کے ذریعے اس مہم کو آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہے تھے۔ یہ تبلیغی کام ایسی راز داری اور خاموشی سے ہو رہا تھا کہ خود میرے ہم کاروں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کام کے مصارف کہاں سے اور کیوں کر پورے ہو رہے ہیں۔

تو (جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا) تقسیم ہند سے قبل بابائے اردو سے میرے تعلق کا آغاز اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کے مقدس کام سے ہوا۔۔۔۔۔ اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کام کا سارا مالی بار بابائے اردو مرحوم نے اٹھایا اور اس طرح اٹھایا کہ ان کے انتہائی قریبی دوستوں کو بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ تبلیغ اسلام کے اس مشن میں حضرت عبدالحق سرفہرست ہیں وہی عبدالحق جنہیں خود بعض مسلمان بے دین ملحد اور دہریہ کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ میں تو اوپر بیان کیے ہوئے حالات کی روشنی میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عبدالحق :

تھا ولی پوشیدہ اور (کسی قدر) کافر کھلا!

اس تبلیغی سرگرمی میں ناکامی پر آپ کا اور بابائے اردو کا رد عمل کیا رہا؟ اس کے بارے میں اگر حافظہ ساتھ دیتا ہو تو کچھ بتائیے :

جب ہمارے اپنے لیڈروں اور مبلغوں کے ہاتھوں ہمارے کام کا خاموشی سے جاری رہنا مشکل ہو گیا تو میں نے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور حیدرآباد جا کر بابائے اردو مرحوم سے جی کھول کر باتیں کیں اور آخر کار وہ

بھی مرے ہم خیال ہو گئے کہ اب اس کام کا جاری رکھنا تقریباً محال ہو گیا ہے۔
مجھے اعتراف ہے کہ اس مشن میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔۔۔۔ لیکن اس
تھوڑے سے عرصے میں جو غیر معمولی کامیابیاں نصیب ہوئیں ان کی یاد اب بھی میرے
لیے سرمایہ افتخار ہے۔۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ بابائے اردو مرحوم کے لیے دل سے دعائیں
نکلتی ہیں کہ اللہ ان کی لغزشوں کو تائبوں، غلطیوں اور گناہوں سے درگزر کرے اور انہیں
جوار رحمت میں جگہ دے کہ ناگ پور، دلتور پار ڈی اور آس پاس کے کئی سواچھوت گھرانے
صرف ایک ان کی اخلاقی اور مالی امداد کے سہارے اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے اور
آج بھی وہ اور ان کی اولاد ناگ پور شہر اور آس پاس کے بعض دیگر علاقوں میں جرات
و استقلال سے اسلام کے دامن سے وابستہ ہے۔

میرے ذہن میں اس سلسلے میں بڑی بڑی اسکیمیں تھیں جن میں سے سب
سے بڑی اور اہم اسکیم یہ تھی کہ ناگ پور میں ایک تبلیغی کالج قائم کیا جائے جس کا سب
سے پہلا زینہ یہ تھا کہ فی الحال کم سے کم سواچھوت (میارجی) بچوں کی شمالی ہندوستان کے
کسی دینی مدرسے میں زیر تعلیم و تربیت رکھا جائے اور بابا اشت پاون داس کی امداد و
اعانت اور پیہم کوششوں سے سومعزز میاروں نے اپنے بچے ہمارے سپرد کر دیئے اور ہم
نے انہیں مدوہ (لکھنؤ) کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔۔۔۔۔۔ لیکن افسوس کہ بعض بے صبر
اور جلد باز کارکنوں اور استادوں کی سخت گیری اور سنگ دلی کی وجہ سے یہ خواب شرمندہ
تعبیر نہ ہو سکا۔

جب میں نے یہ ساری باتیں بابائے اردو مرحوم کو بتائیں تو انہوں نے مجھے
ایک انگریز انجمنیر کا یہ مقولہ سنایا کہ:

”مشرق میں کام کرنا گناہ ہے۔۔۔۔۔۔“

”اور ہم دونوں یعنی میں نے بھی اور تم نے بھی یہ گناہ کیا ہے!“
اس تبلیغی مشن کی ناکامی کے بعد آپ کے اور بابائے اردو کے تعلقات اور
روابط کس نوعیت کے رہے؟ مراسم ختم ہو گئے یا بڑھے؟

جب ہماری تبلیغی کوششیں ختم ہو گئیں تو نہ میں نے اپنے تعلقات بابائے اردو مرحوم سے قطع کیے اور نہ خود بابائے اردو مرحوم نے یہ گوارا کیا کہ وہ مجھ سے کنارہ کش ہو جائیں۔۔۔۔۔ چنانچہ اب میں نے ان کی تحریک ”تحفظ زبان اردو“ میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔

میں نے بابائے اردو مرحوم کے ساتھ ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔ ناگ پور، جبل پور، احمد آباد، بمبئی، مدراس، کالی کٹ، گوالیار، کراچی وغیرہ میں اردو کے تحفظ و ترقی کے ضمن میں بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کیں۔۔۔۔۔ تحریری اور تقریری مہمات میں ان کا ہاتھ بٹایا۔۔۔۔۔ اور پورے دس سال تک تحفظ اور ترقی اردو کے مشن میں ان کا شریک اور رفیق رہا۔ اس دس سال کی مدت میں صرف دو برس بابائے اردو مرحوم کے بے حد اصرار پر میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) سے پچھتر روپے ماہانہ کا معاوضہ قبول کیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی میں بابائے اردو کی مزاجی کیفیت کے بارے میں آپ کا تاثر؟

بابائے اردو مرحوم مجھ سے پہلے کراچی آچکے تھے اور یہاں انہوں نے انجمن ترقی اردو کا مرکز اور دفتر قائم کیا۔ دلی میں انجمن ترقی اردو پر جو جیتی تھی اس کا اثر بابائے اردو مرحوم پر بہت خراب پڑا۔ ان کی طبیعت میں افسردگی کے ساتھ چڑچڑے پن نے جگہ پکڑ لی۔۔۔۔۔ کام بہت بڑا اور سرمایہ کم۔۔۔۔۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بابائے اردو مرحوم ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے۔ ان کا عزم و حوصلہ اور قوت ارادی گرتے ہوؤں کے لیے زندگی اور امید کا پیام ہوتی تھی اور کہاں اب یہ حال کہ وہ خود دل برداشتہ اور ناامید ہو کر رہ گئے تھے۔

کراچی میں بابائے اردو کے پرانے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی کوئی یاد؟
خود یہاں بابائے اردو سے آپ کے مراسم اور تعلق کی نوعیت کیا رہی؟
بابائے اردو کے پرانے رفیقوں میں شعیب قریشی مرحوم، عبدالرحمن صدیقی مرحوم، سید تقی الدین مرحوم اور پیر سید حسام الدین راشدی کراچی میں تھے۔ انجمن ترقی

اردو کے لیے مکان اور دفتر کی فراہمی کے سلسلے میں پیر سید حسام الدین راشدی، حکیم محمد احسن اور پیر الہی بخش مرحوم نے بابائے اردو کی بڑی مدد کی۔

بابائے اردو کے دیرینہ رفیق کارسید ہاشمی فرید آبادی مرحوم بابائے اردو مرحوم کے ساتھ ہی انجمن کے دفتر میں موجود تھے۔۔۔۔۔ مگر افسوس کہ کراچی میں اورنگ آباد، حیدرآباد اور دہلی کی فضا نہ پیدا ہو سکی۔۔۔۔۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لوگ اپنی آباد کاری میں لگے ہوئے تھے۔ معاش ہے تو مکان نہیں، مکان ہے تو معاش نہیں۔ غرض کہ ایک افراتفری کا عالم تھا۔

اس عالم میں جب میں کراچی پہنچا تو بابائے اردو مرحوم نے بہ کمال مہربانی مجھے انجمن کے دفتر میں قیام کی اجازت دے دی اور پندرہ روزہ ”قومی زبان“ کی ایڈیٹری بھی سپرد کر دی۔ یہ کام میں اعزازی طور پر کرتا تھا۔ اب تک میں کراچی میں تنہا تھا، لیکن جب میری بیوی بچے ہندوستان سے یہاں پہنچ گئے تو مجبوراً مجھے انجمن سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی اور پیر سید حسام الدین راشدی کی عنایت سے مجھے لاڈکانہ کے ایک گاؤں طیب میں سرچھپانے کی جگہ مل گئی ہے اور میں دو تین سال تک وہیں رہا۔۔۔۔۔ کبھی کبھار آ کر بابائے اردو مرحوم سے مل لیا کرتا تھا۔

کراچی میں بابائے اردو کو اپنے بعض ساتھیوں سے شکایات پیدا ہوئیں۔ ان اختلافات کے بارے میں کچھ بتانا آپ پسند کریں گے؟

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر سر شیخ عبدالقادر مرحوم اور آنریری جنرل سیکرٹری بابائے اردو مرحوم تھے۔ شیخ صاحب کی وفات کے بعد بابائے اردو مرحوم انجمن کے صدر اور سید تقی الدین مرحوم سیکرٹری مقرر ہوئے۔ سید تقی الدین مرحوم بڑے باعمل انسان تھے۔ وہ نچلا بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ بابائے اردو مرحوم اور سید تقی الدین مرحوم کے باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے انجمن کے دفتر سے ملحقہ دو عمارتوں میں ”اردو کالج“ کا قیام عمل میں آیا۔

اب انجمن میں زندگی پیدا ہو چلی تھی۔ ہر وقت چہل پہل رہتی تھی لیکن اس کا

ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کالج کے مصارف کے سلسلے میں خود انجمن ترقی اردو کا ہزاروں روپیہ صرف ہو گیا اور اس طرح انجمن کے تصنیفی و طباعتی کام معرض التوا میں پڑ گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بابائے اردو مرحوم اور سید تقی الدین مرحوم کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ سید تقی الدین مرحوم انجمن کے سیکرٹری کے منصب سے مستعفی ہو گئے۔ بات یہیں تک ختم ہو جاتی تو بھی غنیمت تھا، لیکن اس کے شاخسانے بڑھتے ہی گئے۔ اس وقت ”اردو کالج“ کے پرنسپل میجر سید آفتاب حسن تھے۔ ان سے بھی بابائے اردو مرحوم کی ان بن ہو گئی۔ چند لوگ بابائے اردو کے ساتھ اور کالج کے اساتذہ اور شہر کے بہت سے بااثر لوگ میجر سید آفتاب حسن کے ہم نوا ہو گئے۔ اس اختلاف نے بڑی گھناؤنی شکل اختیار کر لی۔ الزام، جوابی الزام اور اخباروں میں موافق مخالف بیان بازی تک نوبت پہنچی۔

اسی دوران بعض ناگزیر حالات کی بنا پر لاڑکانہ سے پھر واپس کراچی آ گیا، لیکن انجمن کے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں انجمن کے معاملات سے خود کو الگ تھلگ رکھوں، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میں بابائے اردو مرحوم سے نہ ٹلون۔ چنانچہ کراچی میں رہتے ہوئے بھی تقریباً دو سال تک میں بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، جس کا بابائے اردو مرحوم کو بجا طور پر ملال تھا۔

بابائے اردو سے از سر نو آپ کا رابطہ پھر کب اور کن حالات میں ہوا؟
۱۹۵۶ء میں مجھے پتہ چلا کہ بابائے اردو مرحوم پشپش میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ایلوپیتھی، یونانی اور ہومیو پیتھک علاج کے بعد شکایت بدستور ہے۔ میں برسوں بابا اردو کے ساتھ رہ چکا تھا اور ان کا مزاج داں تھا۔ چھوٹی موٹی بیماریوں میں ان کا علاج بھی کیا کرتا تھا، چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔۔۔ بہت خوش ہوئے۔ علاج شروع کیا اور غذا میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ہفتہ عشرہ میں وہ صحت یاب ہو گئے۔ اب مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں چھوڑ کر نہ جاؤں۔ چنانچہ میں نے ان کے ساتھ رہنا شروع

کیا۔

ان ایام میں کون کون اصحاب بابائے اردو سے قریب تھے؟ اور بابائے اردو کی اردو کالج کے پرنسپل سے کنکشن کس درجے میں تھی؟

اس وقت بابائے اردو قوم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں جناب ڈاکٹر شوکت سزواری مرحوم، جناب حسرت حسین نجمی حال نیجنگ ڈائریکٹر، تھری اسٹار بیٹری، کراچی، جناب ابن انشاء، جناب شجاع احمد خاں زیبا حال پرنسپل، گورنمنٹ کالج ٹنڈو جام قابل ذکر ہیں۔ مشفق خواجہ ان دنوں انجمن ترقی اردو سے وابستہ تھے اس لیے وہ تو عام طور سے دن بھر ہی رہتے تھے۔

بابائے اردو مرحوم اور میجر آفتاب حسن صاحب پرنسپل اردو کالج کی کنکشن اب تک جاری تھی میں نے انتہائی کوشش کی کہ حالات سازگار ہو جائیں اور بابائے اردو مرحوم اور میجر آفتاب حسن صاحب کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں، لیکن ساری کوششیں اکارت گئیں بلکہ کچھ الٹا ہی اثر ہوا اور بابائے اردو مرحوم کو یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ میں میجر آفتاب حسن صاحب کا بھی خواہ اور ہم خیال ہوں۔۔۔۔۔ ادھر میجر آفتاب حسن صاحب بھی میری طرف سے کبیدہ خاطر ہو گئے۔۔۔۔۔ یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ بابائے اردو مرحوم کا ساتھ نہ چھوڑا کیوں کہ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھے جہاں انہیں بہر حال دن رات کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔

اختلافات کی کوئی حد آخر بھی تو ہوگی؟

اختلافات یہاں تک بڑھے کہ بابائے اردو مرحوم جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر تھے انجمن کے اردو کالج کی مجلس منتظمہ کے بھی صدر تھے۔۔۔۔۔ اردو کالج کی مجلس منتظمہ کی صدارت سے سبکدوش کر دیے گئے۔ اس طرح انجمن ہی کا قائم کردہ کالج، اب انجمن کا رقیب بن کر سامنے آ گیا اور مخالفت کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی اور بابائے اردو مرحوم اس حد تک بے دست و پا ہو گئے کہ ان کا وجود عدم برابر ہو کر رہ گیا۔

اختلافات کی اس دلدل سے بابائے اردو کے لیے کب اور کیونکر نکلنا ممکن ہو سکا؟

اس ناگفتہ عالم میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم جو مارشل لاء کے حاکم اعلیٰ تھے بابائے اردو کی دستگیری کو بڑھے اور انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ایک آرڈی نینس کے ذریعے اردو کالج اور انجمن ترقی اردو کی منظمہ مجلسوں کو توڑ کر ایک نئی کمیٹی نامزد کر دی۔ اس آرڈی نینس نے کم سے کم بابائے اردو مرحوم کے لیے وہی کام کیا جو پانی دھان کے سوکھے ہوئے کھیتوں کے لیے کیا کرتا ہے۔

حکیم صاحب! ایوب خاں مرحوم کا آرڈی نینس ۱۹۵۹ء میں آیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۶۱ء میں بابائے اردو کا انتقال ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان آخری برسوں میں آپ برابر ان کے رفیق اور دمساز رہے ان برسوں میں ان کے عزائم کیا تھے اور عام صحت کیسی تھی؟

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے آرڈی نینس کے بعد بابائے اردو مرحوم نے پھر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو مجتمع کرنا شروع کیا، لیکن اب وہ اٹھاسی سال کے ہو چکے تھے۔ توئی جواب دے، گئے تھے اور قوت عمل تقریباً مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کسی نہ کسی طرح دو ڈھائی سال تک ان کی زندگی کی گاڑی چلتی رہی لیکن ۱۹۶۱ء کے آغاز میں ان کی کمزوری، ناطقتی اور افسردگی نے انتہائی بھیا تک شکل اختیار کر لی۔

بظاہر وہ تندرست نظر آتے تھے، لیکن اندر ہی اندر گھلتے چلے جا رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غالباً ۳۔ مئی ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ ان کے بازوؤں پر پڑا تو مجھے یہ اندازہ کر کے انتہائی دہشت اور وحشت پیدا ہوئی کہ ان کے بازوؤں کا سارا گوشت تحلیل ہو کر رہ گیا ہے، صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔

اس صورت حال کو سنبھالنے میں آپ نے کیا کیا؟ ان کی تشویشناک علالت اور بالآخر ان کے مرض الموت کی کچھ تفصیلات ضرور آپ کے ذہن میں ہوں گی؟

اسی دن میں نے (یعنی ۳۔ مئی ہی کو) جناح سینٹرل ہسپتال (کراچی) کے ایڈمنسٹریٹر کرنل رشید صاحب کو فون کیا کہ اسپتال وارڈ میں بابائے اردو کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا جائے۔ کرنل صاحب بابائے اردو مرحوم کے نیاز مندوں میں تھے۔ انہوں نے ۵۔ مئی ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو مرحوم کو ہسپتال کے اسپتال وارڈ میں داخل کر لیا اور پھر یہاں کابل دو ہفتے کی مسلسل دیکھ بھال اور تشخیص کے بعد یہ طے پایا کہ بابائے اردو مرحوم جگر کے سرطان میں مبتلا ہیں۔۔۔۔۔ سرطان کا علاج اور پھر اس عمر میں محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔

جب کراچی میں افاقہ نہ ہوا تو فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم کی دعوت پر انہیں کراچی سے مری لے جایا گیا اور وہاں کے ملٹری کے کمبائنڈ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ بابائے اردو مرحوم زیادہ عرصے تک مری اور کچھ دنوں پنڈی کے ملٹری کمبائنڈ ہسپتال میں رہے۔ آخر جب زندگی کی کوئی امید نہ رہ گئی تو پھر میں انہیں ریل کے ذریعے کراچی لے آیا۔ یہاں وہ نیوی کے ہسپتال میں داخل ہوئے اور ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

۵۔ مئی ۱۹۶۱ء سے ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء تک دن رات ان کے ساتھ رہا اور جہاں تک ہو سکا میں نے ان کی تیار داری کی۔۔۔۔۔ ان تفصیلات کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کراچی میں بابائے اردو مرحوم کی زندگی بڑے ناسازگار حالات میں گزری۔ انہیں غیروں سے نہیں اپنوں سے رنج پہنچا۔ خدا جزائے خیر دے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کو کہ آخری عمر میں وہ ان کے کام آئے ورنہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان کا حشر کیا ہوتا۔

اس طرح تقسیم ملک کے بعد کراچی میں بابائے اردو مرحوم سے میرے تعلق کی نوعیت ان کی صحت سے زیادہ ان کی بیماری، علالت اور ان کی آخری گھڑیوں سے معلوم کی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔ پھر بھی میرے اطمینان کی خاطر یہی بہت کچھ ہے کہ کراچی میں ان کی بیماری اور موت دونوں میں آخر وقت تک میں ان کا رفیق رہا۔
خدا بخشنے بہت سی خوبیاں تمہیں مرنے والے میں!

(۳)

بابائے اردو: ”کسی نے سچ کہا ہے ’خانہ مروّت تباہ‘۔۔۔۔۔ ان کے (ایک پروردہ نوجوان) کے معاملے میں یہی ہوا۔ یہ شخص لکھنؤ کے ایک ممتاز خاندان کا تھا۔ بارہا ان تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے کسی ذریعہ معاش کے باوجود بڑی شان سے رہتا ہے۔ اسکی دیانت مشتبہ ہے۔۔۔۔۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ شریف زادہ ہے۔ گھر سے خوش حال ہے۔ وہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اس سے جلتے ہیں۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (سر سید احمد خان) ص ۳۴۱]

معین: مولوی عبدالحق کے پروردہ کسی نوجوان کا نام بتائیے؟ کن کن معاملات میں کون کون اصحاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کو یہ بتاتے تھے کہ وہ ”شریف زادہ“ قابل اعتماد نہیں؟

حکیم اسرار احمد: تقسیم ہند سے کچھ دنوں پہلے مولوی حامد علی صاحب ندوی مرحوم انجمن ترقی اردو (ہند) کے میمجر مقرر ہوئے۔ ان کے چھوٹے سالے کا نام سید عین الدین

جاتے تھے۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (سر سید احمد خاں) ص ۳۴۰]

معین: دوست کا اختلاف گوارا نہ کر سکتے اور اس ضمن میں ”اکثر“ عقل پر جذبات کے غالب آ جانے کی کوئی مثال یا مثالیں آپ کے ذہن میں تازہ ہوں تو ارشاد فرمائیے:

حکیم اسرار احمد: میجر سید آفتاب حسن سابق پرنسپل اردو کالج (کراچی) کے بزرگوں سے بابائے اردو مرحوم کے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات تھے اور اس قدیمی رشتے کی بنا پر بابائے اردو مرحوم میجر سید آفتاب حسن کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے اور جب میجر صاحب پہلے پہل کاکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اردو کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کراچی آئے تو کالج کے اساتذہ اور طلباء نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا تو بابائے اردو مرحوم نے بھی اس میں میجر صاحب کی انسانی، تعلیمی اور تدریسی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے انہیں ”آب دار تراشیدہ ہیرے“ سے تشبیہ دی۔

(لیکن) جب ان کے تعلقات عید عین الدین رضوی کی وجہ سے میجر صاحب سے کشیدہ ہو گئے تو بابائے اردو مرحوم اکثر ان کی خامیاں، کوتاہیاں اور فرودگزاہیں شمار کراتے ہوئے حد سے گزر جاتے تھے اور جذبات کی شدت میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہنے سے نہ چوکتے تھے جو ان کے شایان شان ہوتی تھیں اور نہ خود میجر صاحب سے ان کے ارتکاب کی توقع کی جاسکتی تھی۔۔۔۔۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی:

انجمن کا دفتر اور اردو کالج جس عمارت میں واقع ہے وہ ایک ہندو رفاہی ادارے کی تعمیر کردہ تھی۔ جب اس ادارے کے کارکن اور عہدہ دار وغیرہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان منتقل ہو گئے تو انہوں نے بہت سی ناکارہ فرسودہ اور پرانی چیزوں کے ساتھ ایک تباہ شدہ موٹر کا ڈھانچہ بھی چھوڑا تھا۔۔۔۔۔ اور یہ پرانا ڈھانچہ جس میں زنگ خوردہ لوہے کے سوا کچھ نہ تھا، عمارت ہی کے احاطے کی زمین میں گڑا ہوا تھا۔

جب عمارت کی صفائی ہوئی تو اساتذہ میں سے کسی کی نگاہ اس تباہ شدہ اور زنگ خوردہ ڈھانچے پر بھی پڑ گئی۔۔۔۔۔ اتفاق سے میجر صاحب نے ان دنوں اپنے مکان

بہار کالونی میں کچھ مرغیاں پال رکھی تھیں۔۔۔۔۔ نہ جانے انہیں کس نے مشورہ دیا کہ وہ اس تباہ شدہ اور زنگ خوردہ ڈھانچے کو اٹھوا کر اپنے گھر لے جائیں اور اس کو ٹھیک ٹھاک کر کے اور مرمت کرا کے مرغی کا ڈربہ بنوالیں۔ شامت اعمال سے میجر صاحب نے یہ بات مان لی اور اس منحوس ڈھانچے کو گاڑی پر لدوا کر اپنے گھر لے گئے۔

جب میجر صاحب سے اختلافات بڑھے تو بابائے اردو مرحوم نے اس ڈھانچے کے بارے میں وہ وہ شگوفے کھلائے کہ تو بہ ہی بھلی۔۔۔۔۔ یوں تو عام طور سے بابائے اردو مرحوم اور میجر سید آفتاب حسن کے مابین اس ”مہا بھارت“ کے دوران بہت کم لوگ بابائے اردو مرحوم سے ملنے جلنے کے لیے آئے تھے، لیکن اتفاق سے اگر کوئی بھولا بسرا اور بھٹکا اجنبی آ نکلتا تو بابائے اردو مرحوم، میجر آفتاب کی ”کارگزاریوں“ کی داستان سناتے ہوئے یہ ضرور فرماتے کہ:

”صاحب! حد ہو گئی کہ یہ پرنسپل (میجر سید آفتاب حسن) کالج کی ایک موٹر اڑا کر اپنے گھر لے بھاگا ہے اور یہ موٹر اب تک اس کے تصرف میں ہے۔۔۔۔۔“

نادائق لوگ بابائے اردو مرحوم کی زبان سے میجر صاحب کے اس ”سرقہ بالجبر“ کی داستان سن کر انگشت بدندان رہ جاتے۔۔۔۔۔ نئے لوگوں کو کیا معلوم کہ بابائے اردو مرحوم جس ”عجیب و غریب شے“ کو موٹر کا نام عطا فرما رہے ہیں وہ ایک زنگ خوردہ اور ناکارہ لوہے کے ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں!

○

بابائے اردو: ”مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے اور ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شایان شان نہ ہوتی تھیں“

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی) ص ۱۰۶]

معین: اس رائے کی تائید میں آپ کوئی واقعہ بتانا پسند کریں گے؟

تھے اور انجمن کے ”افسر مہانداری“ بھی تھے لیکن جب کبھی بابائے اردو مرحوم کو ان کی کسی کوتاہی پر غصہ آتا جو عام طور سے ”بے جا“ ہوتا تھا تو جو کچھ منہ میں آ جاتا کہہ گزرتے تھے۔ اور انجمن کے دفتر میں گھنٹوں زلزلے کا سماں رہتا۔

وہ نجی ملازموں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور انہیں مناسب معاوضہ بھی دیا کرتے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ بھی وہ اکثر سلوک کرتے رہتے تھے لیکن (کبھی کبھار) ان کے غیض و غضب سے انہیں بھی پناہ نہ ملتی تھی۔ ان کے پاس ایک بنگالی لڑکا امان نامی ملازم تھا۔ مہینے میں ایک آدھا بار اس بچارے کی وہ گت بنتی کہ خدا کی پناہ۔ ٹچیاں اور لکڑیاں ٹوٹ جاتیں لیکن وہ بھی اس بلا کا سخت جان تھا کہ بابائے اردو مرحوم کی بے محابا مار پیٹ کے بعد ویسا ہی چاق و چوپند نظر آتا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ انجمن کے ملازم اور کارکن اس آزمائش اور امتحان میں نہ پڑتے۔



بابائے اردو: ”دوست بھی ان کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن

اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (مولانا محمد علی جوہر) ص ۱۵۳]

معین: بچنے والے دوستوں کے کچھ نام بتائیے اور اپنے مشاہدے کے حوالے سے بچنے کے اسباب کی کچھ تفصیل بھی:

حکیم اسرار احمد: مولوی سید ہاشمی فریدی آبادی مرحوم بڑی حد تک بابائے اردو مرحوم کے تربیت یافتہ تھے اور نو عمری ہی سے ہر کام میں ان کے شریک اور ساتھی تھے لیکن میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا وہ بابائے اردو مرحوم کے قریب اور ان سے بے تکلف ہونے سے بچتے تھے صرف کام سے کام رکھتے تھے اور بس! کراچی میں قاضی احمد میاں اختر جو ناگزہی مرحوم انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد اور بابائے اردو مرحوم کے خاص دوستوں اور جاں نثاروں میں تھے۔ وہ ذی علم اور صاحب تصانیف تھے۔ بابائے اردو مرحوم ان کا بڑا خیال رکھتے اور کبھی کبھی جب موڈ میں

ہوتے تو انہیں ”جاگیردار صاحب“ کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن یہ اختر میاں مرحوم جو شاید بابائے اردو مرحوم کے مزاج داں بن گئے تھے ان سے زیادہ ربط و ضبط قائم کرنے سے ہمیشہ بچتے تھے اور کیوں نہ بچتے۔ انہیں اپنی عزت و آبرو عزیز تھی۔

رہے بچنے کے اسباب تو ان کا حاصل صرف یہ کہ بابائے اردو مرحوم نفسیاتی طور پر اس درجہ اشتعال پذیر طبیعت کے مالک تھے اگر مولوی نذیر احمد کی زبان میں ”بھک سے اڑ جانے والے مادے“ سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بابائے اردو مرحوم خود اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے اور انجمن کے کارکنوں سے یہی امید رکھتے تھے۔ ان کی ”سیماب وشی“ بھی ان کے رفیقوں کو ان سے زیادہ قریب ہونے سے روکتی تھی۔



بابائے اردو: ”آخر میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (مولوی محمد عزیز مرزا) ص ۶۳-۶۵]

معین: اس حوالے سے کچھ مثالیں؟

حکیم اسرار احمد: میں نے حیدرآباد دکن اور دہلی میں اس کی متعدد مثالیں دیکھی ہیں۔ ہندی اردو قصبے کے دوران جو لوگ بابائے اردو کے قریب ہو گئے تھے ان میں بنگلور ریاست میسور کے حکیم انامی اور ایک نوجوان علی شبر حاتمی تھے۔ حکیم انامی بابائے اردو مرحوم سے جتنی زیادہ محبت کرتے تھے اس سے زیادہ اس کی نمائش کرتے تھے۔ علی شبر بقول بابائے اردو مرحوم ایک صالح نوجوان تھے اور یہ بیچارے آنکھ بند کر کے بابائے اردو مرحوم کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہہ دیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ عقیدت مندوں کے اس جذبہ رفاقت و مودت کا نتیجہ خوشامد پسندی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

کراچی میں بھی بابائے اردو مرحوم اور میجر سید آفتاب حسن کی کشمکش کے دوران کچھ یہی کام ان کے چند جاں نثار کیا کرتے تھے جن میں بابائے اردو مرحوم کے

معتد خاص ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم، جناب حشمت حسین نجمی ڈائریکٹر تھری اشار بیٹری سیل کمپنی لمیٹڈ، جناب ابن انشا اور جناب شجاع احمد خاں زیبا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم، بابائے اردو مرحوم سے بڑی محبت رکھتے تھے اور بھول کر کسی معاملے میں ان سے اختلاف رائے کی جرات نہ کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے ہم خیال رفیقوں اور دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ بھائی ہم سب مولوی صاحب کے جاں نثاروں اور کنفٹس برداروں میں ہیں، ہمارا مسلک محبت اور وفا ہے۔ اسکے سوا ہم کچھ اور نہیں جانتے۔ پھر وہ جوش میں آ کر فارسی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

من و تو ہردو خواجه تاشانیم
بندہ بارگاہ سلطانیم

نجمی صاحب بھی جو خاصان بابائے اردو مرحوم میں تھے کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ میں نے انہیں بابائے اردو مرحوم سے اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ:
”مولوی صاحب! ہم تو صرف آپ کے نام لیوا ہیں۔ ہماری نہ اپنی کوئی رائے ہے اور نہ اپنا کوئی خیال۔۔۔۔۔۔ جو آپ چاہتے ہیں وہی ہم بھی چاہتے ہیں اور جو آپ آئندہ بھی چاہیں گے وہی ہم بھی چاہیں گے۔۔۔۔۔۔“

ظاہر ہے کہ یہ بات وہ غایت محبت کے جذبے میں کیا کرتے تھے لیکن انسان میں کمزوریاں بھی تو ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے بابائے اردو مرحوم میں یقیناً ”خوشامد پسندی“ کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔

نجمی صاحب یارانِ باصفا (ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم، جناب ابن انشا اور جناب شجاع احمد خاں زیبا وغیرہ) کے جھرمٹ میں اکثر مولوی صاحب مرحوم سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

ماقصہ سکندرودارا نہ خواندہ ایم
ازما بجز حکایت مہر و وفا میرس



بابائے اردو: ”لڑ جھگڑ کر خوشامد سے چاپلوسی سے غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (سر سید راس مسعود) ص ۲۱۰]

معین: لڑ جھگڑ کر خوشامد سے چاپلوسی سے کام نکال لینے کی الگ الگ کچھ مثالیں آپ کے حافظے میں متحضر ہوں تو کچھ ایسے واقعات بیان فرمائیے:

حکیم اسرار: بابائے اردو مرحوم برسوں حیدر آباد دکن میں رہے۔ سر اکبر حیدری مرحوم سے ان کے گہرے مراسم اور تعلقات تھے۔ متعدد بار ان کی زندگی میں ایسے موڑ آئے کہ انہوں نے سر اکبر حیدری مرحوم سے لڑ جھگڑ کر اپنا کام نکال لیا۔

اس ضمن میں مجھے خاص طور سے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ بابائے اردو مرحوم کے حکیم محمد اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم سے بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ دونوں بزرگ جامعہ ملیہ دہلی کے ارباب حل و عقد میں تھے۔ ایک بار جامعہ ملیہ دہلی کی مالا حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اس کے بند ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ یہ دونوں بزرگ دہلی سے اورنگ آباد بابائے اردو کے پاس آئے اور جامعہ ملیہ کی صورت حال ان کے گوش گزار کی۔

جامعہ ملیہ دہلی ایک قدم پرست ادارہ تھا اور ریاست حیدر آباد برطانوی حکومت کی وفادار تھی۔ کام بڑا مشکل تھا لیکن بابائے اردو مرحوم، حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کو بے نیل و مرام واپس بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ جب حکیم صاحب مرحوم اور ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنے مشن کے سلسلے میں اورنگ آباد پہنچے تو بابائے اردو مرحوم سخت بخار میں مبتلا تھے اور انہیں ملیریا نے دبوچ رکھا تھا۔ ملیریا اور پھر دکن کا ملیریا۔۔۔۔۔ بلا کا شدید اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن بابائے اردو مرحوم اسی حال میں کبل لپیٹے ہوئے اورنگ آباد سے حیدر آباد پہنچے اور سر اکبر حیدری مرحوم سے ملے۔ سر اکبر حیدری مرحوم بابائے اردو مرحوم کو بخار میں مبتلا دیکھ کر گھبرا گئے اور

انہوں نے بابائے اردو مرحوم سے بخار کی حالت میں اورنگ آباد سے حیدر آباد تک سفر کرنے کی ضرورت معلوم کرنی چاہی۔۔۔۔۔ بابائے اردو مرحوم نے جامع ملیہ دہلی کی سقیم مالی حالت اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے اورنگ آباد آنے کا بیان کیا۔

سراکبر حیدری مرحوم بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ جامعہ ملیہ کا ادارہ حکومت ہند کے خلاف سرگرم عمل رہتا ہے اور ریاست حیدر آباد برطانوی حکومت کی دست نگر ہے۔ اس لیے کسی قسم کی امداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن بابائے اردو مرحوم کہاں پر ڈالنے والے تھے۔ وہ اسی بخار کی حالت میں گھنٹوں سراکبر حیدری مرحوم سے برس پر پکار رہے۔ آخر بیگم حیدری مرحوم کو دخل دینا پڑا اور سراکبر حیدری مرحوم بابائے اردو کے لڑکے جھگڑنے کی تاب نہ لاسکے۔ بادل ناخواستہ انہوں نے پچاس ہزار کی امدادی رقم منظور کی۔

اسی طرح جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) میں شعبہ اردو کے تقرر کے سلسلے میں انہیں یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے بڑی تاریخی جنگ کرنا پڑی۔ بابائے اردو نے اس اسامی کے لیے پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم کا نام پیش کیا تھا اور پروفیسر وحید الدین سلیم کے پاس کوئی بڑی ڈگری تو کجا معمولی سند بھی نہ تھی، لیکن بابائے اردو مرحوم یکا و تنہا برابر جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے سربراہوں نے سپر ڈال دی اور جناب وحید الدین سلیم مرحوم جامعہ عثمانیہ میں شعبہ اردو کے صدر مقرر ہو گئے۔

اس تقرر کے سلسلے میں جب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے یہ عذر پیش کرنے کی جرات کی کہ جناب وحید الدین سلیم کے پاس وہ ڈگریاں نہیں، جو اس منصب کے لیے یونیورسٹی کے آئین کی رو سے ضروری اور لازمی ہیں تو بابائے اردو مرحوم نے فرمایا کہ اس یونیورسٹی کے سارے اساتذہ کی ڈگریاں زمین پر بچھا دی جائیں اور وحید الدین سلیم ان پر اپنا پاؤں رکھ دیں تو شاید پھر یہ ڈگریاں مستند اور معتبر خیال کی جاسکیں۔

کچھ اسی قسم کے خیالات ان کے حافظ محمود شیرانی مرحوم سابق پروفیسر اور پینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بارے میں بھی تھے۔ شیرانی مرحوم کے پاس بھی کوئی قابل ذکر ڈگری نہ تھی لیکن بابائے اردو مرحوم نے بار بار مجھ سے فرمایا کہ اس وقت پورے ملک میں تحقیق و تنقید کا حق صرف شیرانی ادا کرتے ہیں اور وہی ادا کر سکتے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے محقق اور نقاد ان کے سامنے بونوں کی سی حیثیت نہیں رکھتے۔۔۔۔۔ ایک بار جب ان سے کسی نے کہا کہ ”کیا آپ بھی انہیں بونوں کی صفت میں شامل ہیں“ تو بابائے اردو مرحوم نے برجستہ جواب دیا کہ ”میں تو ان کی خاک پا بننے کا بھی اہل اور مستحق نہیں۔“ صاحبان علم کی شان یہی ہوتی ہے۔

وہ حیدرآباد میں لوگوں کو ملازمت دلانے کے سلسلے میں خوشامد اور چالپوسی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ ریاست میں ”ملازمتوں کے دلال“ کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ وہ صاحب غرض لوگوں کا کام نکالنے کے سلسلے میں وزیروں، امیروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اہل کاروں سے بھی التجا کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

○

بابائے اردو: ”وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (سر سید راس مسعود) ص ۲۰۱]

معین: اس حوالے سے کوئی یاد؟ مثال؟

حکیم اسرار: دوستوں سے بہلا پھسلا کر کام نکال لینے کے سلسلے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس کا تعلق خود مجھ سے ہے۔۔۔۔۔ انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کے مارشل لاء کے زیر انتظام آنے کے بعد مارشل لاء کی مقرر کردہ کمیٹی نے سید عین الدین رضوی پر ایک فرد جرم عائد کر دی بابائے اردو مرحوم سید عین الدین رضوی کے بڑے ہمدرد تھے۔ بابائے اردو مرحوم چاہتے تھے کہ اس فرد جرم کا مناسب اور معقول جواب دیا جائے لیکن قباحت

یہ تھی کہ ان کے عقیدت مندوں میں کوئی اس کام پر آمادہ نہ ہو سکا۔۔۔۔۔ آخر بابائے اردو مرحوم کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی اور انہوں نے بڑی لجاجت سے مجھ سے کہا:

”حکیم صاحب! اب تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔ سید عین الدین رضوی پر میری ہی وجہ سے یہ آفت آ پڑی ہے۔۔۔۔۔ اب اسکی نہیں میری عزت تمہارے ہاتھ ہے“

میں بابائے اردو مرحوم کے اس مایوسانہ طرز کلام کی تاب نہ لا سکا۔۔۔۔۔ اور پھر میں نے اپنے ایک کرم فرما وکیل کے ذریعے فرد جرم کا شانی جواب لکھوا کر اور ٹائپ کرا کے بابائے اردو کو نذر کیا۔۔۔۔۔ بہت خوش ہوئے اور اس طرح میری تعریف و توصیف کی جیسے کوئی غرض مند صاحب معاملہ کسی حاکم مجاز کی کرتا ہے۔



بابائے اردو: ”ان کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب ان کے خیراندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دنیاوی اعتبار سے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی لیکن انہوں نے وہی کیا جو ان کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرات سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (سر سید احمد خاں) ص ۳۳۷]

معین: اس قول کی تائید میں کچھ واقعاتی شہادتیں؟

حکیم اسرار احمد: اس ضمن میں صرف ایک ہی واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ بابائے اردو مرحوم جب عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد پروفیسر عنایت اللہ مرحوم کی وفات کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے ناظم مقرر ہوئے تو اسی اثناء میں ریاست جے پور کے ایک صاحب حیدر آباد تشریف لائے اور انہوں نے فارسی میں میر عثمان علی خاں مرحوم کی شان میں ایک قصیدہ لکھا، کسی طرح انہیں میر عثمان علی خاں مرحوم کی بارگاہ

میں رسائی ہوگئی اور انہوں نے شاہ عالی جاہ کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا۔ میر عثمان علی خاں مرحوم قصیدہ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔۔۔۔۔ اور انہوں نے معمولی کاغذ کے ایک چھوٹے پرزے پر بابائے اردو مرحوم کے نام ایک فرمان لکھا کہ ”حامل ہذا“ کو دارالترجمہ میں کسی مناسب اسامی پر مقرر کر دیا جائے۔

حیدر آباد (دکن) کا دستور تھا کہ امراء اہل کار، خواص اور عوام سب شاہی فرمان کا شایان شان احترام کرتے تھے اور ”بادب با ملاحظہ اور ہوشیار“ ہو کر تسلیمیں بجا لاتے تھے۔ بابائے اردو مرحوم نے اس دستور کی پابندی نہ کی اور فرمان جے پوری بزرگ سے لے لیا۔۔۔۔۔ جب انہیں ضروری کاموں سے فرصت ہوئی تو انہوں نے شاعر گرامی کو دفتر میں طلب کر کے یہ پوچھا کہ وہ عربی، انگریزی، فارسی یا یورپ کی کسی دوسری زبان سے واقف ہیں تو انہوں نے صرف فارسی جاننے کی حامی بھری۔

بابائے اردو مرحوم نے انہیں کسی فارسی کتاب سے ایک پارہ اردو میں ترجمہ کرنے کو کہا۔ ترجمہ کرنے کو تو انہوں نے کر دیا، لیکن وہ اتنا غلط سلط تھا کہ بابائے اردو مرحوم نے شاہی فرمان ہی کے ایک گوشے میں لکھ دیا کہ درخواست گزار کسی اسامی کا اہل نہیں۔ جے پوری شاعر شاہی فرمان لے کر بڑی امیدوں کے ساتھ آئے تھے لیکن جب بابائے اردو مرحوم نے انہیں ٹکاسا جواب دے دیا تو وہ غصے میں بیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھے اور شاہ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

میر عثمان علی خاں شاعر کی زبان سے اپنے فرمان کی توہین کی روداد سن کر آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے بابائے اردو مرحوم کو ریاست حیدر آباد سے خارج کرنے کا فرمان صادر کر دیا۔ بابائے اردو مرحوم نے انتہائی عجلت میں اپنا ذاتی سامان اور کتابیں سکندر آباد اسٹیشن پر بھجوا دیں۔ جب حیدر آباد کے امراء و وزراء اور ریاست کے بھی خواہوں کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ دوڑے دوڑے بابائے اردو مرحوم کے پاس آئے۔ ان سب نے اور خاص طور سے نواب فخر یار جنگ مرحوم نے جو اس وقت مالیات کے وزیر تھے بابائے اردو مرحوم کو طرح طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے

فیصلے پر نظر ثانی کر لیں اور شاعر کو دارالترجمہ میں جگہ دے دیں۔ جب ساری دلیلیں اور اپیلیں بے کار گئیں تو آخر میں نواب فخر یار جنگ مرحوم نے زچ ہو کر بابائے اردو مرحوم سے کہا:

”مولوی صاحب! اس ریاست میں سینکڑوں گدھے پرورش پا رہے

ہیں۔ ایک گدھا آپ بھی اپنے محکمے میں رکھ لیجئے۔۔۔۔۔“

مولوی صاحب نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ:

”قبلہ نواب صاحب! اس گدھے کو آپ اپنے طویلے میں باندھ

لیجئے۔ شاہ کے فرمان کی تعمیل بھی ہو جائے گی اور شاید میری جلاوطنی

کا حکم بھی واپس لے لیا جائے۔۔۔۔۔“

غرض کہ دو تین روز تک ایوان حکومت میں ہنگامہ برپا رہا۔ جب بابائے اردو

مرحوم راہ رست پر نہ آئے تو پھر وزیروں، امیروں، درباریوں اور بااثر شہریوں نے اجتماعی

طور سے شاہ عالی جاہ سے اپیل کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے خارج الزیاست کرنے کا

فرمان واپس لے لیا جائے۔ آخر میر عثمان علی خاں مرحوم نے ان کی گزارش قبول کر لی۔

شاعر کو نقد انعام سے نوازا گیا اور بابائے اردو مرحوم کو ریاست سے خارج کرنے کا

فرمان منسوخ کر دیا۔۔۔۔۔ بابائے اردو کی کامیاب زندگی میں ان کے اس کردار کا بھی گہرا

اثر پڑا ہے۔



بابائے اردو: ”جن لوگوں نے ان سے برائی کی انہوں نے اس

کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی

موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر انہوں نے دشمنوں کو

نوازا۔۔۔۔۔“ [چند ہم عصر: (مولوی محمد عزیز مرزا) ص ۶۴]

معین: حکیم صاحب! اس حوالے سے کچھ مثالیں آپ کے حافظے میں محفوظ ہوں گی؟

حکیم اسرار احمد: اس کی متعدد مثالیں میرے حافظے میں موجود ہیں لیکن طوالت کے

خوف سے انہیں نظر انداز کرتا ہوں اور صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔
اس سے ان کے کردار کی اس خصوصیت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا۔

ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک ادبی اجتماع میں بابائے اردو مرحوم نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء اساتذہ اور کارفرماؤں کو اردو کے بارے میں ان کی بے بسی اور بے تعلقی پر ہمدردانہ ملامت کی تھی۔ بابائے اردو مرحوم علی گڑھ کے نامور فرزندوں میں تھے اور سرسید مرحوم اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ سے اردو کی ترقی اور تحفظ کا جو نعرہ بلند کیا تھا وہ ان کے پیش نظر تھا اسی بنا پر انہوں نے ایک مخلص بزرگ کی طرح علی گڑھ والوں کی سرزنش کی کہ انہیں اپنا فرض پہچاننا چاہئے۔

بابائے اردو مرحوم کی اس سرزنش کو علی گڑھ کے بعض بااثر اساتذہ نے خاص طور پر اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ان کے رفقاء کار اور جامعہ ملیہ دہلی کے بعض بااثر لوگوں نے اتنی سی بات پر بابائے اردو مرحوم کے خلاف اچھا خاصہ محاذ بنا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس اختلاف نے دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ ملنا جلنا تو دور رہا، صاحب سلامت تک بند ہو گئی۔ اگرچہ کچھ دنوں پہلے تک پروفیسر رشید احمد صدیقی بابائے اردو مرحوم کے چند ممتاز عقیدت مندوں میں تھے۔

اسی اثناء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو ریڈر کی اسامی خالی ہوئی۔ درخواست گزاروں میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر سید احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور بھی تھے اس اسامی کے انتخاب میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ آخر لکھنؤ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے بابائے اردو کو حکم مقرر کیا کہ وہ جس امیدوار کو بھی منتخب کریں گے یونیورسٹی اسے قبول کرے گی۔

میں ان دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا اور میرے تعلقات پروفیسر سید احتشام حسین سے مجلسانہ اور برادرانہ تھے۔ مرحوم بابائے اردو اکثر معاملات میں میری رائے کو وقعت دیتے تھے اس لیے مجھے بجا طور پر توقع تھی کہ پروفیسر احتشام حسین کے بارے میں بابائے اردو مرحوم میری سفارش منظور کر لیں گے۔

بابائے اردو مرحوم انتخاب کے سلسلے میں دو تین بار لکھنؤ تشریف لائے اور میرے پاس ہی ٹھہرے۔ میں نے بڑی صفائی سے اپنا مدعا پیش کیا۔ سب کچھ سننے کے بعد بابائے اردو مرحوم نے فرمایا کہ:

”حکیم صاحب! آپ کے دوست پروفیسر احتشام حسین یقیناً بڑے صاحب علم اور اس اسامی کے لیے ہر طرح موزوں ہیں لیکن اس کے لیے جو وقار متانت اور غور و فکر چاہیے وہ پروفیسر آل احمد سرور میں نسبتاً زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ جہاں تک تعلیم و تدریس کے فن (اور) معیار کا تعلق ہے وہ بھی پروفیسر آل احمد سرور کے حق میں ہے۔ بے شک پروفیسر آل احمد سرور (کا تعلق) میرے مخالفوں سے ہے لیکن علمی معاملوں میں ذاتی مخالفت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

اور پھر جیسا کہ انہوں نے کہا تھا، اپنا فیصلہ پروفیسر آل احمد سرور کے حق میں دیا۔ اگرچہ بابائے اردو مرحوم کے اس فیصلے سے ایک طرح میری سبکی ہوئی لیکن آخر میں میں مطمئن ہو گیا کہ اہل علم کی شان یہی ہونی چاہیے کہ وہ قوی علمی اور ادبی مسائل و معاملات میں ذاتیات سے بالاتر ہو کر فیصلے کیا کریں۔



بابائے اردو: ”(مولانا) مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے“

[چند ہم عصر: (مولانا محمد علی جوہر) ص ۱۵۲]

معین: اس قول کی تائید میں کوئی سند؟ یا مثالیں؟

حکیم اسرار احمد: بابائے اردو کی پوری زندگی مذکورہ بالا عبارت کا کھل منظر تھی۔ وہ متضاد

اوصاف کا مجموعہ تھے۔ ان کے کردار کا حال ان کی انتہا پسندی تھی۔ ان کی تحریریں بے شک اعتدال پسندی کی آئینہ دار ہیں لیکن جہاں تک ان کے عمل کا تعلق ہے اس میں دور دور تک اس رجحان کا پتہ نہیں ملتا۔

قاضی عبدالغفار مرحوم اردو کے صاحب طرز ادیب و انشا پرداز تھے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سفارش پر مولوی صاحب نے قاضی صاحب مرحوم کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور جب قاضی صاحب مرحوم حیدر آباد پہنچ گئے تو مولوی صاحب مرحوم نے ان کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ خود بھی ایک خطیر رقم دی اور مخلص دوستوں سے بھی روپیہ اکٹھا کیا اور پھر یہ ساری رقم قاضی صاحب مرحوم کو دے دی اور اس رقم سے انہوں نے حیدر آباد سے روزنامہ ”پیام“ جاری کیا۔ کہاں تو حیدر آباد پہنچنے کے ابتدائی دنوں میں قاضی صاحب مرحوم سے مولوی صاحب مرحوم کا یہ ہمدردانہ اور شریفانہ برتاؤ۔۔۔۔۔ اور کہاں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مولوی صاحب مرحوم ان کا نام سننے کے بھی روادار نہ ہوتے۔

اسی طرح سابق لطفی پریس دہلی کے مالک خان صاحب عبدالطیف خاں صاحب مرحوم پر جب وہ مائل کرم ہوئے تو انہوں نے اورنگ آباد دکن کا انجمن کا شاندار پریس انہیں اس شرط پر حوالے کر دیا کہ اس کی قیمت وہ آہستہ آہستہ انجمن کی کتابوں کی طباعت کی اجرت کے ذریعے قسط وار ادا کر دیں۔۔۔۔۔ لیکن جب وہ خان صاحب مرحوم سے ناراض ہوئے تو انجمن کے دفتر دریا گنج نمبر ۱ دہلی میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔

اسی طرح پٹنہ عظیم آباد (بہار انڈیا) کے قاضی عبدالودود سے بابائے اردو مرحوم کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے لیکن ایک موقع پر جب قاضی صاحب نے بابائے اردو مرحوم کے خلاف بہار میں ایک محاذ قائم کرنے کی کوشش کی تو بابائے اردو مرحوم نے اپنے بعض عقیدت مندوں کے ذریعے خود قاضی صاحب کے شہر پٹنہ میں ان کی امیدوں کا قلعہ مسمار کر کے رکھ دیا۔

مرزا اسماعیل مرحوم سابق صدر اعظم حیدرآباد دکن نے انجمن کی سالانہ امداد اسی بہانے رکوا دی کہ بابائے اردو مرحوم نے حساب کتاب کا گوشوارہ حسب قاعدہ پیش نہ کیا تھا۔۔۔۔۔ بابائے اردو مرحوم نے ان کے خلاف ایسا زبردست محاذ بنایا کہ مرزا صاحب مرحوم سارے ہندوستان میں رسوا ہو کر رہ گئے۔ انجمن کی ریاستی امداد بحال ہو گئی اور مرزا اسماعیل مرحوم حیدرآباد کی صدارت عظمیٰ کی مسند سے الگ ہو گئے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے بھی انجمن ترقی اردو ہند کی رقابت میں ”آل انڈیا اردو کانگریس“ کے نام سے ایک کل ہند انجمن قائم کرنے کا ڈول ڈالا۔ ریاست حیدرآباد کے بااثر لوگوں اور ریاست کے بڑے حاکموں نے جی کھول کر ان کی امداد کی جامعہ ملیہ دہلی کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور ان کے احباب نے بھی زور مرحوم کا ساتھ دیا لیکن بابائے اردو مرحوم نے کچھ ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ حیدرآباد میں ایک اجلاس کے بعد پھر آل انڈیا اردو کانگریس کا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات سے محو ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔ وہ بالکل آتش فشاں پہاڑ اور کلیخیر تھے کہ جس نے بھی ان سے ٹکرانے کی کوشش کی بکھر کر رہ گیا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانبہ بخشند خدائے بخشندہ

○

بابائے اردو: ”وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوا دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔۔۔۔۔“ [چند ہم عصر: (مولوی چراغ علی) ص ۴۰-۴۱]

معین: حکیم صاحب! اس ضمن میں کوئی دل چسپ یاد یا واقعہ؟

حکیم اسرار احمد: یہ بابائے اردو مرحوم کی ایسی خصوصیت ہے کہ پورے ملک میں مثل کے طور پر مشہور تھی۔ ایک بار دہلی میں پروفیسر حسن ریاض مرحوم آٹھ بجے شب کے بعد

ان سے ملنے دریا گنج نمبر ۱ میں تشریف لائے۔ وہ اس وقت مسلم لیگ کے روزنامہ ”منشور“ کے ایڈیٹر تھے اور زبان کے مسئلے میں بابائے اردو مرحوم سے کچھ وضاحتیں اور باتیں معلوم کرنے کے لیے آئے تھے لیکن بابائے اردو مرحوم نے ان سے ایسا سلوک کیا کہ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ:

”یہ شخص تو سخت کافر ہے۔۔۔۔۔“

○

بابائے اردو: ”بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی۔۔۔۔۔ مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوص دل سے تھی۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (پروفیسر ری ہٹ سک) ص ۳۷۳]

معین: کن خاندانوں سے راہ و رسم تھی۔۔۔۔۔ اور مراسم کی نوعیت کیا تھی؟

حکیم اسرار: بابائے اردو مرحوم کو جن دو تین خاندانوں سے راہ و رسم تھی ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم سابق صدر شعبہ عربی فارسی الہ آباد یونیورسٹی اور حیدر آباد (دکن) کے نواب منظور جنگ بہادر کا گھرانہ سرفہرست ہے۔ وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے بیٹوں میاں مسلم اور مسٹر زہیر صدیقی سے بالکل اپنے بیٹوں جیسی محبت رکھتے تھے۔

نواب منظور جنگ بہادر کے خاندان سے بھی ان کی دیرینہ محبت اور مودت تھی۔ مرض الموت میں بھی وہ بار بار نواب منظور جنگ کی صاحب زادی منیر بانو کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ انہیں کئی بار جناح ہسپتال میں بلوایا اور بڑی شفقت و محبت سے بات چیت کی۔

علی شہر حاتمی اور ان کی بیوی بچوں کا بھی نہیں بڑا خیال رہتا تھا۔ علی شہر حاتمی بعض ناگزیر حالات کے ہاتھوں پاکستان چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے گئے تھے ان کی عدم موجودگی میں بابائے اردو مرحوم ان کی بیوی بچوں کی مقدور بھرپور خبر گیری کرتے رہتے تھے۔۔۔۔۔ علاج کی غرض سے مری جانے سے پہلے انہوں نے علی شہر حاتمی کی بیوی کو غالباً ڈھائی سو روپے ماہانہ کے حساب سے چھ ماہ کے لیے پیشگی چیک

کاٹ دیئے تھے یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان پیشگی چیکوں سے صرف دو ماہ فائدہ اٹھا سکیں۔

ان کے ساتھ مری جانے والوں میں صرف میں تھا۔ روانہ ہونے سے دو دن پہلے انہوں نے مجھے ایک ہزار روپے کا چیک دیا کہ میں اپنی بیوی کو دے دوں۔۔۔۔۔ بہر حال وہ جن لوگوں سے لگاؤ رکھتے تھے ہمیشہ ان کا خیال رکھتے تھے۔ جن خاندانوں سے انہیں غیر معمولی انس تھا ان میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کا خاندان بھی تھا۔۔۔۔۔ بابائے اردو مرحوم نے اپنی زندگی کے چند آخری سالوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اس خاندان کی فلاح و بہبود کو اپنا اخلاقی اور انسانی (فرض) سمجھا اور بعض موقعوں پر سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی دل کھول کر مدد کی۔



بابائے اردو: ”یو۔ پی کے مہاجروں کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ پچاس سال میں فنا ہو جائیں گے۔ کیوں کہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں“
[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی) ص ۱۰۵]
”وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حُب جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے۔ اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسری بات کی پروا نہیں۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی) ص ۱۰۲-۱۰۳]

معین: حُب جاہ و مال اور روپیہ کمانے کو برا سمجھنا اور پھر ساتھ ہی تجارت کرنے کی تلقین کرنا متضاد بات تو نہیں؟

حکیم اسرار احمد: ان دونوں باتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ وہ تجارت کرنے کو برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ روپیہ بٹورنے کے انہماک کو غیر مناسب خیال کرتے تھے۔۔۔۔۔ وہ چاہتے

تھے کہ یو۔ پی کے مہاجر تجارت کی طرف توجہ کریں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ آئندہ نوکریوں کے امکانات تقریباً ختم ہو جائیں گے۔ لیکن تجارت کرنے کی تلقین کے ساتھ ہی وہ مہاجروں کو متنبہ بھی کرتے جاتے ہیں کہ تجارت کا مقصد آبرو منداناہ زندگی کے وسائل تلاش کرنا ہیں نہ کہ روپیہ بٹورنے کی ہوس میں پڑ کر اعتدال کو خیر باد کہہ دینا۔

بابائے اردو: ”شیعہ سنی کے جھگڑے کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ یہ پولیٹیکل جھگڑا ہے۔ (وہ اکثر اپنے رفیق کار حکیم اسرار احمد کریوی سے) ایک جرمن عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں (کرائیں) لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی) ص ۹۶]

معین: حکیم صاحب! اس جرمن عالم اور اس کی کتاب کا نام اگر یاد ہو تو بتائیے۔۔۔۔۔ کیا یہ کتاب انجمن کے کتب خانے میں موجود/محفوظ ہے؟

حکیم اسرار احمد: بابائے اردو مرحوم نے بار بار مجھ سے اس جرمن کتاب کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی خدمت انہوں نے ایک ایسے اردو داں کے سپرد کر دی تھی جو جرمن زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔۔۔۔۔ لیکن ان صاحب نے پھر اس کتاب کی رسید تک نہ دی۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ جرمن کتاب کا نام نہ مولوی صاحب مرحوم کو یاد رہا تھا نہ میں اس سے واقف ہو سکا۔ انجمن کے کتب خانے (خاص و عام) میں بھی اس کتاب کا نام و نشان نہیں۔

○

بابائے اردو: ”مرحوم ہندوستان کے مروجہ پردے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ نیز ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد زوجات کے حامی ہیں۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی) ص ۱۰۱]

معین: اس کی کچھ توجیح / توضیح یا تفصیل؟

حکیم اسرار احمد: بابائے اردو مرحوم اعلانیہ کہا کرتے تھے کہ پردہ عورت کے پورے جسم کو ڈھکنے اور چھپانے کا نام نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ پردے کی کچھ حدیں ہیں۔۔۔۔۔ مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔ مثلاً مرد کے پردے میں جسم کے وہ اعضاء شامل ہیں نماز میں جن کے چھپانے کا حکم ہے۔ اسی طرح عورت کے پردے کی حد بھی ہے کہ اس کی دونوں ہتھیلیاں، قدم اور چہرہ پردے کی حد سے آزاد ہیں۔

وہ تعدد زوجات کے سخت خلاف تھے اور جب انہوں نے سنا کہ شمالی ہندوستان کے ایک بڑے عالم دین اور مذہبی پیشوا نے پہلی بیوی کی موجودگی میں ایک نکاح اور کر لیا تو انہیں بہت رنج ہوا۔۔۔۔۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ کاش! یہ بزرگ تعدد زوجات کے سلسلے میں قرآن کریم کی ہدایت کو سامنے رکھتے۔

○

بابائے اردو: آخر زمانے میں ان کے بعض بے تکلف دوست

انہیں ”ایک شاندار انسانی کنڈر“ کہا کرتے تھے۔۔۔۔۔“

[چند ہم عصر (سید محمود) ص ۱۰]

معین: حکیم صاحب! یہ کون بے تکلف دوست تھے؟ کچھ نام بتائیے:

حکیم اسرار احمد: ان بے تکلف دوستوں میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم اور ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم قابل ذکر ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں سے بھی میں نے یہی جملہ سنا تھا، لیکن افسوس کہ ان کے نام (اب) کوشش کے باوجود یاد نہیں آ رہے۔

[تحریری سوال جواب

اکتوبر ۱۹۷۵ء]

حوالے اور حواشی :

- ۱- مشفق خواجہ صاحب کے ایک خط کے مطابق تاریخ وفات: ۲۔ جنوری ۱۹۹۱ء
- ۲- بابائے اُردو کے بارے میں حکیم اسرار احمد کریوی کی بعض نگارشات کے لیے دیکھیے:
- (i) بابائے اُردو طالب علموں کے لیے ایک مثالی نمونہ نوری عبدالحق نمبر جولائی ۱۹۶۰ء ص ۷۹-۸۱
- (ii) بابائے اُردو کا خط بنام حکیم اسرار احمد نوری ایضاً ص ۱۶۶-۱۶۷
- (iii) اُردو کا معمارِ اعظم سہ ماہی مجلس حیدرآباد دکن اکتوبر ۱۹۶۰ء جنوری ۱۹۶۱ء ص ۵۸-۶۸
- (iv) جنگ نامہ اُردو بابائے اُردو اور اعدائے اُردو:
- (a) روزنامہ انجام کراچی ۲۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۱۰
- (ب) ایضاً ۳۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۲
- (ج) ایضاً ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۶
- (د) ایضاً ۶۔ نومبر ۱۹۶۳ء ص ۳
- (v) جنگ نامہ اُردو قومی زبان اگست ۱۹۶۳ء ص ۶۱-۷۹
- ۳- حکیم صاحب کے داماد شبیر احمد صدیقی ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔
- ۴- برادر عزیز میجر مستعین الرحمن موجودہ مصروفیت: مدیر منتظم ہفت روزہ ہلال راولپنڈی
- ۵- حکیم صاحب کے شاگرد معروف محقق اور یونیورسٹی پروفیسر افتخار احمد صدیقی (ولادت: یکم اپریل ۱۹۲۰ء وفات: ۱۷۔ جون ۲۰۰۰ء)۔
- ۶- حکیم صاحب ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ناگپور میں استاد اور طبیب کی حیثیت سے مقیم رہے۔ دیکھیے:

مقدمہ ”انتخاب کلام سعید“ (ڈاکٹر انیس خورشید کے داداشی محمد سعید کامٹوی کے مطبوعہ بغیر مطبوعہ کلام کا انتخاب) مطبوعہ النور پبلشرز، کراچی ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۔

۷۔ فروری ۱۹۹۷ء میں برادر مہین الرحمن مرتضیٰ کے توسط حکیم صاحب کے صاحب زادے زہیر اکرم عدیم نے بتایا کہ حکیم صاحب ۱۹۳۸ء میں الہ آباد سے تھا کراچی آئے ۱۹۵۰ء میں اہل خانہ بھی کراچی آ گئے۔ طیب گاؤں نوڈیرو کے قریب ہے جہاں حکیم صاحب ۱۹۵۳ء تک رہے پھر بابائے اردو کی خواہش پر وہ کراچی آ گئے اور ”انجمن“ کے پریس سے وابستہ ہوئے جو آرام باغ جامع کلاتھ مارکیٹ کے عقب میں واقع تھا۔



ضمیمہ: حکیم اسرار احمد کریوی کے دو خط

①

یاد آتا ہے کہ حکیم اسرار احمد کریوی مرحوم نے یہ خط غالباً
اے ڈی اظہر (وفات ۲۳۔ فروری ۱۹۷۳ء) کے نام لکھ کر مرے
سپرد کیا تھا لیکن اسے پہنچانے کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ بہاول
نگر کالج میں بطور لیکچرار میرا تقرر نامہ کراچی پہنچا اس کے بعد ہی
میں نے بہاول نگر کے لیے رخت سفر باندھا۔ [معین الرحمن]

۱۱۔ اگست ۱۹۶۳ء

نیشنل کالج، ناظم آباد (کراچی)۔

کرمی و محترمی، تسلیم

کئی بار آپ کو خط لکھنے کی کوشش کی اور ایک دو بار جب یہ معلوم ہوا کہ آپ
کراچی تشریف لائے ہیں آپ سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن افسوس کہ دونوں باتیں نہ
ہو سکیں۔

حامل مکتوب معین الرحمن سلمہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ آج کل
یہ کراچی کے ترقی اردو بورڈ میں کام کر رہے ہیں لیکن اب کراچی کے ناسازگار حالات
سے مجبور ہو کر چاہتے ہیں کہ بہاول نگر میں جہاں ان کے والدین فی الحال مقیم ہیں رہنے
کی سہیل پیدا کریں۔

ان کی خوش قسمتی سے بہاول نگر کے کالج میں اردو کے ایک استاد کی جگہ کئی مہینے سے خالی ہے کیوں کہ کوئی شخص خوشی سے اس نجر مقام پر رہنے بسنے کے لیے آمادہ نہیں لیکن یہی بہاول نگر میاں معین الرحمن کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے کیوں کہ اب یہ ان کا وطن ہے۔ اسی سلسلے میں یہ لاہور پہنچ رہے ہیں۔ محکمہ تعلیمات کے سیکرٹری صاحب اور ڈائریکٹر صاحب بڑی آسانی سے مشکل کشائی کر سکتے ہیں۔

معین الرحمن صاحب سچے طالب علم ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم (بابائے اردو مولوی عبدالحق) بھی ان کی محنت اور ذہانت کے مداح تھے اور انہوں نے مرحوم کے بارے میں بعض بڑے اچھے مضامین لکھے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ ان کے بارے میں مستقل کتاب مرتب کریں۔ ایسے صالح اور علم کے پیاسے نوجوان ان دنوں عنقا ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان کی ہر ممکن امداد و اعانت فرمائیں گے۔

آپ کا خادم

(حکیم) اسرار احمد کریوی

(۲)

حکیم اسرار احمد کریوی نے کراچی آ جانے کے بعد اپنے سابق وطن الہ آباد کے پہلے سفر سے متعلق اس نجی خط میں بابائے اردو سے متعلق میری ایک کتاب کی فرمائش کی ہے جسے وہ اپنے ساتھ بھارت لے جانا چاہتے تھے۔ [معین الرحمن]

۱۷۔ مئی ۱۹۷۷ء

مکان نمبر ۱۰۸۲

بیر کالونی، کراچی۔ ۵

عزیز محترم معین اور معین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
ان چند سطروں کی شانِ نزول یہ ہے کہ میں یعنی ”حکیم اسرار احمد کریوی“

یہاں (کراچی) سے ۲۳۔ مئی ۱۹۷۷ء بروز پیر عوامی ایکسپریس سے پونے دس بجے صبح ساڑھے تین ساتھیوں کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ گاڑی دوسرے دن ۲۳۔ مئی ۱۹۷۷ء منگل کی صبح سات آٹھ بجے لاہور پہنچتی ہے۔ فی الحال لاہور ٹھہرنا نہیں بلکہ اسی روز ڈیڑھ بجے دوپہر کو ان شاء اللہ امرت سر کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور پھر اسی دن شام کو چھ بجے ایک گاڑی سے جس کا نام نانا ایکسپریس ہے الہ آباد سوار ہو جائیں گے۔

میرے ساتھ میری بیوی زہیرہ کی بیوی اس کا ایک چھوٹا بچہ ۳ ایک بوڑھی خاتون جن کے خاوند کا یہاں دو تین سال قبل انتقال ہو گیا تھا اور اب وہ میرے داماد انیس میاں ۳ کے ساتھ رہتی ہیں اور اپنی اکلوتی بیٹی سے ملنے کے لیے الہ آباد جا رہی ہیں۔ ہم لوگ پہلے پہل سابق وطن کا رخ کر رہے ہیں۔ یہاں کے بہت سے اعزاء اقربا نے اپنے وہاں کے عزیزوں کے لیے مختلف ساز و سامان سے ہمیں لاد دیا ہے انکار کی گنجائش نہ تھی۔ یوں تو ہمارا اپنا ہی سامان کم نہ تھا دوسرے عزیزوں کے تفویض کردہ سامان سے سونے پر سہاگے کی مثل صادق آگئی!

تم لوگ بہت دن سے لاہور میں رہتے ہو پھر ماشاء اللہ معین میاں شعبہ تعلیم سے متعلق ہیں یقیناً ان کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کا حلقہ وسیع ہو گا۔ بہر حال اسٹیشن پر تم دونوں بھائیوں کا پہنچنا لازمی ہے اور اس اعتبار و یقین کے ساتھ کہ کشم والوں کے ہاتھوں ہمیں خواہ مخواہ کی پریشانیاں نہ اٹھانی پڑیں۔

میں یہ خط پوسٹ بکس کی معرفت بھیج رہا ہوں۔ اللہ کرے تمہیں مل جائے اور یہ بھی دعا ہے کہ مقررہ تاریخ کو وہاں کرفیو وغیرہ کا جھنجھٹ نہ رہے۔۔۔۔۔ ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ مجھے معین میاں سلمہ کے اس مجموعے کی خاص طور پر ضرورت ہے جس میں ان کا وہ مضمون شائع ہوا ہے جو خود بابائے اردو مرحوم کے جملوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ میرے پاس یہ کتاب تھی لیکن جلدی میں تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ اللہ کرے تمہیں یہ خط وقت پر مل جائے۔ واپسی میں انشاء اللہ میں تمہارے پاس دو تین روز

ضرور ٹھہروں گا۔۔۔ معین میاں کی بیوی اور بچے کو بہت بہت دعائیں اور بے شمار پیار۔
دعا گو

اسرار احمد

حوالے اور حواشی :

- ۱۔ برادر عزیز: سید بین الرحمن، حال مقیم اسلام آباد۔
- ۲۔ حکیم صاحب کے نامور صاحب زادے زہیر اکرم عدیم، کراچی سے صوبائی اسمبلی کے ممبر رہے۔ ہاؤن برس کی عمر میں ۴۔ جون ۱۹۹۸ء کو کراچی میں دہشت گردوں کی گولی کا نشانہ بنے اور شہادت پائی۔
- ۳۔ ”چھوٹا بچہ“ سے مراد حکیم صاحب کے پوتے، یعنی زہیر اکرم عدیم کے بیٹے عمیر اکرم، جو فروری ۱۹۹۷ء میں بحریہ کالج، کراچی سے ایم بی۔ اے کر رہے تھے۔
- ۴۔ انیس احمد صاحب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ فروری ۱۹۹۷ء میں وہ ڈاکٹر اعظم کریوی کے صاحبزادے ڈاکٹر سلیم اعظم کے قائم کردہ اعظم میموریل ہسپتال، کراچی سے منسلک تھے۔
- ۵۔ ”ذکر عبدالحق“ طبع اول سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء۔



عزیز معین میاں، دُعا میں

آج مختصر خط ملا۔ ماموں سے معلوم ہوا تھا کہ گاڑی میں رش

بہت زیادہ تھا۔ تم نے نہیں لکھا کہ بہاول نگر پہنچنے تک کیا حال رہا؟

..... بابا کے پاس صبح سات بجے سے ایک ڈیڑھ بجے کے درمیان

رہتا ہوں۔ اُن کی صحت تدریجاً بحال ہو رہی ہے۔ میری خدمات میں

اخبارات، رسائل اور اُن کی نجی ڈاک پڑھ کر سنانا اور نخطوط املا کرانا

بطور خاص شامل ہیں۔ پچھلے دنوں اُنہوں نے ایک خط فیلڈ مارشل (محمد

ایوب خاں) صاحب کو بھی تحریر کرایا تھا۔

..... اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ یہ خط مئی میں تحریر کیا تھا

لیکن پوسٹ کرنے کی نوبت جون (۱۹۶۱ء) میں آ رہی ہے۔ ان چند

دنوں میں کوئی خاص بات مزید قابل ذکر نہیں.....

فقط، دُعا گو

متین الرحمن مُرتضیٰ

موصولہ بہاول نگر:

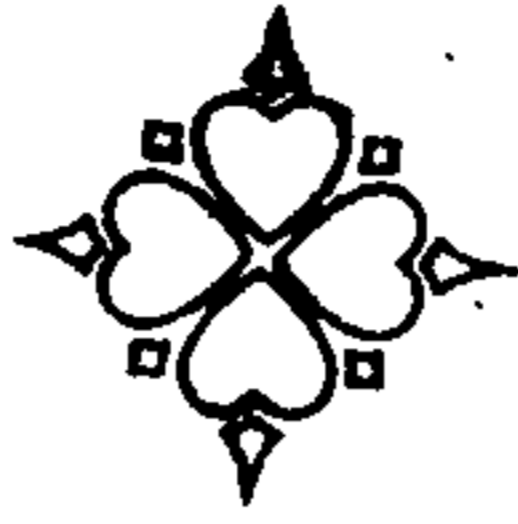
۸۔ جون، ۱۹۶۱ء



تبرکاتِ حق (بابائے اردو کی نادر تحریریں):



- ۱۲۔ قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین، ۱۸۹۶ء ۲۳۵
- ۱۳۔ غلامی، ۱۸۹۶ء ۲۳۹
- ۱۴۔ سر سید احمد خاں کی والدہ، ۱۹۱۲ء ۲۴۷
- ۱۵۔ گشتی کتب خانہ، مارچ ۱۹۳۵ء ۲۶۳
- ۱۶۔ میرا کتب خانہ، جون ۱۹۳۶ء ۲۷۳
- ۱۷۔ ”موازنہ انیس و دبیر“ — بابائے اردو کی قلمی تحریر ۲۸۳
- ۱۸۔ اردو زبان و ادب کے سات سو سال ۳۵۶-۳۰۱



..... کتاب میں شامل بابائے اردو کی بعض غیر مرتب نگارشات کی
 بازیافت میرے لئے سرمایہ فخر ہے۔ مولوی عبدالحق کے آثار کی جمع
 آوری کی یہ کوشش اور کاوش یقین ہے کہ پسندیدہ ٹھہرے گی۔
 — ڈاکٹر سید مصعب الرحمن

قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین

از:
مولوی عبدالحق

تحریر: ۱۸۹۶ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء) کی زیر نظر
 تحریر ان کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔ ”قسنطنیہ میں عورتوں
 کا ایک میگزین“ کے عنوان سے یہ رسالہ ”معلم نسواں“ جلد ۱۰، نمبر
 ۳ (سال ۱۸۹۶ء) میں پہلی بار چھپی۔ جب سر سید احمد خاں زندہ
 تھے اور مولوی عبدالحق ان کے مدرسہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔

رسالہ ”معلم نسواں“ کے قدیم و ناپید شمارے سے مولوی
 عبدالحق کی قیمتی تحریر کا عکس مجھے جناب عبدالصمد خاں (اردو-
 ریسرچ سیز، حیدرآباد دکن) نے فراہم کیا۔ ان کے دلی شکر بے
 کے ساتھ یہ نایاب قدیم تحریر ذیل میں محفوظ کی جا رہی ہے۔ اس
 مختصر مگر نادر تحریر سے مولوی عبدالحق کی روشن خیالی اور روشن ضمیری
 اور طبقہ نسواں کے بارے میں ان کی فکر مندی پر روشنی پڑتی ہے۔
 [ڈاکٹر سید معین الرحمن]

”ہم نہایت خوشی کے ساتھ اس خبر کو درج کرتے ہیں کہ قسنطنیہ میں ایک
 رسالہ صرف عورتوں کے لیے جاری ہوا ہے اس کا ایڈیٹر ایک ایسا شخص ہے جسے لڑکپن
 سے عورتوں کی حالت سے خاص دلچسپی تھی اور اس نے اس بات کا عزم بالجزم کر لیا تھا
 کہ جو کچھ ہو میں عورتوں کی بہبودی اور فلاح اور ان کی موجودہ حالت کی ترقی کے لیے
 جان توڑ کوشش کروں گا۔

اس باہمت شخص کا نام عبدالحق حمید بے ہے۔ پہلے طرابلس میں ایک طالب علم

تھا۔ اس کے ہاں مضمون نگار عورتوں کا ایک اسٹاف ہے جس میں سے ایک عورت نے نظم میں ایک عمدہ کتاب لکھی ہے جس سے اس کے خیالات کی متانت اور خوبی معلوم ہوتی ہے۔ اس رسالے کی اشاعت قریب ساڑھے تین ہزار کے ہے اور ہفتے میں دو بار نکلتا ہے۔ قسطنطنیہ اور سمرنا میں کم از کم پندرہ ایسی عورتیں ہیں جو اس میں لکھتی ہیں۔ یہ میگزین ترکی زبان میں لکھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کے ایسے بھاگ کہاں تھے کہ یہاں کی عورتیں اپنی بہنوں کی اصلاح کے لیے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھیں بلکہ اگر کوئی شخص صرف بہ تقاضائے انسانی ہمدردی اس قسم کی کوشش کرتا ہے۔ تو اسے انگشت نما کرتے ہیں اور خبیثی اور مجنوں بتاتے ہیں۔ وہ لوگ جو انسانی ہمدردی اور قومی اصلاح کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ عورتیں بھی ہماری طرح انسان ہیں اور وہ بھی مردوں کی طرح اصلاح کی محتاج ہیں۔

جس طرح جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی حالت اچھی بھلی ہے۔ ان میں بڑے بڑے رئیس اور امیر بڑے بڑے عالم فاضل، فقیہ محدث موجود ہیں اور عموماً لوگ کھاتے پیتے اور خوش حال نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بے ہودہ اور بے معنی واویلا کیسی ہے کہ مسلمانوں کی حالت خراب اور وہ روز بہ روز پستی اور جہالت کی طرف بڑھتے جاتے ہیں لیکن قوم (کے) ہمدرد اور ریفاہر ان کی جہالت پر ہنستے ہیں اور ان کا ہنسنا بجا ہے لیکن ہم ان عقل مندوں کی عقل مندی پر ہنستے ہیں جو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے ہاں کی عورتیں نہایت قابل، باعصمت اور امور خانہ داری میں بہت ہوشیار ہیں اور اس لیے اصلاح کی محتاج نہیں۔ جہاں یہ حالت ہے وہاں جو کچھ نہ ہو سو کم ہے۔ اگر چندے یہی غفلت رہی تو ایک روز آنے والا ہے جب سر پر ہاتھ دھر کے روئیں گے اور پھر کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گی، فقط راقم۔ عبدالحق۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۳ء

مکرم بندہ جناب

انجمن اشاعت اردو ناگپور کی دعوت پر انجمن ترقی اردو ہند کی سیرمی
آل انڈیا اردو کانفرنس کا اجلاس، ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء کو ناگپور میں منعقد ہوگا۔
اس کے لیے بڑے اہتمام کے ساتھ خاص انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ ان
موقع پر ایسا بڑا اجتماع ہوگا کہ اس سے قبل کسی کانفرنس میں نہیں ہوا۔
مختلف علاقوں کے نمائندوں، متعدد یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور ملک
کے نامور اہل علم اور ادیبوں کی شرکت کی توقع ہے۔
اس اجلاس میں اردو زبان و ادب کی اشاعت و ترقی کے متعلق بہت
اہم تجاویز پیش ہونے والی ہیں۔ آپ جیسے پختہ خیال اور تجربے کار حامیان
اردو کے مشورے ان معاملات میں نہایت کار آمد اور کانفرنس کی کامیابی
کا موجب ہوں گے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ اس کانفرنس میں
شرکت فرما کر ہمیں اپنے مشورے اور تجربے سے مستفید فرمائیں۔

عبدالحمق

(سیدنا ابوالحسن علی ہمدانی)

سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

مولانا علم الدین سالک کے نام بابائے اردو کا ایک مراسلہ

ابھکر یہ ڈاکٹر سید معراج نیر

عُلّامی

از:
مولوی عبدالحق

تحریر: ۱۸۹۶ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق، اپنی نہاد اپنی افتاد اور اپنی
تعلیم و تربیت کے اعتبار سے اپنے زمانے سے کہیں زیادہ روشن
خیال، تہجد و پسند آزادی کے ولدادہ اور ترقی نسواں اور حقوق نسواں
کے ایک بڑے علمبردار اور مبلغ تھے۔

۱۸۹۶ء کے ماہنامہ رسالہ ”معلم نسواں“ (مدیر محبت
حسین) حیدر آباد دکن (جلد ۱۰، نمبر ۱، صفحہ ۳۱-۳۶) میں ”غلامی“
کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا زیر نظر پر تاثیر مضمون ”نادرات“
میں سے ہے۔

یہ مضمون مولوی عبدالحق نے پچیس چھبیس برس کی عمر میں
لکھا۔۔۔۔۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس کی
تازگی اور دردمندی اپنی جگہ قائم اور سلامت ہے۔ مجھے مولوی
عبدالحق کی روش ضمیری کی یہ قیمتی یادگار، حیدر آباد دکن کے اپنے
کرم فرما عبدالصمد خاں (حیدر آباد دکن) کے بے مثال ذخیرہ کتب
و رسائل ”اردو ریسرچ سینٹر“ سے میسر آئی جس کے لیے میں ان کا
بہ دل ممنون ہوں۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمن]

”۔۔۔۔۔ ایک زمانہ تھا جب کہ غلامی کا عام رواج تھا۔ یعنی انسان انسان کی
جان و مال کا ایسا ہی مالک تھا جیسے اور بے جان چیزوں کا۔۔۔۔۔ بلکہ اسے اپنے مکان کی

آرائش یا دوسری ضرورت کی معمولی چیزیں زیادہ عزیز ہوتی تھیں یہ نسبت انسانوں کے جو اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کی صورت پر بنائے گئے ہیں۔ غلاموں کی تجارت نہایت سود مند اور بہت بڑی تجارت سمجھی جاتی تھی۔

بعض یورپین قومیں جو اس قسم کی تجارت کرتی تھیں نہایت بے رحمی کے ساتھ انہیں پکڑ پکڑ کر لے جاتی تھیں ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی تھی اور جب نکل کر بھاگتے تو پکڑے جاتے تھے۔ جہازوں میں وہ اس طرح بھر بھر کر لے جاتے تھے جیسے کوئی لکڑی کے لٹھوں یا سوداگری کی اور چیزوں کو بھرتا ہے۔ جہاز میں لادنے کی کیفیت سنیے کہ پہلے تو ایک بیضوی دائرہ کی شکل میں سب کو ڈالتے چلے جاتے تھے اور جو جگہ بیچ میں یا کونوں میں رہ جاتی تھی جس میں نہ تو وہ پوری طرح بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں تو جس ہیئت سے وہ جگہ پر کی جاتی تھی حقیقت میں اس سے عجب بے رحمی معلوم ہوتی تھی۔

کوئی آدھا بیٹھا آدھا لیٹا ہے۔ کوئی لیٹا ہے مگر ٹانگیں شکم میں ہیں ایک اونٹنرو بیٹھا ہے تو دن رات اسی حالت میں ہے۔ دوسرا ہے کہ اس کی مشکلیں باندھ کر ایک ذرا سی جگہ میں ٹھونس دیا ہے۔ غرض جہاز میں ذرا سی جگہ بھی خالی ہوتی تھی تو وہ بے رحم لوگ موڑ توڑ کر کسی نہ کسی غلام کو ضرور ڈال دیتے تھے گویا وہ بے جان چیزیں ہیں جو تکلیف یا درد کو محسوس ہی نہیں کر سکتیں اور اس پر طرہ یہ کہ جب رستے میں معلوم ہوا کہ جہاز خاص مقدار وزن سے زیادہ بھاری ہو گیا ہے تو وہ جہاز میں سے غلاموں کو اٹھا اٹھا دریا میں پھینک دیتے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں سودا بن گیا غلاموں کو فروخت کر دیا۔ لیکن یہ خریدار کی مرضی پر تھا کہ وہ جون سے غلام کو چاہے خریدے اور یہ اکثر واقع ہوتا تھا کہ ایک نے ماں اور دوسرے نے بچہ خرید لیا۔ بچہ ہے کہ الگ بلک رہا ہے اور ماں جدا زار و قطار رو رہی ہے اور پھر ان سے محنت اس قدر سخت لی جاتی تھی کہ الامان! اگر ان تمام واقعات کی تفصیل بیان کی جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

صبح سے شام اور شام سے صبح تک کوئی ایسا وقت نہ تھا کہ ان سے سخت سے سخت اور مشقت نہ لی جاتی ہو اور جب ذرا بھی کام ان کی مرضی کے خلاف ہوا یا

یوں ہی جب جی چاہا بلا وجہ مارے کوڑوں کے کھال اڑا دیتے تھے اور اگر چاہتے تو جان سے مار ڈالتے۔ کیوں کہ غلام کے مار ڈالنے کا اختیار ان کے آقا کو حاصل تھا۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جنہوں نے اس بے انتہا ظلم و ستم کی بنیاد اکھاڑی اور آفرین اور صد آفرین ہے ان کی ہمتوں پر کہ انہوں نے اس کی مخالفت میں جان توڑ توڑ کر کوشش کی اور دنیا کے دامن پر سے اس بدنما داغ کو مٹا دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی دنیا سے بالکل اٹھ گئی ہے؟ اور خصوصاً ہمارے ملک سے جو ایک ایسی قوم کی زیر حکومت ہے جو غلامی کی سخت دشمن ہے اور جس نے نہایت جواں مردی کے ساتھ اس کو دنیا سے مٹانے کی کوشش کی؟ اگر ہم میں ذرا بھی انصاف باقی ہے تو ہم اس کے جواب میں ”نہیں“ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس قدر غلطی پر ہیں۔ بے شک ہمیں وہ غلامی نظر نہیں آئے گی جو قانون کے احاطے میں آ سکتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ خوف ناک اس سے زیادہ مضر اور تباہ کرنے والی غلامی ہم میں اس وقت موجود ہے۔ ہم نہ کہیں لیکن ایک دنیا کہہ رہی ہے اور جنہیں خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ صاف دیکھ رہے ہیں اور یہ نہ صرف ہمارے آس پاس اور ہمارے گھروں میں ہے بلکہ ہمارے دلوں ہمارے خود شوق اور ہماری نیتوں تک میں سرایت کر گئی ہے۔ اس کا بیج اس سر زمین میں بویا گیا ہے جہاں قانون کے احکام نافذ نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کے فرمانروا رسم و رواج ہیں اور ہم ان کے غلام بلکہ پجاری ہیں۔

منجملہ ان رسوم کے جو ہمارے ہاں رائج ہیں اور جن میں ہم جکڑے ہوئے ہیں سب سے زیادہ مکروہ و مضر وہ رسمیں ہیں جو بنی نوع انسان کے دوسرے جز یعنی نسوان کے متعلق ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان تمام بے ہودہ رسموں کا نچوڑ ان قابل رحم عورتوں پر آپڑتا ہے۔ پیدائش سے لے کر وفات تک ان کی زندگی اس بری حالت میں گزرتی ہے کہ گویا وہ انسان نہیں، اگرچہ انسانوں کے گھر میں پیدا کی گئی ہیں۔ اول تو لڑکی کا پیدا ہی ہونا والدین کو شاق گزرتا ہے اور گولوگوں کے کہنے سننے اور ادھر ادھر کی باتوں

سے وہ اپنے دل کو نہ سمجھالیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کو ان کے عزیز و اقارب اور دوستوں کو ہرگز وہ خوشی نہیں ہوتی جو لڑکے کے پیدا ہونے سے ہوتی ہے۔ پھر چار طرف سے مبارک باد اور خوشی کے نعرے بلند ہوتے ہیں، شادیاں بچتے ہیں، جلے ہوتے ہیں، ناچ و رنگ ہوتا ہے، ضیافتیں ہوتی ہیں غرض یہ کہ ایک عجب شان و شوکت اور مسرت کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے پیدا ہوتے ہی سب کے دل پژمردہ ہو جاتے ہیں۔

اس شوق میں کہ کسی طرح لڑکا پیدا ہو قسم قسم کے ٹونے اور تعویذ گنڈے کئے جاتے ہیں۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی جاتی ہیں، منتیں منگوائی جاتی ہیں اور کوسوں کا سفر کر کے فقیروں کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض اوقات اس بے ہودہ خواہش میں ایسے خوفناک واقعات پیش آتے ہیں کہ جس سے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں یا ہمیشہ کے لئے ننگ و ناموس پر دھبا آ جاتا ہے۔ جس خاندان میں صرف لڑکیاں ہوں اور لڑکانہ ہو وہاں وہ اور بھی ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ گویا یہ ان بے چاریوں کا قصور ہے کہ اب تک لڑکا پیدا نہیں ہوا۔ لڑکے کی پرورش اور تربیت جس ناز و نعم اور محبت اور دلداری سے کی جاتی ہے، لڑکی کو اس کا عشر عشر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بڑا ہوا تو اس کی تعلیم کے انتظام کئے جاتے ہیں۔ استاد نوکر رکھے جاتے ہیں یا مدرسہ میں بھیجا جاتا ہے غرض جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔ گویا علم مردوں ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس لئے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف کچھ توجہ نہیں کی جاتی اور اگر کسی نے کچھ خیال بھی کیا تو نہایت لا ابالی کے ساتھ اور دو ایک اردو کی کتابیں پڑھا دیں اور یہ ان کی تعلیم کی معراج ہے۔ ذرا بڑی ہوئیں اور انہوں نے گھروں میں بند کرنا شروع کیا اور پھر اس قید خانے سے عمر بھر ان کا چھٹکارا نہیں ہو سکتا جب تک کہ قید ہستی سے نہ چھوٹ جائیں۔

جب سن بلوغ کو پہنچیں تو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ شادی کے متعلق تمام رسوم اور تدابیر والدین کرتے ہیں بے چاری لڑکیوں سے پوچھتے تک نہیں، انہیں خبر تک نہیں کرتے گویا ان کی شادی نہیں بلکہ کسی اور کی ہے۔ والدین کی جہاں مرضی ہوئی شادی کر دی اور بے چاری لڑکی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔

لڑکا تو پھر بھی کچھ کہہ سکتا ہے مگر لڑکی زبان سے حرف تک نہیں نکال سکتی۔ کیونکہ یہ خلاف شرافت ہے۔ اس وحشیانہ رسم سے سوسائٹی پر بہت ہی برا اثر پڑتا ہے اور اکثر میاں بیوی کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ کیا یہ غلامی نہیں ہے؟ عمر بھر ایک تنگ چار دیواری کے اندر مقید علوم و فنون سے بے بہرہ دنیا کے حالات اور قدرت کے عجائبات سے نا آشنا بری رسوم کی پابند۔۔۔۔۔ زندگی ہے ہمارے ہاں کسی نسواں کی جو جانوروں اور حیوانوں کی زندگی سے بھی بدتر ہے اور پھر اس پر دعویٰ ہے تہذیب اور شرافت کا۔ اگر وہ لوگ جنہیں ہم غیر مہذب وحشی اور جنگلی کہتے ہیں ہماری یہ حالت دیکھیں تو ہم پر ضرور ہنسیں اور طعن کریں اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ ایک حد تک سچ بھی ہے۔

جب ان لوگوں نے جو بنی نوع آدم کے سچے ہمدرد اور یہی خواہ ہیں غلامی کو دنیا سے مٹا دینے کا بیڑا اٹھایا تو پہلے پہل ان کی بھی سخت مخالفت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مخالف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں غلاموں کی تجارت یا ان کے محنت و مشقت سے فائدہ عظیم ہوتا تھا۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ ان سے بھی بڑھ کر مخالف وہ تھے جو دین کے پیشوا یعنی پادری کہلاتے ہیں۔ وہ انجیل اور توریت لے لے کر اٹھے اور جا بجا وعظ کی کہ غلامی انجیل کے عین مطابق ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ دراصل کلام الہی کی مخالفت کرتے ہیں اور در پردہ مذہب مقدس کی جڑ کھوکھلی کرنا چاہتے ہیں۔

انسان کی خواہشات اور جذبات جو پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ جو افعال ان سے پہلے صادر ہوتے تھے وہی اب بھی ہوتے ہیں اور جہاں کہیں وہی حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ہمارے حرکات اور ہمارے افعال وہی روش اختیار کرتے ہیں جو ہم دوسرے مقامات اور دوسری زبانوں میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے اگر ہم یہ باتیں اپنے ملک میں ہوتی دیکھیں تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا جو روش اس زمانے میں حامیان غلامی اور پادریوں نے اختیار کی تھی آج وہی رنگ ہم اپنی سوسائٹی کا دیکھتے ہیں۔

ان کے سامنے جب کوئی مفید اصلاح پیش کی گئی تو انہوں نے ہمیشہ شور و غل

سر سید احمد خاں کی والدہ

نایاب تحریر: بیلابے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نے، اپنے نانا نواب دیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد (۱۷۷۷ء-۱۸۲۸ء) کی مختصر سوانح ”سیرۃ فرید یہ“ میں بتایا ہے کہ خواجہ فرید الدین احمد کے دادا خواجہ عبدالعزیز کشمیر سے بطریق تجارت دہلی میں آئے تھے۔ اخیر کو انہوں نے دہلی ہی میں توطن اختیار کر لیا تھا۔

خواجہ فرید الدین احمد خاں کو با شاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے عہد میں عمدہ وزارت اور نواب دیر الدولہ امین الملک خان بہادر مصلح جنگ کا خطاب ملا۔ ان کی نمایاں سماجی حیثیت اور خطہ کشمیر سے تعلق اور نسبت کی بناء پر کشمیریات کے ممتاز عالم محمد الدین فوق (ولادت ۱۷۷۷ء، وفات ۱۹۳۵ء)، ایڈیٹر ”کشمیر میگزین“، لاہور نے ”حالاتِ نواب دیر الدولہ“ کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔

۵۳ صفحات پر مشتمل محمد الدین فوق کی مختصر کتاب ”حالاتِ نواب دیر الدولہ“ جنوری ۱۹۱۲ء مطابق حرم المحرام ۱۳۳۰ھ ہجری میں ہندوستان اسٹیم پریس، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے آخر میں ”عزیز النساء حکم“ کے زیر عنوان (ص ۴۳ تا ۵۳)، سر سید احمد خاں کی والدہ محترمہ کے افکار اور احوال کو بھی بجز و کتاب بنایا گیا ہے۔ یہ حصہ کتاب جوہ ایک اہمیت خاص کا حامل ہے۔

سر سید کی تربیت میں ان کی والدہ محترمہ کا بے حد دخل اور اثر رہا۔ سر سید کی عمر چالیس برس کی تھی جب نومبر ۱۸۵۷ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے چالیس برس بعد، خود کوئی اسی برس کی عمر کو پہنچ کر بھی وہ والدہ کے اثر اور سحر سے نکلے نہیں تھے۔ ۶ فروری ۱۸۹۷ء کے اپنے ایک خط بنام نیاز محمد خاں میں وہ لکھتے ہیں:

”میری دانست میں..... والدہ صاحبہ کا حق جمع امور پر مقدم ہے۔ ان کا

اتباع اور اطاعت لازم ہے۔ ان کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا چاہیے۔ یہ بات تمام اخلاقوں اور عبادتوں اور کائنات کے جذبوں سے افضل ہے۔“

(مکتوبات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۳۵۵)

عزت اور اثر کے اس حوالے سے، سرسید کی والدہ کے حالات اور ان کی تعلیمات کا تذکرہ بہت اہم ہے۔ یہ ذکر عزیز، اس لیے اور بھی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے کہ فوق کی متذکرہ کتاب کے آخر میں شامل سرسید کی والدہ کے حالات، بلایے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ بلایے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء) کو سرسید کی محبت اور قربت حاصل رہی۔ ان کی والدہ کے بارے میں بلایے اردو کی یہ نایاب نگارش ان کی نوجوانی کی یادگار ہے اور ان کے کسی مجموعہ مضامین میں شامل نہیں۔ امید ہے کہ سرسید احمد خاں کی صد سالہ برسی کے موقع پر بلایے اردو کی اس نادر تحریر کو جو جائے خود پون صدی سے زیادہ قدیم ہے، قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(ڈاکٹر سید معین الحسن)

عزیز النساء اکبر

بلاشبہ ایک اچھی زبان ہزار استادوں سے بہتر ہے (سید)
سرسید احمد خان بہادر کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کی جائے لیکن اس کے علاوہ ان میں دو تین اور باتیں نہایت ممتاز طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ان کے پولیٹیکل خیالات اس بارہ میں اُنکی بڑی کوشش یہ تھی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو ایک قسم کی منافرت پیدا ہو گئی تھی اُسے مٹایا جائے اور ان میں عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ دوسرے انگریزی سلطنت کی

جیسے خواہی اور وفا داری اور اس حکومت کی خوبیاں لوگوں کے دلوں پر نقش کی جائیں۔ دوسری ممتاز بات جو ان میں پائی جاتی تھی۔ اور جسکی وجہ سے تمام ملک میں ایک تھکے مچ گیا۔ اور لوگوں نے بڑے زور شور سے مخالفت کی وہ ان کے مذہبی خیالات تھے۔ اگرچہ ان خیالات کے کیسے ہی مخالف کیوں نہ ہوں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ملک پر ان کا بہت کچھ اثر پڑا اور ٹیٹ اسلام اور توہمات باطنہ جھوٹی سچی قصے کہانیوں میں لوگ فرق کرنے لگے۔ عام طور پر تحقیق کا خیال پیدا ہو گیا۔ تیسری بات جو فی الحقیقت نہایت قابل تعریف و تحسین ہے وہ ان کے پاکیزہ اخلاق ہیں۔ میں یہاں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ ان تینوں باتوں میں اپنی ماں کے سچے شاگرد تھے۔ اور اس بارہ میں ان کی زندگی پر زیادہ دیکھا جائے تو ان کی والدہ کا اثر پڑا۔

۱۸۸۳ء میں ہندوستان کی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لئے ایک جو کمیشن کمیشن قائم کیا گیا سر سید احمد خاں بہادر اور سید محمود بھی اس کے ممبر تھے۔ سید احمد خاں سے جب تعلیم نسوان کی نسبت سوال کیا گیا تو انہوں نے بہت سے شہادت میں یہ بھی بیان فرمایا۔ کہ "خود میں نے غلامی کی ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے پائی۔ اور نیز اوائل عمر میں مجھے بہت سے عقید اور اخلاقی سبق میری والدہ نے دیئے جو اب تک بعینہ مجھے یاد ہیں"۔

عزیز النساء بیگم (والدہ سید احمد خاں) خواجہ فرید الدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن نہایت ایقہ مستظم ذہین۔ رحمدل باخلاق اور قدرتی طور پر نہایت عالی دماغ واقع ہوئی تھیں۔ جن کی قابلیت اور خوبی کا اثر نہ صرف سر سید احمد خاں پر بلکہ قریب قریب تمام خاندان پر پڑا۔ سر سید احمد خاں اپنی ابتدائی تعلیم کا پورا پورا سہارا اپنی والدہ سے حاصل کیا۔ اس طرح ذکر کرتے ہیں۔ میں نے خود گلستان

کے سبق ان سے پڑھے ہیں۔ اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق انکو سنائے
 ہیں۔ نیکو خوب یاد ہے۔ کہ جب میں انکو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے
 پاس بیٹھتا تو وہ سوت کی گوند سی ہوئی تین لڑکیوں میں ایک لڑکی میں بندھی ہوئی
 میری تہیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کبھی بار ہوئی ہوگی مگر ان سوت
 کی لڑکیوں سے مجھے کبھی بار نہیں پٹی ۵

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ ایسے شخص نے سرسید احمد خاں بہادر سے بدی کی۔
 شہر سے انہوں نے کبھی بہت بڑا شکوک کیا تھا۔ اتفاق سے وہ تمام ثبوت جس سے
 اُسے پوری سزا عدالت سے مل سکتی تھی۔ ان کے ہاتھ آ گئے۔ اور سرسید انتقام لینے
 پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی والدہ نے جب یہ سنا تو کہا اگر تم اسکو معاف کر دو تو اس سے
 عمنی کوئی کام نہیں۔ اور اگر تمکو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت
 نادانی ہے۔ کہ اس قوی اور زبردست حکم الحامین کے جنگل سے جو ہر ایک اعمال کی
 سزا دینے والا ہے چھوڑ کر دنیا کے ضعیف اور ناتواں حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہتے
 ہو۔ سرسید کہتے ہیں کہ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اُس وقت سے
 میرے دل میں کبھی کسی شخص سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا۔ اگرچہ اس شخص نے
 میرے ساتھ کبھی ہی دشمنی کیوں نہ کی ہو۔ بلکہ میرے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ
 اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی میرا اس سے بدلہ لے لے۔

سرسید نے اسی قسم کے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جس

زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ میں نے ایک ذکر کو جو بہت بڑھا اور پرانا
 تھا۔ کسی بات پر تہیہ پڑا جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی۔ اور کھوڑی دیر بعد میں
 گھر میں گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اسکو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا
 جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ملکہ
 لے کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک دوسری ماما

میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی۔ اور مجھ کو میری خالہ کے گھر لگائی۔ میری خالہ نے کہا کہ دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں۔ اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھیگا اس سے بھی خفا ہوگی۔ مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں۔ اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھے چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے میں چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکر دن اور میری بہنوں سے کہتی تھیں کہ دیکھنا آیا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے میں تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس بقصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے بقصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر ملایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ جب تقصیر معاف ہوئی جس ماں کی یہ تعلیم ہو اس کا بچہ کیسا کچھ بااخلاق نہ ہوگا۔

سر سید اپنے ایک دوست سے ہمیشہ ملنے جایا کرتے تھے۔ لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے۔ اور انہوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ مگر سر سید بدستور ملتے رہے۔ لیکن ایک مدت بعد انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے سبب دریافت کیا۔ سر سید صاحب نے جو بات تھی کہہ دی تب انہوں نے کہا کہ نہایت افسوس ہے۔ کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جب دوستی ہے۔ تو اسے پورا کرنا چاہئے۔ یہ تمہارا فرض ہے اور اس دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اسکا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض ادا کرنے کے کیوں ذمہ دار ہوتے ہو۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔

وہ عزیز اور مسکین عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں اور مکان کا ایک حصہ

ان ہی کے رہنے کے لئے اور علاج کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک عزیز لاوارث بڑھیا زمین تھی۔ جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی۔ اتفاق سے وہ

اور زمین ایک ہی زمانہ میں بیمار ہو گئیں۔ جو دو حکیم ان کے لئے تجویز کرتے تھے۔ وہی
 دو زمین کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی اس کے بعد حکیم نے ایک قیمتی معجون
 تجویز کی جو سفید صاحب تیار کر لائے۔ چونکہ انہیں یقین تھا کہ زمین کو یہ قیمتی
 معجون کوئی تیار کر کے نہیں دیگا۔ وہ خفیہ خفیہ زمین کو کھلاتی رہیں۔ اور خود حکیم
 تک نہیں۔ اس سے زمین کی صحت میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور سناٹا ہی لہان کی
 صحت بھی اچھی ہو گئی۔ چند روز بعد جب سید صاحب نے کہا کہ اس معجون نے تو
 آپ کو بہت فائدہ کیا تو انہوں نے ہنس کر جواب دیا کیا تمہارے نزدیک خدا بخیر دوا
 کے صحت نہیں دیتا۔ سید صاحب کو یہ سن کر تعجب ہوا اور پھر سارا قصہ معلوم ہوا۔
 ایک امران سے حقیقت میں نہایت استقلال کا ظہور میں آیا۔ وہ یہ ہے
 کہ ان کے بڑے بیٹے یعنی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں انتقال
 عین جوانی میں ہو گیا۔ اس وقت انکی عمر کوئی ۱۴ سال کی ہو گئی۔ جیسا کہ انہیں راج
 ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے۔ سب لوگ گریہ و زاری میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھوں
 سے بے اختیار آنسو بہتے تھے۔ اور زبان سے صرف یہ الفاظ نکلتے۔ "خدا کی
 مرضی" لیکن بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا۔ کہ اتفاق سے ان ہی دنوں میں
 قریب کے عزیزوں کی ایک بیٹی کی شادی تھی۔ سامان شادی سب ہو چکا تھا۔
 تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔ جب یہ موت واقع ہوئی۔ اس لئے حسب دستور ان لوگوں
 اس شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ مگر سید احمد خاں کی والدہ اس انتقال کے تیسرے
 روز ان کے گھر گئیں اور کہا کہ تمہاری شادی میں آئی ہوں۔ میں دن سے زیادہ باکم
 کرنا منع ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ تم شادی ہرگز ملتوی نہ کرو۔ اور جب میں نہیں
 اجازت دیتی ہوں تو پھر تمہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اس زردن خیال عورت کا یہ کام
 نہایت جرات انگیز اور قابل تحسین ہے۔ حقیقت ملک کی ترقی اور بہبودی کیلئے ایسی
 ماؤں کی بے انتہا ضرورت ہے۔

وہ ان کے مذہبی خیالات ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کہاں تک صحیح اور کس حد تک غلط ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس بارہ میں مذہبی حقیقات اور شک کی ایک نئی تحریک لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی۔ میرا خیال ہے کہ سید کے کیریئر کے اس پہلو پر بھی انکی والدہ کا بہت اثر پڑا۔ اور اس میں کچھ کلام ہے کہ توہمات اور تعصبات (جن کے سید صاحب سخت دشمن تھے) کی بیخ و بنیاد ان کی والدہ نے ابتدا ہی میں انکے دل سے اکھاڑ دی تھی۔

وہ کبھی کسی مقصد کے لئے سنت یا نیاز نہیں مانتی تھیں۔ اور نہ انہیں فال و استخارہ یا گنڈے سے تعویذ پر ذرا اعتقاد تھا۔ تارکچوں اور دنوں کی سعادت یا نحوت کی وہ ذرا برابر پر واہ نہیں کرتی تھیں۔ انہیں خدا پر پورا بھروسہ تھا۔ اور اس قسم کے امور کو خلافت شان اسلامی سمجھتی تھیں۔ ان کا یہ اعتقاد تھا۔ کہ ہر بات کے لئے صرف خدا سے دعا کیجئے۔ پھر وہ جو چاہیں گے کریگا۔ چنانچہ ایک واقعہ جس کا سبب صحت خرابی نے ذکر کیا ہے۔ ان کے اس اعتقاد کی شہادت دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ میرے نہال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے۔ (سید صاحب کے نہال کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی) اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک گنڈے دیا کرتے تھے۔ جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اور اس تعویذ میں ایک جرت یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا۔ بارہ برس کی عمر تک اٹھایا مرغی کھانے کا اسکو ہنایا ہوتا تھا۔ سفید جامد اور سفید محو و میر سے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی نہال والوں نے وہ گنڈہ پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈہ کے سبب سے اٹھایا مرغی کھانا لوزیہ سمجھا کہ اگر کھائے تو کوئی آفت آئے گی۔ خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف

یہاں سب سے پہلے ان دونوں لڑکوں کو جٹ بھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز
بھلی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا بیٹلن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل
ان کو کھلا دیتیں۔ وہ لڑکے پڑاٹھے اور انڈا پسند کرتے تھے۔ وہ بے تامل ان کو

چوا کر کھلا دیتی ہیں۔

سید صاحب کہتے ہیں کہ ”اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول
پر ہیں۔ اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے
شک یا بدعت کا اطلاق ہو نہیں پاتا۔ بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت
بدلی یعنی قرآن مجید پڑھ کر بخشے کا یا فاتحہ دیکر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچا
ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سید احمد خاں پر مذہبی خیالات میں ان کی دلالت
کا کہاں تک اثر ہو گا۔“

تیسرا مرحلہ میں میں نے سید احمد خاں کو خاص طور پر ممتاز خیال کیا ہے۔ وہ یہ ہے
کہ وہ سلطنت انگریزی کے نہایت وفادار اور خیر خواہ تھے۔ اور سب سے پہلا یہ شخص تھا
جس نے نہایت جانفشانی کے ساتھ اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں اور انگریزوں
میں باہمی عمدہ خیالات اور عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ اور اس میں اسے بہت
بڑی کامیابی ہوئی۔ پچاس سال پہلے اور آج کل کا مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان
کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمان انگریزی سلطنت کے بدخواہ اور انگریزوں
کی قوم کے جاننی دشمن اور مخالف خیال کئے جاتے تھے۔ اور آج وہی مسلمان ہیں۔
برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ اور ان کی وفادار رعایا کہلائے جاتے ہیں۔ اس وقت
مسلمان کی صورت دیکھ کر انگریز کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ کیونکہ وہ خوب سمجھتا
تھا۔ کہ ہماری سلطنت کا سب سے بڑا بدخواہ اور ہماری قوم کے خون کا پیاسا یہی
شخص ہے۔ اور یہی شخص ہے جس کے بے رحم ہاتھ نے ہمارے معصوم بچوں اور بے گنا
بی بیوں کا بیحد تلخ خون بہایا ہے۔ لیکن آج مسلمانوں سے اس کا بڑا بد نہایت

قابل تعریف ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعریف میں بڑے بڑے آرٹیکل لکھتا ہے۔ اور انہیں اپنی سلطنت کے قیام کے لئے بڑی تقویت خیال کرتا ہے۔ یہ حیرت انگیز تعبیر صرف سید احمد خاں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جسے اعلیٰ درجہ کی کامیابی سمجھنا چاہئے اور زیادہ تعجب تیز یہ امر ہے کہ یہ سب کچھ بلا کسی غیر کی مدد کے صرف ایک شخص کی سرگرمی اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن انگریزی سلطنت کی خیر خواہی کا خیال سید احمد خاں کو غدر کے بعد پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ شروع ہی سے یہ خیال ان کے دل میں

نکلا۔ پھر اس خیال کی پیدا کرنے والی انکی والدہ تھیں۔ شاید پڑھ لکھ کر ناظرین کو تعجب ہو۔ لیکن فی الحقیقت بات یہی ہے۔ جسے میں مختصر طور پر یہاں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ سر سید کے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں نے جب وزارت سے استیفا دیدیا۔ تو کچھ دنوں بعد بہار راجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد کو ان کے پاس بھیجا اور تیس ہزار روپیہ سفر خرچ کے لئے پیش کیا۔ اور لاہور بلا یا۔ ان کے سب دوستوں اور عزیزوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ اُسے منظور فرمائیں۔ اور خود بھی ان کی کسی قدر مرضی تھی۔ لیکن ان کی بڑی بیٹی یعنی سید احمد خاں بہادر کی والدہ نے کہا۔ کہ "آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور اسقدر کہ آپ اپنی بقید زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر کر سکتے ہیں۔ خود لاہور جانا۔ اور بہار راجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیار کا نہ لکھتے ہیں۔ اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیا اتفاقات ہوں۔ اور کیسے ملکی انقلاب درپیش آئیں۔ اور کس قسم کے تکالیف کا سامنا ہو میں آپ کا انگریزی عملداری کو چھوڑ کر وہاں چلا جانا۔ پسند نہیں کرتی۔ دوسرے آپ کا زمانہ ضعیفی ہے۔ اور طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی۔ اس لئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں رہیں۔ دبیر الدولہ کے دل پر اس کا اسقدر اثر ہو۔ کہ انہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ اور سفر خرچ واپس بھیج دیا۔ سید

صاحب کی والدہ کے اس مشورے سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ کہ وہ انگریزی
 عملداری کی کہ قدر قدر کرتی تھیں۔ اور اُسے کس قدر محفوظ خیال کرتی تھیں۔
 یہاں تک کہ ہمارا جو رنجیت سنگھ کی وزارت کو یہاں کے قیام کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھا۔
 غدر کے زمانہ میں ایک دفعہ پھر ان کا خیال انگریزی سلطنت کی نسبت ظاہر
 ہوا۔ اور حیرت ہے۔ کہ ہندوستانی عورت کو انگریزوں پر اس قدر بھروسہ ہو جب
 دلی میں غدر ہوا تو اُس وقت سید صاحب کی بیوی نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ اور باقی ان کے
 خاندان کے سب اگ دلی میں بچے۔ ان کی والدہ لوگوں سے کہتی تھیں کہ انگریز
 گھوڑے دلوں میں پھرا جائینگے۔ تم سب خاموش اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہو
 جو لوگ فساد میں شریک نہ ہونگے انگریزوں کو کچھ نہیں کہینگے۔ ان کو اس بات کا پورا

یقین تھا کہ انگریزوں کی سلطنت جانے والی نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ فساد
 میں شریک نہیں۔ ان کو انگریز تکلیف نہیں دینگے۔ جب دلی کے فتح ہونے کا وقت
 قریب آیا۔ تو سب زن مرد شہر سے بھاگ بھاگ کر باہر جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ مگر
 انہوں نے (سید صاحب کی والدہ نے) اور ان کی ایک بہن نے جو نابینا تھیں۔ اسی
 یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستائینگے۔ اپنے گھر سے قدم باہر نہ رکھا۔ لیکن
 افسوس ان کا یہ خیال غلط نکلا۔ اُس تیرہ و تارک زمانہ میں دوست و دشمن میں تمیز
 کرنی نہایت مشکل تھی۔ اور کوئی کسی کا پر ساس حال نہ تھا۔ چنانچہ جب دلی فتح ہوئی۔
 تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ سید کی والدہ نے اپنی
 بہن کے اُس کو ٹھہری میں جا لگیں جس میں اداوارت بڑھیا زمین رہا کرتی تھی۔ اور
 آٹھ دس روز بہت تکلیف کے بسر کئے۔ سید صاحب اس مصیبت کی کہانی کو یوں
 بیان کرتے ہیں۔

"اس غصہ میں میں میرے آگیا تھا۔ میرے گھر سے دلی پہنچا۔ اور اپنی والدہ کے پاس
 گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ

ملگیا اسی پر سبر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ہو چکا تھا۔ اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔
 میں نے کو کھڑی کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔
 پہلا لفظ جو انکی زبان سے نکلا یہ تھا۔ کہ میں اتم یہاں کیوں آگئے۔ یہاں تو لوگوں کو
 مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ ہم پر جو گزریگی۔ گزریگی۔ میں نے کہا کہ یہ آپ خاطر جمع
 رکھئے۔ مجھے کوئی نہیں مارنے کا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں۔
 اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ انکی طمانیت
 ہوئی اور معلوم ہوا۔ کہ دو دن سے مطلق پانی نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش کو
 نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ کتوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ جس سے پانی نکالا
 جاسکے۔ ناچار پھر قلعہ میں گیا۔ اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لیکر چلا۔ جب
 اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا۔ سر دک پر بیٹھی
 ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آنجورہ ہے۔ اور کسب قدر بدحواس ہے۔
 معلوم ہوا کہ وہ بھی پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ کھوڑی دوڑ چکر بیٹھی گئی۔ اور پھر اٹھانہ

گیا۔ مجھ کو معلوم تھا۔ کہ وہ بھی پیاسی ہے۔ دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے اس کے
 آنجورہ میں پانی دیا۔ اور کہا پانی پی لے۔ اس نے کپ کپاتے ہاتھوں سے آنجورہ
 کا پانی صراحی میں ڈالا۔ اور کچھ گرا دیا۔ اور گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اور کچھ کہا جس کا
 مطلب یہ تھا۔ کہ "میں صاحب پیاسی نہیں۔ ان کے لئے پانی لے جاؤ گی۔ اور اسی غرض
 سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی" میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے۔ میں لے
 آیا ہوں۔ تو پانی پی لے"۔ پھر آنجورہ میں پانی دیا۔ اس نے پیا اور لٹ گئی۔ میں
 جلدی جلدی گھر کی طرف آیا۔ اور اپنی والدہ اور خالہ کو کھوڑا کھوڑا پانی پیسے کو
 دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔ اب میں گھر سے نکلا۔ کہ سواری کا بندوبست کر کے انکو
 گیر لہجی ڈوں۔ جب اس مقام پر پہنچا۔ جہاں بڑھیا زمین بیٹھی ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ
 وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کئے۔ لیکن کہیں

سوارسی نہ ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سزا کا زنی ڈاک ٹیکر سیر کرے
 کو لیجاتی ہے۔ مجھ کو دیدی جائے۔ میں وہ شکرم لیکر گھر پر آیا۔ اور اپنی والدہ اور
 عالم کو اس میں بیٹھا کر سیر کھلے آیا۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جاوہ اعتدال سے منحرف ہو گئی اور صفرہ
 کی نہایت شدت ہو گئی۔ جو دو یا غذا دیکھتی تھی وہ قے میں نکل جاتی تھی۔ کبھی اس
 مرض میں کچھ تخفیف ہو جاتی اور کبھی شدت ہو جاتی۔ آخر کار اسی مرض میں بمقام
 سیر کھ انتقال کیا۔ مگر ان کی نیک نیتی کا یہ نتیجہ تھا کہ انتقال سے چند روز پیشتر ان
 کی کھٹی اور نواسیاں اور پوتے اور پوتیاں اور بھوسیں جو مختلف مقامات میں چلی
 گئیں تھیں۔ سب اُنکے پاس جمع ہو گئی تھیں۔ اور انہوں نے سب کو صحیح و سالم
 اور خیر و عافیت سے دیکھ کر نہایت خوشی کی تھی۔

انہوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ ان
 کو کھٹی قبر میں جو مسنون ہے۔ دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہ ان کے ذمہ نہ
 تو کوئی روزہ قضا کا ہے۔ اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں
 اگرچہ میں نے پڑھی ہیں۔ لیکن اگر میں زندہ رہتی تو انکی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرتے
 سے بعد تم اس قند نمازوں کا حساب کرنے کے کفارہ کے گناہوں غویوں کو لہذا نہایت

جب کہ دوسرے دن انہوں نے قصائی تو میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا
 کیا۔ ان کی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ کہتی تھیں کہ "مصیبتیں جو
 انسان پر پڑتی ہیں۔ اس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے۔ مگر بزرے اس حکمت
 کو نہیں سمجھ سکتے"۔ انہوں نے سید صاحب کو ایک دفعہ نصیحت کی کہ "جہاں جہاں
 تم جانا لازمی سمجھتے ہو۔ اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہوگا۔ تو تم وہاں
 کبھی سواری پر جایا کرو۔ اور کبھی پیادہ پا۔ ومانہ کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ کبھی کچھ
 ہے اور کبھی کچھ نہیں ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اسکو نہایت مشکل ہو۔ ان کی یہ

نصیحت کس قدر پر حکمت ہے۔ اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو۔ اور پھر برائی کرے۔ یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزر دہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اسکی نیکی کے احسان کو بھلا یا نہیں جاسکتا۔

اس مختصر مضمون کے پڑھنے سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سرسید کی دلجوئی کیسی عالی خیال۔ دانشمند اور نیک طبیعت بی بی تھیں۔ اور سرسید صاحب کی لائف پران کی والدہ کا کیا اثر پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس اثر کو کامل طور پر بیان کرنے بتانا۔ میرے خیال میں نہ صرف مشکل ہی ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اور اگر خود سرسید بھی چاہتے۔ تو اسے کامل طور پر نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ انسان کے دل و دماغ پر مختلف اوقات میں مختلف طور کے اثر ایسے نامعلوم طور پر پڑتے رہتے ہیں۔ کہ انکی اصلیت اور وجہ کا بتانا یعنی یہ معلوم کرنا کہ یہ کہاں سے آئے۔ اور کیونکر آئے۔ نہایت پر دقت امر ہے۔ اور خصوصاً اد ایل عمر میں جب کہ اس قسم کی تحقیق اور تیسرے کی طرز میں جس توجہ نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ بلکہ بے انتہا زیادہ اثر سرسید صاحب کی لائف پر ان کی والدہ کا پڑا۔ کیا کچھ کم حیرت کی بات ہے۔ کہ ہمارے زمانہ کا بڑا ریفاہر اور لیڈر عالی دماغ مصنف۔ اعلیٰ درجہ کا پولیٹیشن ایک سچا روشن خیال۔ بڑا شخص قوم اور ملک اور سلطنت کا ہمدرد اور یہی خواہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی ماں کا سچا شاگرد تھا۔ (اور کسی ماں جسکو کشمیر کی خاک پاک سے نسبت تھی۔ جو ذکاوت و ذہانت اور روشن خیالی کا مخزن ہے)

وہ لوگ جو تعلیم نسوان کے مخالف ہیں وہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا۔ کہ ان کے بہت سے خیالات بہت سے عادات بہت سے توہمات اور تعصبات بہت سے جھوٹ موٹ کے ڈر اور جھوٹ موٹ کی امیدیں جو ان کے دلوں میں پتھر کی لکیر ہو گئی ہیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں سے اخذ کی ہیں۔ اب اگرچہ

وہ ان میں سے بہت سے خیالات کو غلط اور فضول تصور کرتے ہیں۔ لیکن افسوس
 دل سے نہیں مٹا سکتے یہ سبق انہوں نے اپنی ماؤں کے گہٹنوں پر بیٹھ کر سیکھے ہیں
 اس وقت جب کہ ان میں بڑے بھلے کی مطلق تمیز نہ تھی۔ اور ان کے ننھے ننھے دلوں
 نے ایسی ایسی باتوں کو اخذ کر لیا۔ جن میں دیکھ کر آج وہ پچھتاتے ہیں جو لوگ کہ ملک کی
 ترقی کے خواہاں ہیں! انہیں! بلکہ جو لوگ صرف اپنی اولاد اور خاندان کی بہبود ہی
 چاہتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم نسوان کی طرف توجہ کریں۔
 کیونکہ جیت تک ہمارے ہاں کی عورتیں لکھی پڑھی اور قابل نہ ہونگی ہماری اولاد کے
 دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور جب آج ہمیں انکی عصمت اور غربت
 پر ناز ہے۔ ایک روز ان کی لیاقت اور عالی دماغی پر بھی فخر حاصل ہوگا۔
 (مولوی عبدالحق صاحب بی اے حیدرآباد دکن)

حواشی اور حوالے :

۱۔ سر سید احمد خاں نے یہ بات اپنی تالیف "سیرۃ فریدیہ" (زمانہ تحریر اگست ۱۸۹۳ء) میں اپنی والدہ کی
 تعلیمات و تربیت کے، اپنی ذات پر اثرات کے ضمن میں کہی ہے، دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، مطبع مفید عام،
 آگرہ، ۱۸۹۶ء، ص ۷۷۔

"سیرۃ فریدیہ" ہی میں ایک دوسرے موقع پر سر سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ "میری والدہ عالی خیال اور
 نیک صفات اور عمدہ اخلاق، دانش ور اور دور اندیش، فرشتہ صفت ملی تھیں۔" (ایضاً ص ۵۳)۔ "اگر
 لوگ غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ..... ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اس نے تربیت کی ہو، کیا اثر پڑتا
 ہے۔" (ص ۵۳، ۵۴)

۲۔ بلائے لردو نے اپنی معروف کتاب "چند ہم عصر" میں سر سید احمد خاں کا شخص خاکہ لکھتے ہوئے، سر سید کے
 مزاج اور ان کی نصاب میں والدہ کے اثرات کی نشاندہی کی ہے: "..... سر سید کے گھر کے سارے انتظام اور
 نولاد کی تربیت کا بدران کی والدہ پر تھا۔ یہ سر سید کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک
 سرشت ملی تھیں اور ان میں انسانی اخلاق کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ سر سید کی زندگی پر ان کا بڑا اثر
 تھا۔" (چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۳۶)

”سر سید احمد خاں نے اخلاق کے بہت سے سبق اپنی والدہ سے سیکھے اور عمر بھر ان پر عمل کیا۔“

(چند ہم عصر، ایضاً، ص ۳۳۳)

”مگر میں سر سید کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی..... اخلاق اور تہذیب کے جو کچھ اس فرزند اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے ان کے دل میں بٹھادیئے تھے، وہ عمر بھر نہ بھولے اور ان پر عامل رہے۔“

(چند ہم عصر، ص ۳۳۱)

۳- خالی نے ”حیات جاوید“ میں اس شہادت کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”سر سید نے ایجوکیشن کمیشن میں اپنے خاندان کی عورتوں کے یکے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے، اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں۔“

(حیات جاوید، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۰۸-۶۰۹)

۴- سر سید احمد خاں کی والدہ عزیز النساء دکنم، خواجہ فرید الدین احمد کی بڑی بیٹی تھیں۔ دوسری بیٹی کا نام فاطمہ دکنم اور تیسری بیٹی فخر النساء دکنم تھیں۔“

(سیرۃ فریدیہ، ص ۳۵)

عزیز النساء دکنم کے دو بھائی تھے: خواجہ وحید الدین احمد اور خواجہ زین العابدین خاں (سیرۃ فریدیہ، ص ۳۹)۔ خواجہ فرید الدین احمد کی ایک ہی بیوی تھیں اور ان سے پانچ اولادیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں، تین تین برس کے فاصلے سے غالباً ۱۲۰ھ مطابق ۱۷۹۲ء کے پیدا ہو چکی تھیں۔“

(سر سید احمد خاں، سیرۃ فریدیہ، ص ۸)

۵- دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۳۵

۶- سیرۃ فریدیہ، ص ۳۷ اور ص ۳۶-۳۷

۸- ”سیرۃ فریدیہ“ (ص ۵۱) کے مطابق سر سید احمد خاں کے ان ”دوست“ کا نام حکیم غلام نجف خاں تھا۔ حکیم غلام نجف خاں کے حالات میں دیکھئے دلی اور طب یونانی، حکیم سید گل الرحمن، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۱-۱۹۳۔ نیز رجوع کیجئے آثار الصنادید (سید احمد خاں)، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، اردو اکادمی، دلی، ۱۹۹۰ء، ص ۵۰-۵۱

۹- دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۳۷

۱۰- سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر، شیخ الشیوخ حضرت مولانا شاد غلام علی سے وصیت تھے۔ وہ ”سید الاخبار“ کے مالک اور مدیر رہے۔ ۱۸۳۵ء میں بمصر ۳۷، ۳۸ برس انتقال ہوا اور قبرستان خواجہ باقی باللہ دہلی میں تدفین عمل میں آئی۔ (حالی، حیات جاوید، ایضاً، ص ۳۵)

۱۱- دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۲-۵۳

۱۲- دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۳۹

۱۳- حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی (ولادت ۱۷۲۶ء، وفات ۱۸۲۳ء) کے حالات میں دیکھئے: آثار الصنادید،

- سر سید احمد خاں، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، ایضاً ص ۵۵-۵۷، نیز ص ۲۶۵-۲۶۶
- ۱۳- سید حامد کا انتقال جنوری ۱۸۹۳ء میں ہوا (مکتوب سر سید، نام نیاز محمد خاں مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۹۳ء) حالی نے لکھا ہے کہ سر سید احمد خاں پر ”سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ نہایت سخت ہوا تھا۔ پندرہ برس روز تک ان کی حالت نہایت نازک رہی۔“ (حیاتِ جاوید، ص ۷۳۱)
- ۱۵- سر سید احمد کے چھوٹے بیٹے سید محمود (ولادت ۲۲ مئی ۱۸۵۰ء، وفات ۸ مئی ۱۹۰۳ء) کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں دیکھئے: ببائے اردو مولوی عبدالحق کی کتاب—چند ہم عصر، ایضاً، ص ۱-۱۲
- ۱۶- رجوع کیجئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۰
- ۱۷ و ۱۸- سیرۃ فریدیہ، ص ۵۲ اور ص ۳۱ (علی الترتیب)
- ۱۹ و ۲۰- دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۲ اور ص ۵۶۵۳
- ۲۱- تاریخ و وقایع: یکم ربیع الثانی ۱۲۷۳ھ / مطابق نومبر ۱۸۵۷ء، حوالہ: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۷
- ۲۲- سیرۃ فریدیہ، ص ۳۹
- ۲۳ و ۲۴- سیرۃ فریدیہ، ص ۵۱ اور ص ۵۳
- ۲۵- تعلیم نسواں کے بارے میں ببائے اردو مولوی عبدالحق کے اس نقطہ نظر کی تائید، ان کی ایک قدیم تر تحریر (مطبوعہ رسالہ ”معلم نسواں“ جلد ۱۰، نمبر ۳، سال ۱۸۹۶ء) سے بھی ہوتی ہے۔ تب سر سید، حیات تھے اور مولوی عبدالحق ان کے مدرسہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ دیکھئے: ریلوی، گورنمنٹ کالج، لاہور، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۸۔



”سادگی و ہر کاری کمالِ صناعتی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ سر سید کی تحریر اس لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، ہر اثر، اور ہر خلوص تھی۔“

— ببائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

گشتی کتب خانہ

از:
مناوی عبدالحق

تخریج: مارچ ۱۹۴۵ء

”گفتی کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے تیسرے سالانہ جلسے میں بابائے اردو قبلہ مولوی عبدالحق صاحب کی تقریر خود اپنے قلم سے لکھ کر ۹۔ مارچ ۱۹۴۵ء بمقام ساگر ٹاکنز اکیلیٹر تھیٹر (میں) پڑھی اور میں نے قبلہ سے بہ غرض حفاظت چھین لی۔۔۔۔۔“

عمریافعی!

۵/۴۵۴ ف

اس نادر تقریر کا قلمی مسودہ جو خود بابائے اردو کے سواد تحریر میں ہے عبدالحمد صاحب (اردو ریسرچ سینٹر حیدر آباد دکن) کے کتب خانے میں پھٹے ہوئے اوراق کی شکل میں موجود ہے۔۔۔۔۔ جناب مصلح الدین سعدی نے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کو مسودے کے بیس شکستہ ٹکڑوں کو جوڑ کر بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس تقریر کو محفوظ کیا اور اس کی ایک صاف اور مصدقہ نقل اپنے لاہور کے ایک پھیرے میں مجھے فراہم کی۔ ان کے شکرے کے ساتھ اسے ذیل میں محفوظ کرتا ہوں۔

[سید معین الرحمن]

”۔۔۔۔۔ حال (۱۹۴۴-۴۵ء) ہی میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو ابھی لندن سے واپس آئے ہیں۔ وہ کئی سال سے وہاں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ ایک مدت سے لندن میں ہوں۔ آج

کل اردو کتاب وہاں ملتی نہیں اس لیے میں اپنی زبان و ادب سے بیگانہ سا ہو گیا ہوں۔ مجھے (کتابوں کی) ایک ایسی فہرست بنا دیجئے جن کا مطالعہ میرے لیے مفید ہو۔ اس میں جدید کتابیں بھی ہوں۔

میں نے کہا کتابوں کی فہرست میں بنا دوں گا لیکن ”ہماری کتابیں“ بھی پڑھا کیجئے۔ وہ سمجھے میرا منشاء مری اپنی انجمن ترقی اردو کی کتابوں سے ہے۔ میں نے کہا نہیں ”ہماری کتابیں“ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو سید علی شہر حاتمی صاحب حیدر آباد سے شائع کرتے ہیں۔ اس میں اردو کی نئی کتابوں کا خاص طور پر ذکر ہوتا ہے۔ یہ گشتی کتب خانہ انجمن ترقی اردو کا ہونہار بچہ ہے۔

کتب خانہ اب ہماری زندگی کے لوازم میں سے ہو گیا ہے۔ علمی معلومات اور تحقیقات کے لیے اس کا ہونا ناگزیر ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بے شبہ علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن وہاں زیادہ تر طالب علموں کا مقصد امتحان پاس کرنا اور استادوں کا امتحان پاس کرانا ہوتا ہے۔ اس میں ان کا تصور نہیں نظام تعلیم ہی ایسا ہے۔ یہ نہ بھی ہو تو بھی بی اے کے طالب علم کے نصاب میں اُس کے فن کی صرف چند کتابیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی فن کی چند کتابیں پڑھ کر کوئی شخص عالم نہیں ہو سکتا۔ علم کی پیاس بجھانے کے لیے اسے کتب خانوں میں آنا پڑتا ہے۔

اگر آپ ایسے باکمال اشخاص کی فہرست بنا لیں جنہوں نے علم و ادب میں کارہائے نمایاں کیے ہوں اور ان کے حالات کی تحقیق کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کی وہ علمی تحقیقاتیں جن پر دنیا فخر کرتی ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں (تکمیل) نہیں پائیں بلکہ انہوں نے کتب خانوں میں بیٹھ کر شب و روز محنت اور دماغ سوزی سے انجام دی ہیں۔ کتب خانوں کا احسان کچھ کم نہیں ہے۔

کتاب خانے میں ہر قسم کی کتابیں رکھنی پڑتی ہیں۔ ہر فن اور علم کی مستند اور اعلیٰ پائے کی کتابوں کا رکھنا لازم ہے لیکن بُری بھی ہر طرح کی کتابیں رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ لوگ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں۔ ایک کتاب جسے میں بُری سمجھتا ہوں

دوسرا اسے اچھی خیال کرتا ہے کیوں کہ یہ لوگ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ یا ایک کتاب میں شوق سے پڑھتا ہوں دوسرے کی نظر میں بالکل بیکار ہے۔ بعض اوقات بُری کتاب کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ڈھونڈنے سے ملتی نہیں۔

مجھے اُردو لغات کی ترتیب میں بعض ایسی کتابوں کی ضرورت پڑی جو بہت ناپاک خیال کی جاتی ہیں اور بڑی مشکل سے دستیاب ہوئیں۔ ان میں بعض ایسے الفاظ اور محاورے کی نظیریں ملیں جو دوسری کتابوں میں نہیں تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ کھوٹا پیسا اور برا بیٹا وقت پر کام آ جاتا ہے۔ یہی حال ایسی کتابوں کا بھی ہے۔ اس وجہ سے بعض لوگ عام طور پر کتابوں سے خصوصاً جدید کتابوں سے بدگمان ہیں۔

ایک مدرسے کے طالب علموں نے کسی ناراضی کی وجہ سے ہڑتال کر دی۔ مدرسے کے ناظم صاحب نے اردو کتب خانہ مقفل کر دیا اور فرمایا کہ اردو کتابیں پڑھنے سے لڑکوں میں باغیانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں اب تک یہ نہ معلوم تھا کہ اور شاید کبھی نہ ہو کہ اردو کتابیں پڑھنے سے اتنے باغیانہ خیالات پیدا نہیں ہوتے جتنے ادارے کے منتظموں کے برتاؤ اور رویے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کتابیں بے چاری مفت میں بدنام ہیں۔

کتابوں کی چوری بھی ہوتی ہے۔ یہ فن شریف اس قدر عام اور مقبول ہوا کہ نیک دل کتاب چوروں نے اس کے لیے ایک مسئلہ گھڑ لیا کہ کتاب کی چوری چوری نہیں ہوتی۔ کوئی اس کے دل سے پوچھے جس کی کتابیں چوری کی جاتی ہیں۔

سنا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ مرض عام ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا کتب خانہ ہو جہاں سے کوئی کتاب چوری نہ کی گئی ہو۔۔۔۔۔۔ یا کتابوں میں سے کچھ ورق یا تصویریں غائب نہ کر لی گئی ہوں۔ اس وجہ سے بعض کتب خانوں کے ناظم نگرانی میں بہت سختی اور کتابیں دینے میں بہت سخت کرتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ کتب خانہ آصفیہ جب کہ وہ اس مکان میں تھا جہاں آج کل (۱۹۴۵ء میں) نظامت (صدر) پٹہ خانہ کا دفتر ہے۔ مولوی علی حیدر طباطبائی مرحوم

اس کے مہتمم تھے۔ وہ بیچ ہال میں بیٹھے رہتے تھے اور اردگرد دیوار سے لگی ہوئی الماریاں ہوتی تھیں۔ جب کوئی ان سے کتاب مانگنے آتا، انہیں بہت گراں گزرتا۔ تھوڑی دیر تو خاموش رہتے کہ شاید یہ بلا ٹل جائے لیکن جب دیکھتے کہ یہ ٹالے سے نہیں ٹلتا تو وہ کمر بند سنبھالتے ہوئے اٹھتے، کیوں کہ الماریوں کی کنجیاں ان کے کمر بند سے بندھی ہوئی لٹکتی رہتی تھیں۔

کمر بند ہاتھ میں لے کر وہ الماری کا قفل کھولتے اور کتاب نکال کر حوالے کر دیتے جب تک وہ کتاب پڑھتا رہتا یہ تیز نظروں سے دیکھتے رہتے۔

نگرانی ضرور ہونی چاہیے مگر نہ ایسی کہ وہ ناظرین (قارئین) کی تکلیف کا موجب ہو۔ کتب خانوں میں ناظموں اور کارکنوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ہم درد ہوں اور ناظرین کو ہر قسم کی سہولت پہنچا دیں۔ بعض ناظم جو خود بھی قابل ہوتے ہیں نہ صرف ناظرین کو کتابوں کی تلاش میں مدد دیتے ہیں بلکہ ایسی کتابوں اور رسالوں کا پتہ بھی بتا دیتے ہیں جن کے مطالعے سے ناظرین (قارئین) کو اپنے موضوع کی تحقیق میں مدد ملتی ہے۔

آج کل کتاب خانوں میں مختلف قسم کے رسالے اور اخبار بھی رکھے جاتے ہیں۔ ان سے روزہ مرہ کے واقعات اور حالات حاضرہ سے واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ ایک بار نواب عماد الملک مرحوم کتب خانہ آصفیہ کے معائنے کے لئے آئے۔ یہی اس کے بانی اور سرپرست اور صدر تھے۔ اس وقت کتب خانے میں ایک ایرانی بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ہو لیے اور شکایت کرنے لگے کہ اس کتب خانے میں صرف دو چار اخبار آتے ہیں۔ اب زیادہ تعداد میں مختلف قسم کے اخباروں کو منگوانے کا انتظام ہونا چاہئے نواب صاحب نے فرمایا ”آغا“ این کتب خانہ است طوطی خانہ نیست“ نواب صاحب کا خیال تھا کہ اخبار زیادہ تعداد میں ہوں گے تو لوگ کتابیں نہیں پڑھیں گے۔۔۔۔۔ اور اسے وہ ناپسند کرتے تھے۔

پہلے ایسا ہو تو ہو لیکن اب کتب خانوں میں رسالوں اور اخباروں کا ہونا بہت

ضروری ہے۔ ان میں بعض اوقات بڑی کام کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسے نئے مضامین اور تحقیقاتیں ہوتی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتی اس لیے ان کی جلدیں محفوظ رکھنی پڑتی ہیں۔ کتب خانوں کے ہوتے ہوئے بھی اکثر اصحاب ان سے استفادہ نہیں کر سکتے کچھ تو اپنی کاپی کی وجہ سے اور کچھ مصروفیت کی وجہ سے۔ گشتی کتب خانہ ایسے صاحبوں کے لیے بڑی سہولت اور برکت کا باعث ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے لوگوں کو کتابیں پہنچ جاتی ہیں اور وہ اپنی فرصت کے وقت ان کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ ایسے کتب خانوں کو چلانے کے لیے بڑی تنظیم اور مستعدی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لوگوں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔۔۔۔۔ اور کتابیں وقت پر ملتی رہیں۔

سید علی شبر (حاتمی) صاحب (نے) گشتی کتب خانہ قائم کر کے بہت ہی قابل قدر کام کیا ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک بہت بڑے مقصد کو پورا کیا ہے۔ کتب خانے کے لیے دو تین باتوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ایک تو یہ عمارت ناقص اور بوسیدہ نہ ہو ورنہ کتابوں کے خراب ہونے اور ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ روشنی اور ہوا کا کافی انتظام ہو۔ کارکن ہمدرد ہوں اور اپنے شوق سے کام کریں۔ یہ سب باتیں گشتی کتب خانے کو میسر ہیں اور اس کے ناظرین کے روز افزوں اضافے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ اگر اس کی اپنی عمارت بن جائے تو اس میں اور زیادہ ترقی ہو اور بہت ممکن ہے یہ کتب خانہ ایک دن تعلیمی اور تہذیبی مرکز بن جائے۔

ایسے کتب خانوں کے لیے سرکاری امداد کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ کتابوں کے ذخیرے میں معقول اضافہ ہو سکے اور کارکنوں کو ایسی تنخواہ دی جاسکے کہ وہ اپنے کام کو زیادہ شوق اور مستعدی سے انجام دے سکیں۔ سرکاری امداد سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کتب خانے کے کام میں زیادہ توسیع ہو سکے گی یعنی ایسے مقامات پر اس کی شاخیں قائم کی جاسکیں گی جہاں ان کی شدید ضرورت ہو۔۔۔۔۔ اور جہاں کتابوں کے میسر ہونے کا کوئی انتظام یا موقع نہیں ہے۔ بغیر ایسی امداد کے کتب خانے کو بہتر حالت میں رکھنا اور ترقی دینا ممکن نہیں۔

جنگ کے بعد حالات میں بہت تغیر و تبدل ہونے والے ہیں۔ تعلیم کی توسیع کی بہت سی تجویزیں پیش ہو رہی ہیں اور ہوں گی۔ ان تجویزوں میں کتب خانوں کے قیام اور توسیع کا مسئلہ بھی بحث میں آئے گا۔۔۔۔۔ کیوں کہ مدارس اور کالجوں کے بعد کتب خانے علم کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں بلکہ بعض اعتبار سے ان سے بھی برتر ہیں۔ امید ہے کہ اس وقت یہ گشتی کتب خانہ اپنے حق سے محروم نہ رہے گا اور اسے معقول امداد دی جائے گی۔

سید علی خیر حاتمی صاحب کتابیں بیچتے ہیں کتابیں چھاپتے ہیں کتابیں لکھواتے ہیں کتابیں تقسیم کرتے ہیں کتابوں کی فہرستیں مرتب کرتے اور شب و روز کتابوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری آپ کی سب کی کتابوں کے اشتہار دیتے ہیں گویا سراپا کتاب ہیں۔۔۔۔۔ جب وہ مجھ سے ملتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی کتاب چلی آ رہی ہے اور میں بے ہذا کتاب لاریب فیہ کا وزو کرنے لگتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات میں مجھے اب تک شبہ ہے کہ وہ خود بھی کتابیں پڑھتے ہیں یا نہیں!؟ مولوی تصدق حسین مرحوم کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم تھے۔ بڑے نیک دل اور صاحب علم بزرگ تھے۔ وہ بھی اسی طرح کتابوں کا ذکر کرتے، فہرستیں لکھواتے، کتابوں کی ترتیب دینے میں مصروف رہتے لیکن کتابیں پڑھتے انہیں بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانوں کے ناظموں کا حال ان کلاوں کا سا ہے جو سب کو پلاتے ہیں اور خود نہیں پیتے! خیر وہ خود پئیں یا نہ پئیں لیکن دوسروں کی پیاس بجھانا بھی خود ایک نیک کام ہے۔

خیر صاحب بہت نیک سیرت ہمدرد مستعد اور صالح نوجوان ہیں۔ ہر وقت مصروف رہتے ہیں اور اپنے کام سے انتہا درجہ شوق ہے۔ انہیں کارکن بھی ایسے ہی اچھے ملے ہیں۔ گشتی کتب خانہ قائم کر کے انہوں نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہم سب کو ان کی اعانت کرنی چاہیے اور قدر کرنی چاہیے اور ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ شکریہ۔

[۹۔ مارچ ۱۹۴۵]

حوالے اور حواشی

۱۔ ابو محمد الیافعی، ولادت حیدرآباد دکن ۲۳ جون ۱۸۹۴ء، وفات: حیدرآباد دکن ۲۳۔ اگست ۱۹۶۱ء بابائے اردو کے دیرینہ رفیق ۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۱ء تک بابائے اردو اور عمر یافعی کے مابین قریبی مراسم رہے۔ ان کے حالات میں دیکھیے، مضمون ۱۲: سخاوت مرزا، مطبوعہ قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۷۸ء، ص ۱۸..... ۲۲۔

نیز دیکھیے: قومی زبان، اگست، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۵-۱۲۹

۲۔ ”اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن کے رسالے ”اقبال ریویو“ کے ایڈیٹر مصلح الدین سعدی بڑے اقبال پرست اور پختہ کار ادیب ہیں.....“ ڈاکٹر گیان چند، ہماری زبان دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۶ء ص ۵۔

۳۔ مصلح الدین سعدی صاحب کے بقول ”یہاں کاغذ پھٹ گیا ہے، یہ لفظ ربط عبارت سے پڑھا گیا.....“ (معین الرحمن)

۴۔ مصلح الدین سعدی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ”یہ جملہ سیدھے جانب حاشیے پر بعد میں لکھا گیا ہے۔“ (معین الرحمن)

۵۔ مصلح الدین سعدی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ”یہ تحریر حاشیے پر بائیں جانب درج ہے.....“ (معین الرحمن)

۶۔ ”یہ جملے حاشیے پر درج ہیں“ (مصلح الدین سعدی)

۷۔ ”یہ فقرہ حاشیے پر سیدھی جانب درج ہے“ (سعدی)۔

”حیدرآباد میں شتی کتب خانہ ہرگز انجمن کا نہ تھا۔ اس کے مالک بلا شرکت غیر نے شہر حاشی صاحب تھے اور ان کا یہ کمال تھا کہ اسے یہاں (کراچی) لے آئے اور انجمن کی نذر کر دیا۔ یہ ان کا اتنا بڑا احسان ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس نے میری اور خصوصاً انجمن کی بڑی خدمت کی ہے اور اس احسان کو تسلیم نہ کرنا بڑی ناشکری ہوگی۔“

۱۔ بابائے اردو، بنام محمد امین زبیری، ۳۔ جنوری ۱۹۵۳ء، قومی زبان

کراچی اگست ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۷

انجمن ترقی اردو پاکستان

اسپتال روڈ - کراچی ۱

مورخہ مارچ ۱۹۵۳ء

نمبر _____

عزیز
 آپ کا خط پہنچا جس نے ایک ایسی بہ تازہ
 کورس میرے لیے جو بہت ہی - آپ کا والد حضرت شیخ کرم اللہ
 گوچر اللہ دشن ہی اسکول میں معلم تھے اور میں طالب علم
 تھا۔ وہ میرے حال پر بڑے مہربان تھے اور بہت شفقت فرماتے تھے۔
 کچھ دنوں بعد میں علی گڑھ چلا آیا۔ اور ایم۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔ اے۔
 اسکول میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اسکول بہت بگڑا ہوا تھا اور
 مسلم ایجوکیشن ڈائری نے اس اسکول کو ترک کر دیا تھا۔ اس موقع پر ان کے
 اس میں سرکار کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر ان کے
 مددگاری سے اور وہ مجھے لے کر بہت فوش ہوئے۔ تعلیم کے
 فروخت کے بعد میں حیدرآباد آگیا۔ دن چلا گیا۔ بہت ٹھنڈے دن
 جب میں صوبہ اترک کا صدر مستقیم توہیات تھا۔ آپ کا والد کا
 خط آیا۔ (انہوں نے شاید اخباروں میں نام پڑھا تھا) اور مجھ
 سے دریافت کیا کہ تم وہی علی گڑھ ہو۔ جو کچھ وہ لکھتے ہیں

بشکریہ ڈاکٹر سید معراج تیر

جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں وہی ہوں تو فہم بہت خوش ہوئے
اور کہیں کہیں پڑھنے والے مجھے کتابیں طلب کر لیا کرتے تھے۔

آپ نے ایک بھائی تھے جن کا نام غالباً محبوب الہی
(یا کچھ ایسا ہی) تھا جو میڈیکل کالج پورے میں تعلیم پاتے تھے۔ ان ایک

خدا اورنگ آباد میں تھے۔ جس میں لکھا تھا کہ میں بدھ اس
جارج ہیں (شیر میڈیکل کالج سے ہیں) اور ولکی میں

اورنگ آباد آ کر آپ سے ملوں گا۔ بعد میں ان کا خط آیا کہ
بعض وجوہ سے اورنگ آباد آئے اور سیر سے لاہور چلا گئے۔

وہ کہاں ہیں اور کب آئیں گے؟
معلم نہیں کہہ سکتے تھے۔

گورنمنٹ کورسز اسٹریٹنگ تھا۔ اس کے بعد اس نے
بھنگا پر اور تجارت و صنعت کا مرکزی۔ اس کے بعد اس نے

گورنمنٹ میں تھے اور انہوں نے اپنا بیسہ دار اخبار (بیسہ لفظی)
وہیں لگا رکھا۔

آپ اور آپ کا بھائی اور دو سرے افراد شامل
ہا کیا شغل ہے؟ کچھ لکھنا ہے تو آپ کے فہم میں لگا۔

وہاں
ہاں

لیٹی میں سے خالد نواز ربانی سے ویدت

اپنے خاندان، اعلیٰ تان

کے نام بیباک۔ دو کے ایک اہم مطوب ہاں

میرا کتب خانہ

معاونت بدلتی

”میرا کتب خانہ“ کے موضوع پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی درج ذیل تقریر آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو کے پندرہ روزہ رسالے ”آواز“ دہلی (جلد ۱۱، نمبر ۱۳) شمارہ ۲۲۔ جون ۱۹۴۶ میں شائع ہوئی رسالہ ”آواز“ کے اس شمارے کا تراشہ میرے ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔۔۔۔۔“

[ڈاکٹر سید معین الرحمن]

کتاب مونس تنہائی ہے۔ شفیق دوست اور معلم بھی۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر کتابیں وہ ہوتیں، یا کوئی ایسی آفت نازل ہو جائے کہ تمام کتابیں معدوم ہو جائیں تو دنیا کا کیا حال ہو۔ ظاہر ہے کہ ہماری دماغی اور روحانی دولت تو تلف ہو ہی جائے گی لیکن زندگی کا لطف بھی جاتا رہے گا۔

ہر شہر میں سرکاری غیر سرکاری بڑے چھوٹے کتب خانے ہوتے ہیں لیکن اس سے آدمی کی اپنی ضروریات پوری نہیں ہوتیں عداً اس لئے اکثر اشخاص، غریب سے غریب بھی یہاں تک کہ بعض مودھو بھی اپنے نجی کتب خانے رکھتے ہیں۔ یہ ان کے شوق اور پسند کا گنجینہ ہے۔ پسند کو انسان کی زندگی میں بڑا دخل ہے۔ پسند ایک قدرتی فعل ہے۔ ایک زندہ شخص اس لئے زندہ ہے کہ وہ پسند یا ناپسند کر سکتا ہے۔

پہلے ہمارے پڑھے لکھے گھرانوں میں کتابیں لازمی طور سے ہوتی تھیں اور جو صاحب علم اور کتابوں کے شائق ہوتے، ان کے کتب خانے تو بڑے مشہور اور قابل قدر

ہوتے تھے۔ ہمارے ملک میں مطبع کے اجراء کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا۔ اس لئے ان نجی کتاب خانوں میں قلمی کتابیں ہی ہوتی تھیں۔ ان کے لئے کاتب رکھے جاتے تھے۔ اکثر شوقین اور خصوصاً جو صاحب استطاعت نہ ہوتے وہ اپنے شوق کی کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر اپنے کتاب خانوں میں رکھتے۔ ان کو ان کتابوں سے اور کتابوں کی بدولت علم سے محبت ہو جاتی تھی۔

میں جب علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا تو میں نے آزاد بلگرامی کی کسی کتاب میں درویش شاہ مسافر (اورنگ آباد دکن) کے کتاب خانے کی تعریف پڑھی۔

انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ایسا وسیع اور اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے کہ چھ مہینے میں صرف ایک حصے کی سیر کر پایا۔ یہ پڑھ کر مجھے اس کتب خانے کے دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس وقت اورنگ آباد تک ریل نہ تھی۔ احمد نگر سے تانگے میں جانا پڑتا تھا۔ وہاں گیا تو سخت افسوس اور مایوسی ہوئی۔ تین چار الماریاں رکھی تھیں۔ ان میں کچھ تو قلمی کتابیں تھیں اور باقی مطبوعہ۔ نادر کتاب کوئی بھی نہ تھی۔ عمارت کے نیچے ندی بہتی ہے۔ ہر سال برسات میں جب ندی چڑھاؤ پر ہوتی تو ان کتابوں کے بہت سے صندوق جو دیمک اور کیتروں کی نذر ہو چکی تھیں، بہا دیئے جاتے ہیں تاکہ بے ادبی نہ ہو۔ ایسے سینکڑوں کتاب خانے جو ہماری دولت علم کے بے بہا خزانے تھے ہماری جہالت اور غفلت اور اس ملک کی ناموافق آب و ہوا کی بدولت تباہ و برباد ہو گئے۔

مجھے کتابوں کا ابتدا سے شوق رہا۔ طالب علمی میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ ادب، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں اور جمع بھی کیں لیکن جب اردو زبان کی طرف خاص توجہ ہوئی اور پھر انجمن ترقی اردو کا بار مجھ پر پڑا تو میں نے اردو کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرنی شروع کیں۔ ان میں زیادہ تر قدیم اردو کی قلمی کتابیں ہیں کوئی اڑھائی تین ہزار ہوں گی۔ نویں صدی ہجری سے لے کر بعد تک کی۔ یہ ہماری زبان کے اتار چڑھاؤ اور ارتقاء کا آئینہ ہیں۔ یہ کتابیں میں نے کیونکر حاصل کیں، ایک طویل داستان ہے اور بہت دلچسپ۔ اکثر قیمتاً خریدیں۔ بعض احباب نے نذر کیں

اور چند ایسی بھی ہیں نقل کروائیں یا فوٹو سٹاٹ (photo stat) کے ذریعے سے حاصل کیں۔ چونکہ ابتداء اردو کا ادب دکن اور گجرات میں پھولا پھلا۔ اس لیے ان علاقوں کی خاک چھانی۔ جب میرے شوق کا حال معلوم ہوا تو حیدر آباد میں بعض احباب پرانی کتابیں تلاش کر کے لاتے اور میرے ہاتھ بیچ جاتے۔ اس میں میں بہت بدنام ہوں۔ لوگوں کو شکایت تھی کہ میں نے زیادہ قیمتیں دے دے کر نہن بڑھا دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ نادر اور قلمی کتاب کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ یہ خریدنے والے کے شوق اور بیچنے والے کی ضرورت پر ہوتی ہے۔ ڈر یہ ہوتا ہے کہ اگر اس وقت ہاتھ سے نکل گئی تو پھر شاید ہاتھ نہ آئے۔ بعض اوقات ایسا ہوا بھی جس کا پچھتاوا مجھے اب تک ہے۔

ابتدائی اردو کی نشوونما میں صوفیا کا بڑا حصہ ہے۔ تھے تو وہ فقیر لیکن ان کا اثر اور اقتدار بادشاہوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس لئے کہ وہ مرجع خلایق تھے اور امیر غریب عام خاص جاہل و عامی بلا امتیاز قوم و ملت ان کے ہاں حاضر ہوتے اور کسپ فیض کرتے۔ اپنے عقائد و اصول کی تلقین کے لئے جہاں انہوں نے اور ڈھنگ اختیار کئے تھے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی عام زبان سیکھیں اور اپنا پیغام عوام تک پہنچائیں اور وہ زبان جو ہر جگہ ان کے کام آئی۔ اس وقت اردو کی قدیم صورت تھی۔ اس میں انہوں نے زبانی ہی تلقین نہیں کی بلکہ بہت سی کتابیں اور رسالے بھی لکھے جو تقریباً سب نظم میں ہیں۔ کیونکہ نظم بالطبع زیادہ مرغوب ہوتی ہے اور لوگ اسے آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان بزرگوں کے اکثر جانشین علم و معرفت سے بے بہرہ ہیں اور اپنے اسلاف کا سرمایہ برباد کر چکے ہیں پھر بھی تلاش کرنے سے اس کی کھر جن میں بہت سے انمول جواہر ملے۔

حیدر آباد دکن کے تو اکثر مقامات کا دورہ کیا لیکن اس کے علاوہ گجرات، میسور، بیجاپور وغیرہ علاقوں میں بھی بار بار گیا اور محنت کا پھل پایا۔ یوں تو میرے کتب خانے میں انگریزی، فارسی، عربی کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں بعض مثلاً تذکرۃ الخواتین وغیرہ ایسی ہیں جو ہندوستان کے کسی کتب خانے میں نہیں لیکن یہ بیان بہت طویل ہو جائے گا

اس لئے میں صرف قدیم اردو کی ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نایاب ہیں اور جن میں سے اکثر دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں پائی جاتیں۔

سب سے اول میں صوفیا کے کلام کا ذکر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں میں نے ان قدیم ملفوظات کو بھی جمع کیا جن میں حالات کے ساتھ ان کے بعض اقوال بھی درج ہیں مثلاً ان کتابوں میں شیخ فرید الدین شکر گنج (ولادت ۵۶۱ھ) شیخ حیدر الدین ناگوری (ولادت ۵۹۰ھ) شیخ بوعلی قلندر (وفات ۷۲۲ھ) شیخ سراج الدین عثمان (ولادت ۷۵۸ھ) شیخ شرف الدین مکنی (ولادت ۶۶۲ھ) شیخ برہان الدین غریب (وفات ۷۳۸ھ) حضرت گیسو دراز بندہ نواز (وفات ۸۲۵ھ) حضرت قطب عالم (ولادت ۷۹۰ھ) اور ان کے فرزند شاہ عالم۔ سید محمد جوپوری (ولادت ۸۲۷ھ) وغیرہ بزرگوں کے اقوال قدیم اردو زبان میں پائے جاتے ہیں۔

ان میں سے ان چند ایسے ملفوظات کا ذکر کرتا ہوں جو میرے کتب خانے میں

ہیں:

جمعات شاہمہ:- اس میں حضرت شاہ عالم کے اقوال بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر نظم میں اور ان کے والد شاہ قطب عالم کے بھی اقوال درج ہیں۔ شیخ عبدالقدوس کنگوہی (ولادت ۸۶۰ھ) کی ایک تصنیف رشد نامہ اتفاق سے مجھے مل گئی۔ اس میں ان کے بعض اقوال نظم میں ہیں۔ یہ اس وقت کی زبان ہے جب کہ اردو جنم لے رہی تھی۔ ایک شعر ریختے کے نام سے بھی درج ہے۔ ایک کتاب مقصود المراد ہے جس میں حضور سید شاہ ہاشم کے بہت سے اقوال قدیم اردو زبان میں ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری (وفات ۹۷۰ھ) کے بھی بعض اقوال درج ہیں۔ مثلاً سید ہاشم کا ایک قول نظم میں ہے:

دنیا کے لوگ کیرے کھوڑے
گھو شہد پہ دوڑاتے گھوڑے
ڈوبتے بہت نکلتے تھوڑے

شیخ وجیہ الدین علوی بہت بڑے عالم اور صاحبِ باطن بزرگ ہوئے ہیں۔ (وفات ۹۱۰ھ) ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے ہیں جس کا نام ”بحر الحقائق“ ہے۔ اس میں جگہ جگہ ان کے اقوال پائے جاتے ہیں جو ابتدائی اردو میں ہیں۔ مثلاً اپنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہووے کام اس کا ہے۔

یہ ملفوظات بڑے کام کی چیز ہیں۔ ان سے ان لوگوں کی سیرت و حالات تو معلوم ہوتے ہی ہیں لیکن ہمارے لئے سب سے اہم ان کے وہ اقوال ہیں جن سے ابتدائی اردو کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

اب میں ان بزرگوں کی ان مستقل تصانیف کا ذکر کرتا ہوں جو میرے کتاب خانے میں ہیں اور جو اردو کی ابتدا اور اس کے ارتقاء کی نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

سب سے قدیم نظم جو مجھے ملی ہے اور اس سے پہلے کی اب تک کوئی دریافت نہیں ہوئی۔ وہ حضرت سید راجو قتال کی نظم ”سہاگن نامہ“ ہے۔ اس میں سہاگن کو کچھ نصیحتیں کیں ہیں۔ سید راجو قتال حضرت شاہ قطب عالم کے چچا اور حضرت مخدوم جہانیاں کے مرید اور خلیفہ تھے۔ یہ ۷۸۰ھ میں زندہ تھے اور سب سے پہلی نثر کی کتاب حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی ”معراج العاشقین“ ہے۔ جو میں مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔ حضرت بندہ نواز ۸۰۱ھ میں دہلی سے دکن کی طرف آئے۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ میراں جی شمس العاشق ہیں۔ ان کے خاندان نے دکنی اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ بیجا پور میں مقیم ہوئے۔ ان کا مزار بیجا پور کے باہر شاہ پور میں ہے۔ ان کا انتقال ۹۰۲ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ وفات) اور ان کے پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ (وفات ۱۰۸۶ھ) سب کے سب اس زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے اور ایک بزرگ نے مجھے ان کی کلام کا بہت ضخیم مجموعہ جو بہت خوشخط نسخے میں لکھا ہوا ہے، عنایت کیا۔ اس میں زیادہ تر مثنویاں مضامین معرفت پر ہیں اور دو تین رسالے نثر میں بھی ہیں۔ علاوہ مثنویوں کے دُھرے، خیال اور غزلیں وغیرہ بھی ہیں۔ یہ بڑا عجیب اور نادر مجموعہ ہے۔ اس میں علاوہ متفرق چھوٹی چھوٹی نظموں کے پندرہ سولہ مستقل رسالے

ہیں۔ سید میراں حسینی شاہ شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ یہ کئی رسالوں کے مصنف ہیں۔ لیکن ان کی سب سے ضخیم کتاب ”شرح تمہید ہمدانی“ ہے یہ ”تمہیدات عین القضاء“ کا ترجمہ ہیں۔ یہ ترجمہ قدیم نثر میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ سید میراں حسینی شاہ کا انتقال ۱۰۷۴ھ میں ہوا۔ قاضی محمود دریائی پیر پوری گجرات کے بڑے اولیاء اللہ میں ہیں۔ ان کا کلام اچھا خاصا ضخیم ہے اور گجراتی اردو میں ہے۔ ۹۴۱ھ میں انتقال کیا۔ ان کی زبان میں اکثر گجراتی لفظ آتے ہیں۔

شاہ علی محمد گام دھنی بھی گجرات کے بزرگ ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعہ کا نام جواہر اسرار اللہ ہے۔ ان کی زبان بھی گجراتی اردو ہے لیکن قاضی محمود دریائی سے کسی قدر سہل ہے۔ میاں خوب محمد چشتی کا تعلق بھی گجرات سے ہے۔ یہ سن ۹۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۲۲ھ میں انتقال کر گئے۔ ان کا ایک رسالہ بھاؤ بھید مناع و بدائع کلام میں ہے لیکن ان کی مشہور اور مقبول مثنوی ”خوب ترنگ“ ہے جو سن ۹۸۶ھ کی تصنیف ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ اس کی زبان زیادہ سہل اور صاف ہے۔ بابا شاہ حسینی ایک بزرگ شاہ علی جیو کے مرید ہیں ان کا پورا دیوان ہے۔ کلام صوفیانہ ہے اور زبان میں سلاست اور صفائی ہے۔

میں نے قدیم اردو کے خاص خاص صوفیا کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ گیارہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانے کی سینکڑوں کتابیں ہیں جن کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ میرے کتب خانے میں قدیم گجراتی اور دکنی اردو میں قرآن پاک کی سورتوں کے ترجمے اور تفسیریں بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان پر میں ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں۔

اب میں قدیم اردو کے غیر صوفی شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کرتا ہوں۔ پہلا شاعر جس کا پتہ اب تک لگا ہے وہ نظامی ہے جو احمد شاہ بہمنی کے عہد میں تھا۔ (احمد شاہ سن ۸۲۵ھ میں تخت نشین ہوا) اس نے ایک مثنوی کدم راؤ اور پدم راؤ کے قصے میں لکھی ہے۔ میرا نسخہ آخر سے ناقص ہے۔ اس لئے سنہ تصنیف نہ معلوم ہو سکا اور افسوس کہ اس کا

دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ لیکن قدیم دکنی اردو کا اصل اور جامع شاعر سلطان محمد علی قطب شاہ ہوا ہے۔ جو ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے ہر صنف سخن میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

میرے پاس ایک قدیم مثنوی نو سربار نام کی ہے جس میں واقعہ کربلا کا بیان ہے۔ یہ ایک شاعر اشرف کی تصنیف ہے۔ سنہ تصنیف ۹۰۹ھ ہے۔

اب صرف چند خاص کتابوں کا ذکر کروں گا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں رزمیہ کلام نہیں لیکن قدیم اردو کی کئی رزمیہ مثنویاں میرے کتب خانے میں ہیں۔ ایک مرزا مقیم کی فتح نامہ یکھیری جس میں سلطان محمد عادل کی ایک لڑائی کا بیان ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۳۷ھ۔ دوسری فتح نامہ نظام شاہ حسن شوقی کی تصنیف جس میں وجیا نگر اور شاہان دکن کی لڑائی کا مذکور ہے۔ تیسری علی نامہ جو دکن کے عالی پایہ شاعر نصرتی کی تصنیف ہے ۱۰۷۶ھ اس میں بیجا پور کے سلطان علی عادل شاہ اور مغلوں کی جنگ کا حال نہایت تفصیل اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی بھی نایاب ہے۔ چوتھی تاریخ سکندری۔ یہ نصرتی کی تصنیف ہے (۱۰۸۳ھ) اس میں عادل شاہ خاندان کے آخری بادشاہ سکندر اور سیوا جی کی لڑائی کا بیان ہے۔ یہ مثنوی سوائے میرے کتب خانے کے کہیں اور نہیں ہے۔ میرے ہاں نصرتی کی ایک عشقیہ مثنوی ”گلشن عشق“ بھی ہے۔

قدیم اردو میں یوسف زلیخا کا قصہ کئی دکنی شاعروں نے لکھا ہے۔ ان میں چار مثنویاں زیادہ پرانی ہیں جو میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ایک شیخ احمد شریف کی محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے۔ دوسری محمد ابن احمد تخلص عاجز کی جو ۱۰۲۲ھ کی تصنیف ہے۔ تیسری دکن کے مشہور شاعر ہاشمی کی جو ۱۰۹۹ھ کی تصنیف ہے۔ ہاشمی بہت خوش گو شاعر تھا۔ ریختی کا سب سے پہلا شاعر یہی ہے۔ چوتھی امین گجراتی کی جو ۱۱۰۹ھ کی تصنیف ہے۔ سید محمد گجراتی کی یوسف زلیخا بہت بعد کی ہے۔

وجہی بھی اس زمانے کا قابل ذکر شاعر و نثر ہے۔ اس کی مثنوی قطب مشتری تصنیف ۱۰۱۸ھ کا صرف ایک نسخہ میرے پاس تھا جو ناقص تھا۔ برٹش میوزیم کے

نسخ کی نقل حاصل کر کے میں نے یہ مثنوی شائع کر دی ہے۔ اس کی دوسری تصنیف سب رس ہے جو قدیم اردو نثر کی بہترین کتاب ہے جو میں شائع کر چکا ہوں۔ اسی عہد کے دوسرے مشہور شاعر ریاضی مصنف نجات نامہ۔ علی رحمتی مصنف نصیحت نامہ احکام الصلوٰۃ (۱۰۷۷) ابلیس نامہ۔ صنعتی مصنف قصہ تمیم انصاری (۱۰۷۵) فواتی مصنف سیف الملوک و بدیع الجمال ۱۰۴۹ھ ابن نشاطی مصنف پھول بن (۱۰۶۶) وغیرہ ہیں۔ یہ سب مثنویاں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس عہد کے اور اس عہد کے بعد کے بہت سے شعراء کا کلام میرے پاس موجود ہے۔ اس کا بیان 'بخوف طوالت ترک کرتا ہوں۔

البتہ دو ایک کتابوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ میرے کتاب خانے میں ایک نسخہ سلطان علی عادل شاہ کے دیوان کا بھی ہے جو نایاب ہے۔ اس کے علاوہ بیسیوں قدیم شعراء کے مرثیے بھی ہیں جو کہیں اور نہیں ملیں گے۔

ایک عجیب و نایاب کتاب بھی ہے۔ یہ خالق باری کے طرز پر ہے۔ اس کا مصنف اے چند پرونی چند ساکن سکندر آباد ہے۔ جس کا پتہ وہ یوں دیتا ہے: مستقل دارالملک۔ مقام حضرت دہلی نادر نام۔ مختلف عنوان مثلاً فیل خانہ شکار خانہ طبیب خانہ وغیرہ کے تحت فارسی اسماء وغیرہ کے ہندی مترادف دیئے ہیں۔ اس کا سنہ تصنیف ۹۶۰ھ ہے اور "خالق باری" سے پہلے کی ہے۔

اس زمانے میں معروف خالق باری کے متعلق بہت بحث رہی۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اندرونی شبہات سے یہ ثابت کیا کہ یہ امیر خسرو کے عہد کی کتاب نہیں ہو سکتی لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا مصنف کون ہے اور کس عہد کی تصنیف ہے۔ میرے کتاب خانے میں خالق باری کا ایک پرانا نسخہ تھا۔ اس نے اس بحث کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اس سے یہ تحقیق ہوا کہ اس کے مصنف ایک دوسرے خسرو تھے۔ جد کا لقب ضیا الدین تھا اور عہد جہانگیری کے شخص تھے۔ کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۳۱ھ ہے۔

آخر میں ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ریاست میسور کے ایک گاؤں

سے دستیاب ہوئی۔ یہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی مشہور تصنیف نورس کا عجیب و غریب نسخہ تھا۔ شاہی کتب خانے کے لئے اس وقت کے بہترین کاتب نے لکھا تھا اور ہر عنوان پر نہایت نفیس سنہری اور رنگین کام کیا ہوا تھا۔ افسوس کہ چوری ہو گیا۔ کسی نیک نفس کتاب چور نے اپنے مطلب کا یہ اچھا مسئلہ گھڑا ہے کہ کتاب کی چوری چوری نہیں۔ ایک دوسرے نیک دل بزرگ کا مقولہ ہے کہ جو کتاب مانگے دے وہ احمق ہے اور جو لے کر واپس دے وہ اس سے زیادہ احمق ہے۔ جہاں شریعت اخلاق کے ایسے اصول اور مقولے مسلم و مقبول ہوں تو وہاں کتابوں کا خدا حافظ۔

[دہلی سے براڈ کاسٹ]



”موازنہ انیس ودبیر“ پر ایک نادر تحریر

اگلے صفحات میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (ولادت: ہاپوڑ، میرٹھ، ۲۰۔ اگست ۱۸۷۰ء، وفات: کراچی، ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء) کی ایک نادر قلمی تحریر مع عکس ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔

بابائے اردو کی یہ قلمی تحریر، مولانا شبلی کے قیام حیدرآباد دکن (۱۹۰۶ء) کے معروف علمی کارنامے ”موازنہ انیس ودبیر“ پر مولوی عبدالحق کا ایک ریڈیائی تبصرہ ہے۔

بابائے اردو کی اصل قلمی تحریر ان کے متعدد دیگر آثار کے منجملہ، میرے ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔

(ڈاکٹر سید معین الرحمن)

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی علی ادبی اصلاح
 کی ابتدا ان لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو انگریز زبان، سنوی
 خیالات و تمدن سے نا آشنا تھے۔ سیر لکھنؤ ان کے سالار
 اور محرک تھے۔ ان اپنے عہد کے بہت بڑے نقاد تھے۔ انھوں
 نے تعلیم، مذہب، سیاست، اخلاق، مذہب، سیاست، ادب
 غرض ہمارے زندگی کے ہر شعبے پر آزادانہ اور نئے بالائے تنقیدیں
 کیں۔ یہ انھیں ہائیف تھا کہ ہمارے زبان میں حالی نے مذہب
 آزاد، شبلی جیسے زبردست ادب اور نقاد پیدا کیے۔
 حالی نے مرتبہ ان سب میں بلندی۔ ان جدید شعرا، جدید
 تنقید، صحیح نولیں بلکہ جدید ادب کی بان بید اور دوسرے نقاد
 حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے شعور
 شعروشاعی ہمارے ادب میں ایک فاض امتیازی حثیت
 رکھتا ہے۔ ان کی دوسرے تعابیر اور مقالات میں بھی تنقید
 کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ماہر زبان میں قاسم
 چراغ شمع ہو گیا۔
 اس کے بعد شبلی کا درجہ ہے۔ ان کی تنقیدی تاریخ
 میں شعر البیہ اور موازنہ آپس و دوسرے فاض اہمیت رکھتے
 ہیں۔ موازنہ میں انھوں نے آئینہ گوی کی تاریخ سے ہی
 عربی فارسی مثنوی گوی کے ذکر کے بعد ہندستان میں مثنوی گوی
 کی ابتدا کی ہے۔ اس میں انھوں نے مثنوی گوی کی تاریخ
 مثنویوں کی ہے۔ شدت کے ساتھ ہے "ولی نے اگرچہ کہ ہند کے حالات
 میں ایک فاض مثنوی مثنوی لکھی لیکن اس کلام میں مثنوی
 پانہیں لگتا۔ یہ مثنوی ولی نے الیں کوئی مثنوی نہیں لکھی۔
 مثنوی اس مثنوی کی گہرے ولی گہرائی کی ہے بدیہی و مثنوی

کہ میرا نام وہ ہے جو اور وہی گمان کی وفات اور
 پہنچنے تک یہ کہی گئی۔ اور یہ وہ کہتے ہیں کہ "میر تقی میر
 و درویش یہ اگرچہ کوروشیہ تھے لیکن انہوں نے بھی کہا ہے
 ان کے لکھے ہونے کا اور مردا سودا نے ظاہر ہے۔ یہ دونوں
 بائیں غلط ہیں۔ بزرگ میر تقی میر کیسے مصلوب کینا ہے
 مرنے سے نہیں لیکن انہوں نے مرنے کے جو سبب یاد اور میر تقی
 میر کے سبب ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ میر صاحب کے ایک مرنے
 کا ارد مرزا سودا نے کہا۔ خبر مرنے کا اور مرزا سودا نے ظاہر
 وہ میر تقی میر کا نہیں ہے۔ ایک شخص میر محمد التملک میر تقی
 میر کے غلطی کے تذکرہ نویسوں اور ادیبوں کے نزدیک
 میر تقی میر کے مشرک ہے جو نے اسے میر تقی میر سمجھا
 کیا ہے۔ حالانکہ سودا کے قلمی نسخوں میں وفات مورے قلمی
 استعمال ہو کر (تقی اس حمایت کو کسی کی کیا کیا)۔
 مرنے کے سبب "معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس کی ہے۔
 اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر کے مرثیہ کا ادراج ہو چکا
 سودا اور میر کے پہلے کیا مرثیہ کا ادراج وہی سے ہی وہ ادھاری
 صدی پہلے ہو چکا تھا۔ سلطان قلی قلی نے حجرات میں ۹۲۰ م
 کی کئی نوے لکھے ہیں۔ اگر وہ مرثیہ میں ہیں کہ سنہ ۱۰۰۰
 مرثیہ "وٹا" مرثیہ میرزا، شہی، قلی، رفوان، اسے
 مرثیہ، آرت، ہاجر، اسفہار، غفل، نقالی، عشقی، لاشی
 میرزا، اور اور مرثیہ مرثیہ مرثیہ۔

ان کا مقدمہ شہداء کے بارے میں ہے۔
 شکر رونا اور ہوا کا۔

محمد و ام ولد

یہ وہ مرثیہ ہے جسے میر تقی میر نے لکھا اور
 مرثیہ خوب دیکھا ہے۔ ابتدائی مرثیوں میں مرثیہ
 مرثیہ اور مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ
 ان کے مرثیہ مرثیہ اور مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ
 اور مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ مرثیہ

آئینہ نظر نما ...
 آفریزیں ...
 مرثیہ ...
 مرثیہ ...
 مرثیہ کو اپنا مرثیہ ...
 داد ... اور اس کے ...
 خوف کو تیار ہے۔

سولتا ... فرانا کہ اردو میں ...
 ان میں سے ...
 میں صحیح ...
 غلط ...
 اور اس سے ...
 اور اس سے ...

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جدید مرثیوں میں
 شاعرانہ اور ...

پر جا پاتا ہے۔ شہد صفات و بلاغت کی جوں کا استاد و
 نسبت، صالح بیام اور ان کے تسمیہ مفاہیم، با لفظ
 حس التخیل، صفت طباق، مراعات النیدر، لفظ لفظ تخیل،
 مہد و غیرہ کی تفسیر ...
 پر ایک مستور شاہیں میرا میں کلام کے پیش کی ہیں۔ مغلنا
 خود بت لہجہ شاعر ہیں اور اعلیٰ درجہ کے صاحب ذوق ہیں۔
 لفظ سخن پر جان دیتے ہیں۔ مواضع یا خواجہ علم کے ہیں
 و تحقیق و تفسیر کو جھنڈ کر شہد لفظ کی طرف ذہل

کلمے کی ترتیب ...
 اور اور اور ...

بلکہ یہ۔ اور سفرِ اربعہ۔ اور نوبت اور نعت
ہیں تمام موضعِ دلیر اور اہم
یہ کتاب بہت تیار اور سعادت
در میں ہے۔
اور کتب جامع ذہن پروردگار۔

یہ علم اور پروردگار کے یہاں موضعِ دلیر اور کتب
کی ہیں۔ انہوں نے اس امر پر کافی کتب لکھی کہ جو نوبت
اور واقعات مرثیوں کے موضع ہیں ~~یہ~~ تاریخی اعتبار
ان کی ~~کی~~ ~~جسٹ~~ اور اس کے مرثیہ کی جنت پر
اعتبار کسٹ شعر اور نقل تاریخ کیا اثر پڑتا ہے مثلا
فرمانے ہیں کہ "بوغت" اور تالیف عثمانی سے یہ کہ
کہ کلامِ اقتضای حال کے موافق ہو اور فیصلہ ہو مستعمل حال
و موافق ہو، اس جامع نعت پر جس میں بوغت و تمام
انواع و اسباب آجاتے ہیں۔ "بوغت" اور ~~یہ~~
نور و میراں پر ~~یہ~~ کہ "میراں" سے کلام میں
ہرگز الفاظ ہیں اگرچہ انہاں سے کیا گیا ہے اللہ
کمال و اہم بسیار ہیں۔ ان کمال ~~یہ~~ جہر میں
گی بوغت میں کلمات ہیں ~~یہ~~ اور کلمہ اور ان
یہ دیتے ہیں کہ ~~یہ~~ کہ کلام اقتضای حال و
موافق ہو اور مرثیہ ~~یہ~~ کہ کلام میں بہت سے بوغت سے
مواظبت ہیں۔ مرثیوں میں اشخاص و بی ہیں، مقام اور بلاد
کیہ اس اقتضای حال و حال کی ہرگز و دلوں سے نوازا گیا
گو ~~یہ~~ اور وغیرہ رسم و بے ہر ~~یہ~~ اور وہ بھی
انہ چاہے ہوں و انہ ~~یہ~~ چلنے میں ~~یہ~~ رحلت
امام اور ان کے اہل کرم کے اہل کی کرم پر غی ہر دال دینے ہیں
و انہ ~~یہ~~ کہ لغو اور اس کی ~~یہ~~ دینے نقل
کے ناموافق ہیں۔

یہ کتاب میں ~~یہ~~ ~~یہ~~
اور ~~یہ~~ ~~یہ~~ ~~یہ~~ ~~یہ~~ ~~یہ~~

ادنی لکھی

بیان کیے ہیں۔ آخر کے کچھ اور ان میں میر صاحب اور
مرزا صاحب کا سوازیہ کیا ہے۔ کہیں ٹنگا ہے کہ فصاحت
اور حسن بیان میں میر نہیں مارد بڑا صاحب ہیں۔ کیسے موصوفائی
ہے یہ کہن کہ "فصاحت ان کے (مرزا دیر کے) کلمہ کا
صوبہ بھی نہیں گئی... بدقت نام کو نہیں"۔ ناالفاظی پر۔
لفظ یہ ہے کہ ایسے وار کے قوی خاتمہ میں "تایم اریے"
انہا میں ہوکتا کہ جہاں ان کے کلمہ فصاحت و بدقت چمکے ہیں اور بھی
پورا اثر و تاثر نہایت عمدتہ سے جاتا ہے۔ یہ لغت

حجیرت کے کلموں میں
میرا جس کے کلموں میں فصاحت مراعات الیہ اور معاصر
یہ لفظ رعایت کی مثالیں ہائی جاتی ہیں۔ مباحثہ بھی اور
پہلے اور بعض مقامات پر تو یہ بیان ہو اور
اعراق کے پرخ گین۔ مگر باوجود اس کے مرزا صاحب کو بڑے
پختہ اور بول مصلحتی ہے "مرزا صاحب کی قوت متحد

نہایت زبردست ہے اور وہ اپنے دور کے سجادات اور
نسبت دعوت کر پیدا کرتے ہیں کہ وہ ان کے انہوں
ہے اور ہم پر ہوا ہے۔ اس وقت ہندی اور اردو میں
ہے اور اس میں بہت سے جہد کے گز جاتی ہیں فصاحت و بدقت
ہی ہے اس گز میں کہ بدقت اور بدقت پر جاتی ہیں
... یہ مرزا صاحب وہ ان گز ایسا ہے۔

میرا جس کے کلمہ پر وہ اور فصاحت کے گز میں ملدانی
سوازیہ میں اس کے ذرا کیا ہے اور ان کے اور ان کے گز
ہے جاتا ہے گز میں ان کے بھی تعریف کیا ہے اور کہیں موصوفائی
نے بڑا آزادی اور الفاظ کے ہم پار جلا ہے۔
اور اہمیت لکھی ہے۔ مرزا صاحب کے کلمے یا فصاحت پر گز اور انہوں
میں بھی لفظ اور الفاظ کے ہم پار لکھی ہے۔
لیکن میر صاحب کے کلمے میں فصاحت و بدقت

تایم اریے
اور انہوں کے کلمے
اور انہوں کے کلمے
اور انہوں کے کلمے

سورۃ فاطر ۱
نسخ نے فیصلہ و سنت ہے اس میں کیا ہے اور
مولا نے انھیں تم پر کیا ہے لیکن وہ ہیں ان میں سے لیکن
کچھ مکتوبوں کے ناموں میں تالیف کی ہے۔ مثلاً
"بت آرزو کہ کوہ کا کون سا کبوتر ہے؟" مثلاً "کبوتر کا کیا ہے؟"
مثلاً مکتوبوں کے ناموں میں اس وقت آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
ماہ لور، صوفی عورتوں کی بول چال میں مربع ہے۔ پانچ ماہ لور ہے۔
آپ کا مکتوب آرزو مکتوبوں کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
برخاست کی خواہش کو برادری مکتوب۔ اور اس پر کہ برادری
مکتوب۔ برادری اب بھی مستقل پر اور مکتوب۔ امانت مکتوب ہے
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی
مثلاً کوہ پر برادری مکتوب کے ناموں میں آسمان تواریخ تھا۔ اب بھی

[مختصر کتب: ڈاکٹر شیخین قرہن]

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی، علمی، ادبی اصلاح کی ابتدا، اُن لوگوں کے ہاتھوں
 ہوئی جو انگریزی زبان، مغربی خیالات و تمدن سے نا آشنا تھے۔ سرسید احمد خاں ان کے
 سالار اور محرک تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے نقاد تھے۔ انہوں نے تعلیم،
 نظام تعلیم، معاشرت، اخلاق، مذہب، سیاست، ادب، غرض ہماری
 زندگی کے ہر شعبے پر آزادانہ اور بے باکانہ تنقیدیں کیں۔ یہ انھیں کافی حق تھا کہ ہماری
 زبان میں حالی، نذیر احمد، آزاد، شبلی جیسے زہرت ادیب اور نقاد پیدا ہوئے۔ حالی کا ترجمان سب
 میں بلند ہے۔ وہ جدید شاعری، جدید تنقید، سوانح نویسی بلکہ جدید ادب کے بانی ہیں اور دوسرے مقلد۔
 حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ اُن کا مقدمہ شعر و شاعری ہمارے ادب
 میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی دوسری تصانیف اور مقالات میں
 بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں (تنقید کا) خاصا
 پرچار شروع ہو گیا۔

اس کے بعد شبلی کا درجہ ہے۔ اُن کی تنقیدی تالیفات میں شعر العجم اور موازنہ
 انیس دو بیہ خاص اہمیت رکھتے ہیں، موازنے میں انہوں نے ابتدا مرثیہ گوئی کی تاریخ سے
 کی ہے۔ عربی فارسی مرثیہ گوئی کے ذکر کے بعد وہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کا ذکر
 کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :
 "ولی نے اگرچہ کر بلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی
 لیکن اس کے کلام میں مرثیے کا پتا نہیں لگتا۔"

یہ غلط ہے۔ ولی نے ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ جو مثنوی اس سے منسوب کی
 گئی ہے وہ دلی گجراتی کی نہیں بلکہ میر ولی فیاض ویلوری کی ہے۔ اس کا نام وہ مجلس
 یاروضۃ الشہد ہے اور ولی گجراتی کی صفات کے بہت بعد لکھی گئی۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

”میر تقی صاحب کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن انہوں نے بھی کہا ہے۔ اُن کے ایک مرثیے کا رد مرزا سودا نے لکھا ہے۔“

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ بے شک میر تقی کے مطبوعہ کلیات میں مرثیے نہیں، لیکن انہوں نے مرثیے کئے ہیں جو رسالہ ”اُردو“ میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ میر صاحب کے ایک مرثیے کا رد مرزا سودا نے لکھا۔ جس مرثیے کا رد مرزا سودا نے لکھا ہے، وہ میر تقی میر کا نہیں بلکہ یہ ایک شخص میر محمد المتخلص بہ تقی کا ہے۔ یہ غلطی اکثر تذکرہ نویسوں اور ادیبوں سے سرزد ہوئی ہے۔ نام میں تقی کے مشترک جز سے، اُسے میر تقی میر سمجھ لیا گیا، حالانکہ سودا کے قلمی نسخوں میں صاف طور سے تقی استعمال ہوا ہے: تقی اس حکایت کو کوئی کیا کہے گا مولانا لکھتے ہیں:

”معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیے کا رواج ہو چکا تھا“

سودا اور میر سے پہلے کیا، مرثیے کا رواج ولی سے بھی دو اڑھائی صدی پہلے ہو چکا تھا سلطان قلی قطب شاد نے بھی جس کا سنہ جلوس ۵۹۲۲ (۱۵۱۸) ہے کئی نوٹ لکھے ہیں اُس کے بعد کے زمانے میں بیسوں بلکہ سینکڑوں مرثیہ گو شاعر ہوئے، مثلاً: میرزا، شاہی، قطبی، رضوان، احسان، غواصی، اشرف، عاجز، اعتقادی، غلامی نظامی، عشقی، ہاشمی، منظر، داس، رمزی، مشتاق وغیرہ وغیرہ۔ یہ یہ قدیم مرثیے بہت سادہ مگر پرورد ہوتے تھے۔ اُن کا مقصد شہادتِ کربلا کا حال سُنا کر رونا رونا لانا تھا۔ اور نہ اس قدر طویل ہوتے تھے کہ میر و مرزا اور دوسرے مرثیہ گو یوں کے مرثیے۔ ابتدائی مرثیوں میں غم و الم کے لیے شہادت کے واقعات اور شہداء

مروجہ روایات بیان کی جاتی تھیں۔ میر ضمیر اور ان کے بعد مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں نئے نئے اصناف اور جہتیں کی گئیں، مثلاً رزمیہ بیان، سراپا، گھوڑے، تلوار، نیزے وغیرہ اسلحے کی کارستانیوں اور منظر نگاری وغیرہ مرثیے کے خاص اجزاء بن گئے ہیں۔ آخر آخر میں ساتی نامے جیسی چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔ ان مرثیوں میں مرثیت کا رنگ ہلکا پڑ گیا اور شاعری کا پتہ بھاری ہو گیا۔ مرثیہ خوانی کی مجلسوں کی کیفیت قریب قریب شاعروں کی ہی ہو گئی ہے۔ مرثیہ گو اپنا مرثیہ زیادہ تر اپنے کلام کی داد کے لیے پڑھتا ہے اور اس لیے شعر و شاعری کے سارے کمالات صرف کر دیتا ہے۔

مولانا کا یہ فرمانا کہ اردو میں رزمیہ شاعری نہ تھی، میر ضمیر نے اس کی ابتدا کی اور میر انیس نے کمال کے درجے تک پہنچایا، صحیح نہیں۔ میر انیس کے مرثیوں کو رزمیہ شاعری کہنا درست نہیں کیونکہ ان میں کہیں کہیں ضمنی طور پر لڑائی کے بعض پہلوؤں کا ذکر آجاتا ہے۔ قدیم اردو میں صحیح رزمیہ شاعری موجود ہے مثلاً نصرتی کا علی نامہ (۱۰۶۸ء) حسن شوخی کا فتح نامہ، نظام شاہ، مرزا مقیم کا فتح نامہ بھیری (عبد سلطان محمد عادل شاہ)، نصرتی کی تاریخ سکندری یا فتح نامہ بہلول خاں بالشرک سیواجی (۱۰۸۳ء، ۱۶۷۲ء) وغیرہ متعدد رزمیہ مثنویاں ہیں خصوصاً نصرتی کا علی نامہ ایسی بے مثل رزمیہ مثنوی ہے کہ جس کا جواب اردو میں اب تک نہیں ہوا۔ جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جدید مرثیوں میں شاعری پر زیادہ زور ہے، اس لیے مولانا شبلی نے بھی مرثیوں کو اسی معیار پر جانچا ہے۔ مثلاً فصاحت و بلاغت کی خوبیاں، کلام کی ترتیب، محاورے اور روزمرہ کے استعمال، استعارات و تشبیہات، صنائع بدائع اور ان کی قسمیں مثلاً ایام، مبالغہ، حسن التعلیل، صنعت طباق، مراعات النظیر، لفظ و نشر، تفصیل، مہملہ وغیرہ کی تعریفوں کی توضیح کرنے کے بعد

ہر ایک کی متعدد مثالیں میر انیس کے کلام سے پیش کی ہیں۔ مولانا خود بہت اچھے شاعر ہیں اور اعلیٰ درجے کے صاحب ذوق ہیں۔ لطف سخن پر جان دیتے ہیں۔ موازنے نیز شعرا عجم وغیرہ میں وہ تحقیق و تنقید کو چھوڑ کر شعر کے لطف کی طرف ڈھل جاتے ہیں اور شعر کا مطلب، اس کی خوبیاں اور نکات بڑے پُر لطف طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تمام توضیح و تشریح اور انتخاب، معانی و بیان کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بہت قابل قدر اور مطالعے کے لائق ہے اس سے ہماری شاعری کے محاسن و عیوب میں بصیرت حاصل ہوتی ہے اور شعر کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔ یہ کلام کا ظاہر ہے۔ باطن یعنی موضوع کلام پر کم توجہ کی ہے۔ انہوں نے اس امر پر کافی بحث نہیں کی کہ جو روایات اور واقعات، مرثیوں کے موضوع ہیں، تاریخی اعتبار سے ان کی کیا حقیقت ہے اور اس سے مرثیے کی حیثیت پر باعتبار صنعت شعرا و تعلق تاریخ، کیا اثر پڑتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ :

”بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام مقصائے
حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔ مقصائے حال کے موافق ہونا
ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسباب
(اسالیب) آجاتے ہیں۔“

بلاغت کی اس تعریف کو میر انیس پر مطابق کر کے فرماتے ہیں کہ :

”میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا
درجے کی ہے، لیکن یہ ان کے کمال کا اصل معیار نہیں، ان کے
کلام کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے۔“

اس پر پروفیسر کلیم الدین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ :

”اگر بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ کلام مقصائے حال کے موافق ہو

تو صرف میرا نہیں ہی کا کلام نہیں بلکہ سارے مہیشے بلاغت سے معر: ثابت ہوں گے۔ مرثیوں میں اشخاص عربی ہیں، مقام کر بلا ہے، لیکن اس اقتضائے حال کا خیال کسی مرثیہ گو کے دل میں نہیں گزرتا۔ مرثیہ گو لکھنو کی شادی نہیں کے رسوم عرب پر منطبق کرتے ہیں اور وہ جوہی اور بیلی کے پھول عراق کے جنگلوں میں بچھا دیتے ہیں۔۔۔ وہ حضرت امام اور ان کے اہل حرم کے اہل کیر کیر پر بھی پروں ڈال دیتے ہیں۔۔۔ واقعہ کر بلا کے تصور اور اس کی جزئیات دونوں مقتضائے حال کے ناموافق ہیں۔“

اس کتاب میں (مولانا نے) میرا نہیں کے محاسن بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ آخر کے کچھ اوراق میں میر صاحب اور مرزا صاحب کا موازنہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فصاحت اور حسن بیان میں میرا نہیں کا درجہ بڑھا ہوا ہے لیکن مولانا شبلی کا یہ کہنا کہ :

”فصاحت ان کے (مرزا دیر کے) کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔۔۔ بلاغت نام کو نہیں۔“

! انصافی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں :
 ”تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے، نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔“

یہ تضاد عجیب ہے۔

میرا نہیں کے کلام میں بھی صنعت مراعات، النظیر، ایہام اور دوسرے صنائع نیز لفظی رعایات کی کافی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مبالغے کا بھی زور ہے اور بعض

مقامات پر بمبالغہ غلو اور اغراق تک پہنچ گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ مرزا صاحب کو نہیں پہنچتے اور بقول مولانا شبلی کے :

”مرزا صاحب کی قوت تخیل نہایت زبردست ہے اور وہ اس قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حرفیوں کا طائر و ہم پرواز نہیں کر سکتا۔“

اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کے مرثیوں میں بڑی دھوم دھام اور شکوہ اور شہادت ہے۔ اُن کی خیال بندی، مضمون آفرینی، وقت پسندی اور شدتِ مبالغہ صنائع و بدائع کی کثرت کا جواب نہیں لیکن یہ حدتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو وضاحت و بلاغت ہی سے نہیں گرجاتیں بلکہ بد نما، پست اور مبتذل ہو جاتی ہیں اور یہ عیب، مرزا صاحب کے ہاں اکثر پایا جاتا ہے۔

میر انیس کے کلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، مولانا نے موازندہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن کے مداحوں کی طرف سے جو جوابات دیے گئے ہیں اُن پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس میں مولانا نے بڑی آزادی اور انصاف سے کام لیا ہے۔ یہ سب اعتراضات لفظی ہیں۔ یہ اعتراضات قافیوں کی غلطی، وزن کے اعلان کے جائز ناجائز ہونے، حروف کا تقطیع سے گرجانے سے متعلق ہیں اور صحیح ہیں لیکن مرثیے کے موصوع یا مضمون پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

سناخ نے بعض الفاظ کی صحت کے متعلق بھی اعتراض کیا ہے اور مولانا نے انہیں تسلیم کر لیا ہے، لیکن ہمیں ان میں سے بعض غلطیوں کے ماتنے میں تامل ہے۔ مثلاً :

بُت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے

اعتراض ہے صفا کی جگہ صاف ہونا چاہیے۔ صفا صاف کرنے کے معنی میں اس وقت

تو استعمال ہوتا ہی تھا، اب بھی عام طور پر خصوصاً عورتوں کی بول چال میں مروج ہے۔ جان صاحب کا شعر ہے :

کرتا ہے صفار روز جلوہ خانے کو نورا
آئینہ میں شفاف رہے کیوں نہ گھراپنا



”برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی“

اعتراض یہ ہے کہ پروانگی غلط ہے۔ پروانگی ان ہی معنی میں اب بھی مستعمل ہے اور غلط نہیں۔ امانت لکھتے ہیں :

پرندے کو نہیں پروانگی محفل میں آنے کی



ایک مصرعہ ہے :

ایسا بھی کوئی بے کس و بے آس نہ ہوگا“

اعتراض ہے کہ یہ واو عطف فارسی اور اردو کے لفظ کے درمیان غلط ہے۔ بے شک آج کل غلط ہے، لیکن اُس زمانے میں اس کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کے زمانے تک مروج رہا اور خود انھوں نے بھی اس کا استعمال جائز رکھا۔



”اس مژدہ کو سُننتے ہی خوشی ہو گئیں شیریں“

خوشی، بجائے خوش غلط ہے، لیکن میر صاحب کے زمانے میں یہ استعمال جائز تھا۔ آتش کا مصرع :

خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

بیگمات کی زبان پر اب تک ہے۔

بعض معنوی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن وہ بھی کلام کے ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً دو مصرعوں کا لیے ربط ہونا۔ لفظی رعایت کی وجہ سے کلام کا اوجھا اور بے اثر ہونا وغیرہ۔ کلام کے باطن پر شاؤ ہی کوئی اعتراض کیا گیا ہے۔

مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد تنقید پر مولانا شبلی کی یہ کتاب ہے جو ہماری مشرقی شاعری کے نقطہ نظر سے اس کے محاسن و عیوب کے سمجھنے میں بہت مدد دے گی۔ اس لیے اس کا مطالعہ خاص ہمارے جدید ادیبوں کے لیے ضروری ہے۔

توضیحات :

۱۵ دیکھیے: موازنہ انیس دوسرے، شبلی، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۲ء

۱۶ پُرگو شاعر میر ولی فیاض دیوبندی (خلافت آرکائیو، مدراس) ۱۹۵۱ء تک

بقید حیات تھے ان کی مثنوی روضۃ الشہداء جو وہ مجلس بھی کہلاتی ہے ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۶ء میں لکھی گئی یہ ملا حسین واعظ کی فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔

(تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۵۱ء

چھٹی جلد، ص ۵۶)۔ بابائے اردو، ولی گجراتی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء

مانتے ہیں (رسالہ اردو و جنوری ۱۹۳۴ء ص ۱۹۴-۱۹۷) اسی لیے انہوں نے

لکھا ہے کہ وہ مجلس، "ولی گجراتی کی وفات کے بہت بعد لکھی گئی۔" لیکن

ولی کا سال وفات حقیق مزید کے بعد اب ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء کے بعد اور ۱۱۳۸ھ

۱۷۲۵ء سے پہلے متعین ہوا ہے۔ دیکھیے: ولی کا سال وفات از ڈاکٹر جمیل صاحبی

مشمولہ: جشن نامہ اور نیشنل کالج لاہور دسمبر ۱۹۷۲ء، ص ۶۵

- ۵۳ موازنہ انیس و دبیر، شبلی، ایضاً، ص ۱۸
- ۵۴ دیکھیے: میر تقی میر کے سلام اور مرثیے، رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۳
- ۵۵ موازنہ انیس و دبیر، شبلی، ص ۱۸
- ۵۶ تفصیل کے لیے دیکھیے: دکن میں اُردو، نصیر الدین ہاشمی

اُردو شہ پارسیہ جلد اول ۱۹۲۹ء ڈاکٹر محی الدین قادری

۵۷ موازنہ انیس و دبیر، شبلی، ص ۲۱۳

۵۸ ملک الشعرائے پور نصرتی (وفات: ۱۶۷۵ء) کی مشہور زرمیہ ثنوی "علی نامہ" (اشعار: ۲۵۱۹) ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء کی تصنیف نہیں، اس کا سال تالیف ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء ہے۔ اس ثنوی میں اُن مقامات کا ذکر ہے جو علی عادل شاہ ثانی (۱۶۶۵ء - ۱۶۷۲ء) کو سیوا جی کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے اور مغلوں کی فوج مدافعت میں پیش آئی تھیں۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتابخانے میں "علی نامہ" کے پانچ مخطوطے محفوظ ہیں۔ دیکھیے: مخطوطات انجمن ترقی اُردو (اُردو) جلد اول، ۱۹۶۵ء، ص ۲۷۱

۵۹ حسن شوقی (ولادت ۱۵۴۸ھ/۱۵۴۱ء) کا فتح نامہ نظام شاہ (اشعار: ۶۲۰) دکن کی جنگ تالیکوٹ ۱۵۶۲ھ/۱۵۶۳ء کی فتح پر مرتب ہوا۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی، مقدمہ دیوان حسن شوقی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳)

۶۰ فتح نامہ بکھیری (ابیات: ۲۲۳) اس مقیم کی ثنوی ہے جس نے ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۷ء اور ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے مابین "چندر بدن و مہیار" ایسی مشہور ثنوی لکھی۔ فتح نامہ بکھیری سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء - ۱۶۵۵ء) کے زمانے کی ایک جنگ کے بیان میں ہے۔ ۱۰۱۱ھ/۱۶۳۷ء میں واقع ہوئی۔ (مخطوطات انجمن ترقی اُردو، ایضاً، ص ۲۴۸)

۱۱۔ تاریخ سکندری (اشعار: ۵۵۴) میں نصرتی نے علی عادل شاہ ثانی کے جشن سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی کے سال (۱۶۷۲) پیش آمدہ واقعات نظم کئے ہیں۔
تفصیل کے لیے دیکھیے: نصرتی، بابائے اردو ۱۹۴۴

۱۲۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۴

۱۳۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۴

۱۴۔ اردو تنقید پر ایک نظر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۹

۱۵۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۵۶۔ ایک دوسری جگہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”مرزا (دبیر) صاحب کی شاعری میں بالفرض گواہ اور تادم اوصاف

پائے جاتے ہوں، لیکن بلاغت کا تو ثابِتہ نہیں پایا جاتا۔“

(موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۸)

۱۶۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۲

۱۷۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۳

۱۸۔ الفاظ کی صحت کے متعلق جن اعتراضات کو بابائے اردو نے تسلیم نہیں کیا، وہ جو

مولانا شبلی کے عاید کردہ ہیں، نساخ کے نہیں۔ شبلی کے الفاظ یہ ہیں:

”نساخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیے ان کی

تفصیل ذیل میں ہے۔“ (موازنہ، ص ۲۴۸)

”تفصیل“ کے تحت مولانا شبلی نے میر انیس کے بارہ اشعار پر اعتراضات کیے

ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر انیس کے کلام میں: ”اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں۔“

(موازنہ، ص ۲۴۹)، انہی بارہ غلطیوں میں چار کے ماتے میں بابائے اردو کو تامل ہے۔“

۱۹۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۸

۲۰۔ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۸

- ۲۱۰ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۲۸
- ۲۲۰ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۲۹
- ۲۳۰ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۲۹
- ۲۴۰ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۵۰
-

اُردو زبان و ادب کے سات سو سال

شیخ فرید الدین گنج شکر (۱۲۶۵ء)

تا

شیخ عبدالحق بابائے اُردو (۱۹۶۱ء)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰-۱۹۶۱ء) کی پہلی برسی کے موقع پر پاکستان رائٹرز گلڈ کے ترجمان ماہنامہ ”ہم قلم“ (کراچی) کے شمارہ اگست ۱۹۶۲ء (جلد ۲، نمبر ۱۲، صفحہ ۸۲-۱۱۱) میں مرزا جمیل الدین عالی نے ”اُردو زبان اور ادب“ کے عنوان سے بابائے اُردو کا ایک غیر مطبوعہ اور طویل مضمون شائع کیا تھا جس میں عالی صاحب کے بقول ”سناٹا اختصار اور جامعیت کے ساتھ بابائے اُردو نے اُردو زبان اور ادب کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔“

بابائے اُردو کے انتقال کے چالیس سال بعد ان کا یہ نا اور اور قلمی مضمون ترقی کے ساتھ اگلے صفحات میں محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا، اُردو زبان کی تاریخ اور جنوبی ہند میں اس کے ارتقا سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا حصہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آغاز سے عہد موجودہ میں ابن انشا تک اُردو شاعری کے نئے تجربات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس جائزے کا تیسرا اور آخری حصہ اُردو نثر، نثری اصناف کی تدریجی ترقی اور اُردو کے بعض علمی اداروں کی زوداد کو محیط ہے۔

(ڈاکٹر سید معین الرحمن)

۶۲۰۰۱

①

مسلمانوں کی آمد نے بر عظیم پاک و بھارت کو بے شمار برکات اور فوائد پہنچائے۔ جن سے اہل ملک کی زندگی اور خیالات میں نیا انقلاب پیدا ہو گیا۔ لیکن ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ وہ عام اور مقبول زبان ہے۔ اس بر عظیم کو جس میں بیسیوں زبانیں اور سیکڑوں بولیاں مروج ہیں۔ گزشتہ ہزار سال سے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

مسلمانوں کی پہلی آمد سندھ میں ہوئی جبکہ محمد بن قاسم نے پہلی صدی کے اواخر ۷۱۱ء اور ۷۱۲ء میں اس علاقے کو فتح کیا۔ مسلمانوں کا تسلط اس علاقے میں مدت دراز تک رہا۔ سندھ پر اسلام اور اسلامی تہذیب کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے اور سندھی زبان میں عربی الفاظ کثرت سے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ غیر نہیں معلوم ہوتے۔

دوسری صدی ہجری میں ہندوستان کی ایک دوسری سمت یعنی جنوب میں عرب مسلمان تاجر کی حیثیت سے پہنچے اور بلیمبار کی تجارت کلیتاً ان کے ہاتھ میں آگئی۔ کالی کٹ ان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں مسلمان بلا شرکت غیرے زمانہ دراز تک بحری تجارت کے مالک رہے۔ ان کی سب سے بڑی یادگار پاپلا قوم اب بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے۔ عرب تاجروں نے نو مسلموں کو عربی سکھائی اور

خود طیلم سیکھی جسے وہ عربی خط میں لکھتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ طیلم زبان میں کثرت سے عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند سے مسلمانوں کا یہ تعلق بڑی حد تک تجارتی تھا۔

سندھ کے بعد کوئی تین سو برس گزرنے پر شمالی ہند میں مسلمانوں کا دوسرا سیاسی تعلق سلطان محمود غزنوی کی فتوحات سے ہوا۔

اس دور کو ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ گو سلطان محمود کے حملوں کے بعد محمود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں پنجاب کی حیثیت ایک صوبے کی سی رہی تاہم اس ملک والوں سے فاتحوں کے تعلقات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے، چنانچہ ہندوؤں کی ایک خاص فوج غزنی میں متعین تھی۔ ہندی فوج کا کمانڈر سویندرائے تھا۔ اور جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو محمود نے اس ممتاز عہدے پر تلک کا تقرر کیا۔

پنجاب میں غزنی حکومت تخمیناً پونے دو سو برس تک رہی۔ اس عرصہ میں ہندوؤں سے مسلمانوں کے تعلقات خاصے وسیع ہو گئے۔ اکثر ہندوؤں نے فارسی پڑھی اور مسلمانوں نے ہندی۔ محمود کے زمانے میں غزنی میں متعدد ترجمان تھے جن میں سے تلک اور بہرام کے نام تاریخوں میں آتے ہیں۔ اس زمانے کے بعض نامور اور مستند شعرا کے کلام میں بھی بعض ہندی الفاظ داخل ہو گئے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کی نسبت محمد غزنی مصنف "لسا اللباب" نے لکھا ہے کہ عربی فارسی کے علاوہ ان کا تیسرا دیوان ہندی میں بھی تھا۔ (تذکرہ لسا اللباب ج ۲، باب ۱۰) امیر خسرو نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ (دیباچہ غزۃ الکمال) لیکن ان کے ہندی کلام کا اب تک کہیں پتہ نہیں لگا۔ یہ کون سی ہندی تھی اور کس قسم کی زبان تھی؟ اس کا مطلق علم نہیں۔ محمود کی وفات کے کچھ عرصے بعد غزنی حکومت کی وہ شان نہ رہی۔ غوریوں سے جو لڑائیاں ہوئیں، انہوں نے حکومت کو کمزور کر دیا۔ آخر ۵۸۳ھ (۱۱۸۴-۸۶ء) میں علاؤ الدین کے بھتیجے معز الدین بن سام نے جو محمد غوری کے نام سے مشہور ہے، محمود کے آخری جانشین کو تخت سے اتار دیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ غزنی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اگرچہ محمد غوری نے ہندوستان میں دور دورہ دھاوے مارے اور فتوحات میں کامیابی حاصل کی مگر محمود اور اس کے جانشینوں کی طرح اس کا دل بھی غزنی میں تھا اور محمود کی طرح اسے بھی ہندوستان میں رہ کر سلطنت قائم کرنے کا خیال کبھی نہ آیا۔ سلطان ترائین کی فتح کے بعد واپس چلا گیا اور ہندوستان کے تمام معاملات اور معرکے اپنے معتمد جنرل اور نائب قطب الدین ایبک کے حوالے کر دیے۔ محمد غوری

کے انتقال کے بعد ۱۹۰۳ء میں قطب الدین ایبک جو زر خرید غلام تھا، ہندوستان کے مشرقی علاقہ کافرماں ردا قرار پایا۔ ہندوستان میں اب پہلی بار ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی جس کا پہلا سلطان قطب الدین تھا جو خاندان غلامان کا بانی ہوا۔

اب ہندوستان میں ایک نئی قوم آتی ہے اور یہیں بس جاتی ہے۔ اس کا مذہب اور اس کی تہذیب اس کی زبان اور رسم و رواج اور عادات و خصائل ان لوگوں سے جدا ہیں جو پہلے سے آباد ہیں۔ اب یہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے اور ایک ہی حکومت کی رعایا ہو جاتے ہیں۔ وہ تعلقات جو عارضی اور ادھورے تھے، اب مستقل اور پختہ ہو گئے۔ کاروباری، ملکی اور معاشی ضروریات زندگی نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور قربت کی بدولت ایک کی تہذیب و زبان کا اثر دوسرے کی تہذیب و زبان پر تیزی سے پڑنے لگا۔

مسلمان جس وقت یہاں آئے تو اس ملک کی جسے ہندوستان کہتے تھے، عجیب کیفیت تھی۔ جس طرح ملک مختلف رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر علاقے کی حکومت الگ تھی، اسی طرح ہر علاقے کی زبان بھی جدا تھی۔ یہاں ان بولیوں اور ان کی اصل کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کی آمد کے وقت رائج تھیں۔

آریاؤں کا اصل وطن کہاں تھا؟ اس کے متعلق مختلف اور متضاد نظریات ہیں اور اب تک قطعی طور پر اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ لیکن یہ قریب یقین ہے کہ جو آریہ ایران میں آئے تھے، ان میں کا ایک گروہ مشرق کی جانب کوچ کرتا ہوا وسط ایشیا سے برعظیم پاک و بھارت میں داخل ہوا۔ یہاں آکر انہیں یہاں کے ویسی باشندوں یعنی دراوڑی قوم سے سابقہ پڑا۔ یہ آریہ غیر متہدن تھے اور ان کی حالت خانہ بدوشوں کی سی تھی۔ ان کے مقابلے میں دراوڑی زیادہ ترقی یافتہ اور متہدن تھے۔ آریہ جسمانی لحاظ سے قوی تھے۔ انہوں نے دراوڑوں کو ان کے زرخیز علاقوں سے مار بھگایا اور جو باقی بچے انہیں غلام بنایا۔ چنانچہ ان "بہادر اور شریف" آریاؤں کی یادگار وہ شودر اور اچھوت ہیں جو اس برعظیم میں اب تک اپنے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

جب دو ایسی قومیں آپس میں ملتی ہیں جن میں ایک متہدن اور دوسری غیر متہدن ہوں تو جو تہذیب اس علاقے سے پیدا ہوتی ہے، اس پر غالب اثر متہدن قوم کا ہوتا ہے خواہ وہ قوم مفتوح ہی کیوں نہ

جوہر بنا بریں در اوڑی تہذیب کا اثر آریاؤں کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑا، حتیٰ کہ وہ در اوڑوں کے بعض دیوتاؤں کو بھی پرچنے لگے۔ زبان کو انسانی تہذیب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دو قوموں کی یکجائی سے جن کی بولیاں مختلف تھیں، ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازم تھا۔ متمدن قوم کی بولی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ آریاؤں اور در اوڑوں کے میل تزل سے جو بولی وجود میں آئی اس میں لامحالہ در اوڑی الفاظ کی بہتات تھی، کیونکہ متمدن قوم کی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوتا ہے اور اس میں اشیاء کے ناموں، خیالات، جذبات کے اظہار کے لیے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں، اس لیے وہ غیر متمدن بولی پر غالب آجاتی ہے۔ در اوڑی بولی کا اثر صرف الفاظ ہی تک محدود نہ رہا، اصوات بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ لسانیات کا یہ کونا بھی تحقیق کی روشنی سے محروم ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اسی پراکرت سے وہ زبان نکلی جو سنسکرت کہلاتی ہے نیز یہی بولی ان قدیم پراکرتوں اور بولیوں کی ماں ہے جو اس عظیم میں بولی جاتی ہیں اور اسی کے اثر سے اس زبان نے جو آریا ایران سے بولتے آئے تھے، نند آریائی شکل اختیار کی۔

پراکرت کے معنی فطری غیر مصنوعی کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سنسکرت سے مراد مشتمل، مصنوعی زبان ہے۔ سنسکرت برہمنوں کے تشدد اور نحو یوں کے اصول و ضوابط کے قیود اور جگر بند سے بانجھ ہو کر رہ گئی، خام بول چال کی زبان نہ ہونے پائی۔ برہمنوں اور اہل علم کے طبقے تک محدود رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پراکرتوں کو جو عوام کی بولیاں تھیں، خاطر خواہ فروغ ہوا اور ان پراکرتوں سے دوسری بولیاں نکلیں اور پھولی پھلیں۔ ان ہی بولیوں میں سے ماگدھی اور اڑوہ ماگدھی ہیں جو مہاتما بدھ اور جین مذہب کے بانی مہاویر نے اپنے مذہبی عقائد کی تلقین کے لیے اختیار کیں۔ انھیں بولیوں نے بعد میں کسی قدر تغیر سے پالی اور جینی اڑوہ ماگدھی کی شکل اختیار کی۔ جب یہ زبانیں بھی سنسکرت کی طرح ٹھٹھٹ ادبی اور مذہبی بن جانے پر ویسی ہی قواعد اور ضوابط کی پابند ہو گئیں اور بول چال کی زبانیں نہ رہیں تو اس وقت پراکرت کی بول چال کی بولی اپ بھرنشا (بگڑی زبان) نے ان کی جگہ لے لی۔

بارھویں صدی میں متعدد اپ بھرنشائیں تھیں۔ سورسینی (شورسین ویس ہتمرا) اپ بھرنشا وسطی علاقے کی بولیوں کی ماں ہے۔ ان میں سے ایک اس علاقے میں بولی جاتی تھی جو ستلج کے کنارے سے دہلی تک اور رومیکنڈہ کی مغربی حدود تک پھیلا ہوا ہے اور ایک (یعنی برج بھاشا) اور ستھرا کے علاقے میں اور بندہ ہیل کھنڈ میں مشرق کی جانب دوسری بولیاں بروج

تھیں مثلاً متھیلی، ماگدھی، بھوج پوری وغیرہ۔ اور آگے بنگالی، آسامی، اڑیا۔ مغرب کی جانب راجستھانی اور گجراتی جنوب کی طرف مرہٹی اور تامل مغرب میں پنجابی۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس حصہ ملک میں یہ سب بول چال کی بولیاں تھیں۔ ان بولیوں کا سنسکرت سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا بجز اس کے کہ ان میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ کچھ اصلی صورت میں اور زیادہ تر سنسکرت شدہ حالت میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

دلی، میرٹھ اور آس پاس کے مقامات میں جو بولی مروج تھی وہ دکن تھی جسے امیر خسرو دہلوی کہتے ہیں۔ ہنوی نہ سپہا، بو افضل نے بھی آئین اکبری میں اس کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ عوام کی بولی تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اسے اس زمانے میں کھڑی بولی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور سلطنت کو استقلال ہوا تو یہی بولی تھی جو وہاں بولی جاتی تھی۔ ابتدا میں اس پر آس پاس کی بولیوں پنجابی، ہریانوی وغیرہ کا بھی اثر پڑا۔

مسلمان جو ہندوستان میں آئے ان کی مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ اس کا بول چال سے تعلق تھا نہ روزمرہ کی ضروریات سے۔ ترک، امر اور شاہی خاندان والوں تک محدود تھی۔ دفتری، کاروباری درباری، تہذیبی اور عام تعلیمی زبان فارسی تھی۔ جب اس کی قلم دہری زبان لگی تو اس پونہ سے ایک نئی مخلوط بولی وجود میں آئی۔ ابتدا میں یہ ہندی یا ہندوی کہلاتی۔ بعد میں دوسری بولیوں سے اقتباس کے لیے اسے بیختہ کا نیا نام دیا گیا۔ اس سے مراد ملی بلی زبان کے ہیں۔ ابتدا میں بیختہ صرف کلام منظوم کے لیے استعمال ہوتا تھا، بعد میں عام زبان کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ہندوستانی (یعنی زبان ہندوستان) بھی اس کا دوسرا نام ہے۔ یہی بولی رفتہ رفتہ اس رتبے کو پہنچی جسے ہم اردو کہتے ہیں اور جواب مقبول عام نام ہے۔ عالم گیر کے عہد سے قبل یہ نام زبان کے لیے کسی تحریر میں نظر نہیں آتا۔ یہ زبان جس کے لیے زمین پنجاب کے میدانوں میں تیار ہوئی اور جس نے دلی میں خاص حالات میں ایک نئی بولی کارڈپ دھارا، صوفیوں، درویشوں اور سلطنت دہلی کے لشکروں کی بدولت گجرات، دکن، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں پہنچی اور بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔

درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ بلا امتیاز، ہر قوم و ملت کے لوگ اس کے پاس آتے اور اس کی زیارت و محبت کو موجب برکت سمجھتے ہیں۔ عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔

خواس سے زیادہ عوام درویشوں کی طرف جھکتے ہیں، اس لیے انہوں نے اپنے اصول و عقائد کی تلقین کے لیے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ جہاں جائیں اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق فاضل نشان اکھروٹی (تصنیف ملک محمد جاسی) کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں:

”و تو ہم نکتہ کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ پس ہر ملک کہ بودہ زبان آن ملک را بکار بردہ اند و گمان نکتہ کہ بیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب القطب خواجہ بزرگ معین الحق واللہ والدین قدس سرہ بدین زبان سخن فرمود۔ بعد از ان خواجہ گنج شکر قدس سرہ، و حضرت خواجہ گنج شکر در بان ہندی و پنجابی بعضے از اشعار نظم فرمود۔۔۔۔۔ ہم چنان ہر یکے از اولیاء اللہ بدین لسان تکلم فرمودند۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ الغریز کا کوئی ہندی قول اب تک نہیں ملتا لیکن ان کی عالم گیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ قرین قیاس ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے البتہ شیخ فرید الدین شکر گنج قدس سرہ (ولادت ۵۶۱ھ ۱۱۷۳ء وفات ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء) کے بعض مقولے ملتے ہیں۔ مولانا سید مبارک معروف بہ میر خور و جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید و مصاحب خاص تھے۔ اپنی تالیف ”سیر الاولیاء“ میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت نے شیخ جمال الدین کے چھوٹے بیٹے کو اپنی بیعت سے مشرف کیا اور رخصت کے وقت خلافت نامہ مصلّا اور عصا عنایت فرمایا تو مادر بومناں (شیخ جمال الدین کی خادمہ) نے کہا: ”خوجا بالاہے“ تو آپ نے ہندی زبان ہی میں فرمایا: ”پونوں کا چاند بھی بالاہے“ یعنی بدر بھی پہلی رات کو چھوٹا ہوتا ہے۔

شیخ بہاؤ الدین باجن (۷۹۰ھ ۱۳۸۸ء تا ۹۱۲ھ ۱۵۰۶ء) نے اپنی تصنیف ”خزانِ رحمت“ میں حضرت شکر گنج کے یہ دو قول نقل فرمائے ہیں جو ہماری رائے میں مستند معلوم ہوتے ہیں:

راول دیول میں نہ جائے پھانا پہنا روکھا کھائے

ہم درویش نہ رہے ریت پالی، لورین اور مسیت

۲۔ جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس

جمیعات شاہی ہیں جو حضرت قطب عالم (۷۹۰ھ تا ۸۵۰ھ ۱۴۴۶ء تا ۱۴۴۶ء) حضرت شاہ عالم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا یہ منظوم قول نقل کیا ہے:

اسکیری یہی سو ریت جاو ن نامے کی جادو مسیت

یوں بہت سے منظوم اقوال آپ کے نام سے مشہور ہیں لیکن ان کی کوئی باوثوق سند نہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ان کے ہم نام بابا فرید کے ہیں۔

شیخ بوعلی قلندر اوفات ۷۲۲ھ (۱۳۲۳ء) کا امیر خسرو سے یہ کہنا "ترکا کچھ سمجھا ہے" ثابت کرتا ہے کہ یہ بزرگ بھی مقامی زبان سے واقف تھے۔

اسلامی ہند کے صاحب کمال شاعر و ادیب امیر خسرو (۶۵۱ھ تا ۷۲۵ھ ۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۳ء) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ اور جملے بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ ان کی نسبت عام طور پر یہ یقین ہے کہ ان کا کلام ہندی میں بھی تھا اور بعض تذکروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے خود امیر خسرو نے اپنے دیوان "عزۃ انال" کے رسالے میں صاف طور پر لکھا ہے کہ میں نے ہندی نظم بھی کہی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ریختہ قسم کے بعض قطعے یا ایک آدھ غزل اور کچھ پہیلیاں، چیتانیں، مکہ مکریاں، انملیاں، درسنے یادو ہے جو ان سے منسوب ہیں، ان کی سحت کے جانچنے کا اس وقت کوئی معتبر ذریعہ نہیں ان میں سے ممکن ہے بعض ان کے ہوں، لیکن صد ہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے ان کے الفاظ اور زبان میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ سب سے قدیم حوالہ ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" (۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء) میں ملتا ہے۔ اس میں ان کا یہ دوہا نقل کیا گیا ہے:

پنکھا جو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ منجھ جلتی، جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

۱۔ سب رس مطبوعہ انجمن ترقی اردو (۱۹۰۳ء)

ان کی فارسی مثنویوں میں ہندی الفاظ اور جملے بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً "تغلق

نامے (ص ۱۰۸) میں "بے بے تیرا مارا" "نالہ و نلو جو زبان ہے"

شیخ لطیف الدین دریائونش سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین کے مرید اور خلیفہ تھے حضرت شیخ باجنؒ
اپنی تصنیف "خزائنِ رحمت" میں لکھتے ہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ شہرِ دلی سے سرکی لاتے اور اپنے رہنے کا
گھر بنا لیتے۔ جب یہ سرکی پرانی ہو جاتی یا آندھیوں میں اڑ جاتی تو دوسری سرکی لے آتے۔ ان سے جب
یہ کہا گیا کہ آپ مستقل گھر کیوں نہیں بنا لیتے تو فرمایا:

آرے آرے بابا ہمیں بخارے کیا گھر کرتے ہیں مینارے

شیخ بہاؤ الدین باجنؒ نے اپنی اسی تصنیف "خزائنِ رحمت" میں اپنے مرشد شیخ رحمت اللہ کے
ملفوظات وارشادات اور اقوالِ مشائخِ سلف جمع کئے ہیں۔ اس میں جگہ جگہ اپنے اشعار اور دوسے
بھی لکھے ہیں چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ساجن دعا خدا اس کی قبولے کھاوے حلال اور ساج بولے

قتل ہو اللہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

نا اُنہ جنیانہ وہ جیایا نا اُنہ مالی باپ کس لایا

نا اُنہ کوئی گوردہ چڑھایا باجن سب اُنہ آپ تپایا

پرگٹ ہوا ہو کہیں ڈھیٹھیا آپ لکایا

مسجد مسجد بانگا دیویں بن خانے تیرا شو مے خانے بھیر رنگ کرے ایسا تیرا چو

باجن جس وہ کرے کرم پاپ بھی ہو دے دھرم

یہ فتنی کیا کس ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ جو زبان امیر خسروؒ کے وقت یا ان کے قریب کے زمانے میں
بولی جاتی تھی، وہ اس زبان سے جسے ہم اردو کہتے ہیں کس قدر قریب تھی۔ بعض جملے تو بالکل آج
کل کی سی زبان میں ہیں۔

صوفیوں اور درویشوں کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اس زبان کے پھیلانے اور دور

علاقوں میں پہنچانے میں مدد دی وہ سلطنت کی فوجیں تھیں صوفیوں کا مقصد اس زبان کی اشاعت نہ تھا انھوں نے یہ زبان اس لیے اختیار کی کہ یہی ایک ایسی زبان تھی جس کے ذریعے وہ ملک کے ہر حصے میں اپنے اصول و عقائد کی تلقین کر سکتے تھے، یہ اور بات ہے کہ اس ضمن میں زبان کی بھی اشاعت ہو گئی یہی صورت سلاطین دہلی کی فتوحات سے ظہور پذیر ہوئی۔ ان سلاطین میں سب سے پہلے ۷۹۵ھ م ۱۲۹۶ء میں علاؤ الدین نے دکن پر لشکر کشی کی اور دیوگری تک جا پہنچا اور ۷۹۸ھ م ۱۲۹۹ء میں گجرات پر تسلط کر لیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کر دیا۔

علاؤ الدین کے بعد ۷۲۷ھ م ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے دلی شہر کی آبادی کو دیوگری (دولت آباد) میں لے جا کر بسا دیا اور تخمیناً دو لاکھ دلی والے دولت آباد میں آباد ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کی زبان بھی جا پہنچی، جس کے آثار اب بھی دولت آباد و خلد آباد میں پائے جاتے ہیں۔ اس حیرت انگیز واقعہ نے اس زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا۔

اس زبان کو دروجہ سے ایک جداگانہ اور خاص حیثیت حاصل ہو گئی۔ ایک تو یہ کہ وہ شروع ہی سے فارسی حروف و رسم خط میں لکھی جانے لگی۔ دوسری یہ کہ اس نے تھوڑی ہی مدت بعد وہ عروض بھی اختیار کر لیا جو فارسی زبان میں مروج ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ زبان جس نے دلی میں جنم لیا، دکن میں جا کر ادب و انشا کا مرتبہ حاصل کرتی ہے اور وہاں اسے فروغ ہوتا ہے۔ بہمنی عہد ہی میں اس کا رواج ہو چلا تھا اور موزوں طبع لوگ اس سے کام لینے لگے تھے۔ اس عہد کی پہلی کتاب معراج العاشقین سمجھی جاتی ہے جو حضرت سید محمد بن یوسف الحنفی الدہلوی سے منسوب ہے۔ یہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید تھے اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں۔ معراج العاشقین میں نے ہی حیدرآباد دکن سے شائع کی تھی۔ مجھے اس وقت بھی پورا یقین نہ تھا کہ یہ خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہے خواجہ بندہ نواز صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کی سب کتابیں فارسی یا عربی زبان میں ہیں۔ میں نے ان کی اکثر تصانیف اس خاص نظر سے بالاستیعاب دیکھی ہیں۔ کہیں کوئی ہندی لفظ یا جملہ نظر نہ پڑا۔ علاوہ معراج العاشقین کے مجھے اور بھی کئی رسالے مثلاً تلاوت الکوثر و الاسرار، شکار نامہ، تمہیں نامہ وغیرہ ملے جو قدیم اردو میں ہیں اور خواجہ صاحب سے منسوب ہیں۔

اخبار الاخبار تصنیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور جوامع الکلم تالیف سید حسین المعروف بہ سید محمد اکبر حسینیؒ
 فرزند اکبر خواجہ بندہ نوازؒ جس میں حضرت کے ملفوظات و حالات وغیرہ تفصیل سے درج ہیں۔ نیز
 دیگر کتابوں میں جس میں حضرت کا تذکرہ ہے کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ دکنی یا قدیم
 اردو میں بھی ان کی کوئی تصنیف ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے فارسی عربی رسالوں کے ترجمے
 ہیں جو ان کے نام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کی بدعت ہماری زبانوں میں ہوتی آئی
 ہے۔

ان کا منظوم کلام بھی بعض بیاضوں میں پایا جاتا ہے شہباز کا لفظ بھی ان کے نام کے ساتھ آیا
 ہے، اس لیے بعض منظوم اقوال جن میں شہباز بطور تخلص استعمال ہوا ہے ان ہی کا کلام سمجھا جاتا ہے۔
 ان میں سے بعض میں نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام میں نقل کیے ہیں۔
 سب سے قدیم حوالہ ان کے منظوم کلام کا ایک پرانی مستند بیاض میں ملا جس میں میراں جی
 شمس العشاق اور ان کے بیٹے پوتے اور جنس مریدوں کا کلام بڑی احتیاط سے جمع کیا گیا ہے اس
 کتاب کا سن کتابت ۱۰۶۸ھ، ۱۶۵۷ء ہے اس میں ان کی ایک غزل بھی ہے جس کے مقطع میں شہباز
 حسینی آیا ہے۔ اس بنا پر اسے خواجہ کا کلام سمجھ لیا گیا۔ لیکن اس نام کے دو اور بزرگ گزرے ہیں،
 ایک ملک شرف الدین شہباز گجراتی (متوفی ۹۳۴ھ، ۱۵۲۷ء) اور دوسرے بیجاپور کے شہباز
 حسینی (متوفی ۱۰۱۸ھ، ۱۶۰۹ء) اس لیے حتمی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خواجہ بندہ نوازؒ کا
 کلام ہے۔ زبان بھی اس کی بہت پرانی نہیں۔ البتہ اسی بیاض میں مقام "ابھنگ" میں تین مصرعوں
 کا ایک مثلث ان کے نام سے درج ہے جو یہ ہے:

حضرت خواجہ نصیر الدین جنے جو میں آئے جو کا گھونگھٹ کھول کر مکھ پاؤ دکھائے
 آکھے سید محمد حسینی پیو کا سکھ کھیانہ جائے

اس نظم میں ان کے اپنے پیرو مرشد کا نام بھی ہے اور اس کے ساتھ اپنا پورا نام ہے اس
 لیے یہ قیاس کرنی بے جا نہ ہوگا کہ یہ خواجہ صاحب کا کلام ہے۔ جوامع الکلم میں خود خواجہ صاحب
 کی زبانی ان کی متعدد غزلیں منقول ہیں۔ ان غزلوں میں وہ اپنا تخلص محمد یا ابوالفتح یا بوالفتح لکھتے ہیں
 اس وقت تک ہم نے قدیم زبان کی بول چال کے یا منظوم اقوال پیش کیے ہیں کسی مستقل

کتاب کا ذکر نہیں آیا مستقل کتابیں ایک مدت کے بعد تحریر میں آئیں۔ اگر معراج العاشقین سے قطع نظر کی جائے تو دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے مصنف کا نام فخر الدین نظامی ہے جس کا اظہار اس نے اس نظم میں کئی جگہ کیا ہے صحیح من تصنیف معلوم نہ ہو سکا لیکن اس قدر یقینی ہے کہ یہ کتاب سلطان علاؤ الدین شاہ بہمنی ابن احمد شاہ ولی کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔ نعت کے بعد ایک عنوان ہے ”مدح سلطان علاؤ الدین بہمنی نور اللہ مرقہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلطان علاؤ الدین کو مرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا سلطان علاؤ الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ھ، ۱۴۳۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ۸۶۲ھ، ۱۴۵۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے فرزند اور جانشین بہایوں شاہ تھا جو ۸۶۵ھ، ۱۴۶۰ء میں فوت ہو گیا۔ بہایوں کا جانشین اس کا فرزند نظام شاہ ہوا۔ اس کا دو سال بعد ۸۶۷ھ، ۱۴۶۲ء میں انتقال ہو گیا۔ مدح سلطان کے یہ اشعار قابل غور ہیں:

شہنشاہ بر شاہ احمد کنوار، پرتپال سینار کرتار ادھا
دھنن تاج گاکون راجا بھنگ، کنور شاہ کا شاہ احمد بھنگ

سلطان علاؤ الدین کی اولاد اور اس کے جانشین میں کسی کا نام احمد شاہ نہ تھا بعض صاحبوں نے بہمنی سکوں سے یہ پتا لگایا ہے کہ جو سکے ۸۶۵ھ، ۱۴۶۰ء سے ۸۶۷ھ، ۱۴۶۲ء تک مضروب ہوئے ہیں ان پر احمد شاہ کا نام ہے اگر یہ صحیح ہے تو یہ مثنوی انھیں سنیں میں تصنیف ہوئی ہے۔ حال اس میں شبہ نہیں کہ سلطان علاؤ الدین شاہ کے انتقال کے بعد اس کے کسی جانشین کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

اس مثنوی کی زبان میں ہندی عنصر بہت زیادہ ہے۔ عربی فارسی لفظ کہیں کہیں آجاتے ہیں چونکہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی جگہ نہیں اس لیے دو چار شعر بطور نمونہ کے لکھے جاتے ہیں،

حمد: گائیں تہیں ایک دُزجک ادھا، بروردنہ جگہ تہیں دنیہار

جہاں کچھ نکویے تہاں ہے تہیں

اکاس انچہ پاتال دھرنی تہیں

نعت : تہین ایک سا جاگائیں امر سری دومی تین جگ تو را در
امولک مکت سین سنار کا کرے کام سر دھار کرتا رکا

لیکن اس زبان کے ساتھ ساتھ بعض مصرعے یا شعر ایسے صاف ہیں کہ وہ آج کل کی سی
زبان کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً :

سیانا کھرات بدھ و نت توں تجھ نا کہوں اور کس کوں کہوں

گنواوے کہیں اور ڈھونڈے کہیں نہ پاوے کہیں ڈھونڈنے بن کہیں

نظامی کہنہ ر جس پار ہوئے سننہار سن نغز گفتار ہوئے

نہ باسی دھروں نہ تو اسی دھروں

(آج کل کی زبان میں "باسی تباسی" کہتے ہیں —)

جہاں تک موجودہ تحقیقات کی دسترس ہے، اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے
کہ اگرچہ وکئی اردو کی سب سے قدیم کتاب نظامی کی مثنوی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ
اس زبان کو مستقل طور پر ادبی صورت میں پیش کرنے کی فضیلت گجرات کو حاصل ہے اور یہ
فضیلت اسے صوفیائے کرام کی بدولت نصیب ہوئی۔

مسلمان سلاطین میں سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور ۱۲۹۶ء
میں گجرات پر تسلط کر لیا۔ اس وقت سے اس علاقے کے صوبیدار دلی کی سلطنت کی طرف
سے مقرر ہو کر آتے رہے صوبیدار کے ساتھ لاؤ لشکر، مختلف پیشہ ور شاگرد پیشہ، ملازمین،
مصاحبین وغیرہ کی ایک کثیر جماعت ہوتی تھی اور ان کے لواحقین اور اہل و عیال بھی ان
کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ دوسرے ساز و سامان کے ساتھ دلی کی زبان بھی اپنے ساتھ لاتے
تھے۔ گویا دلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسرو کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔

تیمور کے حملے کے بعد جب دہلی کی حکومت میں ضعف پیدا ہوا اور صوبہ اتر پردیش کے بیٹے تاتا خان نے گجرات میں خود اپنی حکومت قائم کر لی۔ (۸۰۶ھ، ۱۴۰۳ء) تو شمالی ہند سے شرفا کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے گجرات آ گئی۔ ان میں کچھ ایسے بزرگ بھی تھے جو علوم ظاہر و باطن کے عالم اور صاحبِ عرفان تھے۔ چنانچہ شیخ احمد کھٹو (متوفی ۸۳۹ھ، ۱۴۲۵ء) حضرت قطب عالم جانشین مخدوم جلال جہانیاں (۷۹۰ھ تا ۸۵۰ھ، ۱۳۸۸ء تا ۱۴۲۷ء) کے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے اقوال میں اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں نقل کر چکا ہوں۔ اس زبان میں ان حضرات کی کوئی مستقل تصنیف و تالیف نہیں، لیکن ان کے مریدوں میں بعض ایسے بزرگ ہیں جن کی مستقل تصانیف اس زبان میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک قاضی محمود دریائی ہیں جن کا شمار گجرات کے اولیاء اللہ میں ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے۔ زبان ہندی نام ہے۔ مقامی رنگ صاف ظاہر ہے۔ گجراتی اور فارسی عربی لفظ بھی کہیں کہیں استعمال کیے ہیں۔ کلام کا طرز بھی ہندی ہے چونکہ سماع کا خاص ذوق تھا اس لیے نہر نظم کی ابتداء میں اس کے راگ یا راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ ان کا مشرب عشق و محبت ہے اور سارا کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ان کا کلام (زبان کی اجنبیت کی وجہ سے) مشکل ہے۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ نمونے کے طور پر دو چار شعر لکھے جاتے ہیں۔ اس سے ان کی زبان اور طرز کلام کا اندازہ ہو گا:

نینوں کا جل مکھن بنولناک موتی گل حار سبب نماؤں نیہ اپادوں پے پیرکوں جو ہار
(یعنی آنکھوں میں کاجل منہ میں پان ناک میں موتی گلے میں ہار۔ اس سچ دھج سے میں سر کو جب کاؤں محبت کروں اور پیر کو آداب کروں)

کوئی مایلا مرہ نہ بوجھے رہے بات من کی کس نہ سوچھے رہے

(مایلا = اندر کا - مرہ = بھید)

دکھ جیوں کا کس کہوں اللہ دکھ بھریا سب کوئی رہے
نزد و کس جگ میں کونسیں میں پر تھی پھر پھر جوئی رہے
(یعنی اے اللہ میں اپنے جی کا دکھ کس سے کہوں۔ سب کوئی دکھ بھریا)

ہیں۔ میں نے دنیا جہان میں پھر پھر کے دیکھ لیا۔ کوئی ایسا نہ ملا جو
دکھی نہ ہو۔

ان کی ولادت ۱۸۷۲ء، ۱۴۶۹ اور وفات ۱۹۴۱ء، ۱۵۳۲ء میں ہوئی۔
ایک دوسرے بزرگ شاہ علی جوگام دھنی میں جن کا مولد و منشا گجرات ہے۔ گجرات کے
کامل درویشوں اور عارفوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بڑے پائے کے شاعر ہیں اور
ان کا کلام توجید اور وحدت الوجود سے بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وحدت وجود کے مسئلے کو معمولی باتوں
اور تمثیلوں میں بیان کرتے ہیں، مگر ان کے بیان اور الفاظ میں پریم کا رس گھلا ہوا معلوم ہوتا ہے
وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق ہے۔ طرز کلام ہندی شعر آکاسا ہے۔ اور عورت کی طرف سے خطاب
ہے۔ زبان سادہ ہے، لیکن چونکہ پرانی ہے اور غیر مالوس الفاظ استعمال کیے ہیں، اس لیے کہیں کہیں
سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "جواہر الاسرار" کے نام سے موسوم ہے:

تم ری پیا کو دیکھو جیا ہور جیون پر تھوسا میں ایسا
سو بے تمہیں ہوناں وہ ایسا

اک سمند سات کہاوے دھونوس بادل مینہ برس اوے
وہی سمند ہو بوند کہا لے ندیا، نالے ہو کر چالے

پیو ملا گل لاگ رہی جے سکھ منہ دکھ کی بات نہ کیجے

شاہ صاحب کا سن وفات ۱۹۷۳ء، ۱۵۶۵ء ہے۔

ایک اور بزرگ میاں خوب محمد چشتی ہیں۔ یہ بھی احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے
ان کا شمار وہاں کے بڑے درویشوں اور اہل عرفان میں ہے۔ تصوف میں بڑی دستگاہ رکھتے
تھے۔ صاحب تصانیف اور صاحب سخن تھے۔ آپ کی ولادت ۱۹۲۶ء، ۱۵۳۹ء میں اور
وفات ۱۹۷۳ء، ۱۶۱۲ء میں واقع ہوئی۔

تصوف میں آپ کی کئی کتابیں ہیں۔ سب سے مشہور اور مقبول کتاب "خوب ترنگ" ہے جس کا سن تصنیف ۹۸۶ھ ۱۵۷۸ء ہے۔ یہ خاص تصوف کی کتاب ہے۔ میاں خوب محمد عالم اور سالک ہیں تصوف کی اصطلاحات و نکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں۔ اپنی اس کتاب کی شرح انھوں نے "امواج خوبی" کے نام سے لکھی ہے۔ علاوہ خوب ترنگ کے ان کا ایک منظوم رسالہ "بھاؤ بھید" صنائع و بدائع کلام پر بھی ہے۔

یہ صوفی شعرا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ہندی میں لکھنے کی معذرت کرتے ہیں اور اپنی زبان کو "گو جری یا گجری" کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دلی سے جو زبان جنوب کی طرف گئی اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ دکن میں گئی تو دکنی لہجے اور الفاظ کے دخل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو وہاں کی مقامی خصوصیت کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی۔ زبان حقیقت ایک ہی ہے۔ بعض مقامی الفاظ اور محاورات کی وجہ سے یہ تفریق ہو گئی۔ آخر میں یہ تفریق مٹ گئی اور دونوں علاقوں کی زبان دکنی ہی کہلائی۔

دکنی زبان کا دوسرا بڑا مرکز بیجا پور تھا۔ جہاں عادل شاہی سلاطین کی زیر سرپرستی اس زبان کو فروغ ہوا۔ اس زمانے کے ایک صوفی بزرگ امیر الدین عرف میرا نخی شمس العشاق ہیں جو مکہ میں پیدا ہوئے جیسا کہ انھوں نے خود اپنے حالات میں لکھا ہے اور بحکم پیر (کمال الدین سیالانی) بھنگار (علاقہ احمد آباد) میں جا کر مقیم ہوئے۔ بعد ازاں کچھ عرصے بعد وہاں سے منتقل ہو کر انھوں نے بیجا پور میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ان کے نظم و نثر میں کئی رسالے ہیں ایک منظوم رسالے کا نام "خوش نامہ" ہے۔ اس میں وہ تصوف و معرفت کی باتیں ایک لڑکی "خوش" نامی سے لڑکیوں کے حالات کی مناسبت سے بیان کرتے ہیں، مثلاً یہ دنیا اس کی سرالہ ہے اور عالم آخرت اس کا میکا ہے۔ اس طرح تمام نسوانی مناسبات مثلاً زیور پہنا، ہندی لگانا، چرخا کاتا وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔

اس رسالے میں پونے دو سوشعر ہیں۔ ایک دوسری نظم "خوش نغز" ہے، جس میں خوشی سوال کرتی ہے اور میرا نخی جواب دیتے ہیں۔ ایک اور منظوم رسالہ جس میں تخمیناً پانچ سوشعر ہیں تصوف کے معمولی مسائل پر ہے۔ اس میں وہ ہندی میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں اور

معذرت کرتے ہیں۔ میراجی کا سنہ وفات ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۶ء جو شمس العشاق سے نکلتا ہے چنانچہ بعد میں وہ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ اس کی مزید تائید اس مرثیے سے ہوتی ہے جو ان کے ایک عقیدت مند نے ان کی رحلت پر کہا ہے۔ یہ مرثیہ اس بجا پوری بیاض میں ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس مرثیے کے وہ شعر نقل کئے جاتے ہیں، جن میں ان کی وفات کا سنہ تاریخ اور دن مذکور ہے:

تاریخ حضرت سال نور	اور اس پر اگلے بھی دو
دو دین مدت و فاشو	جے کچھ حکم الاهی کا
اربع سوں یوں سال ہے	ماہے کوں شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے	جے کچھ حکم الاهی کا
تاریخ بست و بیخ بد	بسیار گریاں رنج شد
در حال واصل کنج خود	جے کچھ حکم الاهی کا
شب پنجشنبہ روشن کیا	ہجرت منور پور کیا
جوڑا قبض کر ان لیا	جے کچھ حکم الاهی کا

میراجی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم اپنے وقت کے بڑے عارف اور صوفی اور بہت خوش گو شاعر تھے۔ یہ علی عادل شاہ اول (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) کے عہد کے بزرگ ہیں کیونکہ ان کے کلام نکتہ وا حدیث کے ایک فرمان "کا" ۱۵۵۹ء اور ایک دوسرے کا ۱۵۶۹ء ہے اور ان کی مثنوی ارشاد نامہ کا سن تصنیف ۱۵۸۲ء ہے۔ ان کی ولادت اور وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن کم از کم اتنی بات متحقق ہے کہ انھوں نے ۹۹۰ھ میں یا اس کے بعد وفات پائی۔ مجھے ان کی متعدد نظموں اور منظوم رسالے ملے ہیں جن کا ذکر میں نے رسالہ "اردو" ماہ جنوری ۱۹۲۷ء میں کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی نظم (مثنوی) ارشاد نامہ ہے جس میں تخمیناً اڑھائی ہزار اشعار ہیں۔ ان کی زبان اگرچہ پرانی ہے، لیکن میراجی شمس العشاق کے مقابلے میں سہل اور سادہ ہے بعض مقامات پر سادگی کے ساتھ کلام میں شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

بن عشق بندھ کو سوچ نہیں اور بن بندھ عشق کو گوج نہیں
جے آپ کو کھو جیں پو کو پائیں پیو کو کھو جیں آپ گنوائیں

علاوہ مثنویوں اور دوسری منظومات کے شاہ صاحب نے بہت سے خیال اور

بھی لکھے ہیں جن کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے اور ہر دوسے کے ساتھ راک راگنی کا نام بھی
لکھ دیا ہے۔ خاندان چشتیہ کے بزرگ موسیقی کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ روحانی ذوق پیدا کرنے
اور روحانی مدارج طے کرنے میں اسے بہت بڑا ممد خیال کرتے ہیں۔

ان کی اکثر نظموں کی بحریں ہندی میں اور زبان پر بھی ہندی رنگ غالب ہے البتہ ہندی
الفاظ و اصطلاحات کے ساتھ کہیں کہیں فارسی اور عربی الفاظ اور اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں،
نیز وہ اپنی نظموں میں ہندو مسلم دونوں روایات و تعلیمات سے کام لیتے ہیں۔ اگر ایک دوہے میں
یوسف زلیخا کی تلمیح ہے تو دوسرے میں سری کرشن جی کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ برہان
اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ (یہ سب گجری کیا بیان)

عبدل (عبدالغنی؟) بھی اسی زمانے کا شاعر ہے اس کی تصنیف "ابراہیم نامہ" ہے جو اس
نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات میں خود اس کی فرمائش پر تصنیف کیا۔ (۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء)
اسی عہد کا ایک مشہور شاعر حسن شوقی ہے۔ مجھے اس کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں ایک
"فتح نامہ نظام شاہ" یا "ظفر نامہ نظام شاہ" جو رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں تالی کوٹ کی مشہور جنگ
کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ جنگ ۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس میں دکن کے فرمانرواؤں
یعنی علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر وجیانگر کے راجہ رام
راج پر لشکر کشی کی اور اسے مقام تالی کوٹ پر شکست دی۔ دوسری مثنوی میں جس کا نام "میزبانی
سلطان محمد عادل شاہ" سلطان کی شادی سے متعلق ہے۔ اس میں شہر گشت اور جشنوں کی دھوم
دھام اور میزبانی اور مہمان کی شان و شوکت کا ذکر ہے۔ ان مثنویوں کی زبان قدیم دکنی اردو
ہے، مگر نسبتاً سہل ہے۔ بیان میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ شوقی کی غزلیں بھی مجھے ملی ہیں
ان میں بعض مسلسل اور مرصع ہیں۔ اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو ولی اور اس
کے بعد کے اساتذہ کی غزلوں کے مقابلے میں کسی طرح کمتر نہیں۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ تازہ کے عہد میں قدیم و کئی اردو کا خاصا رواج ہو گیا تھا اور یہ لٹری
وفات میں بھی پہنچ گئی تھی۔ بادشاہ خود بھی شاعر اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اسی بنا پر اس نے "جگت گرد"
کالقب پایا۔ اس کی مشہور کتاب "نورس فن موسیقی پر ہے جس پر ظہوری نے ویجاچہ لکھا، "جوسنظرظہوری"
کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی زبان ہندی ہے، لہذا کہیں کوئی دکنی لفظ آجاتا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ تازہ کے انتقال کے بعد محمد عادل شاہ تخت پر بیٹھا (۱۰۳۶ تا ۱۰۴۷ھ) اس عہد میں

بھی اردو کا رواج برابر بڑھتا رہا۔ اس عہد کے تین شاعر قابل ذکر ہیں۔ ایک مقیمی (مرزا مقیم خان مصنف
چندر بدن مہیار" (۱۰۵۰ھ)، دوسرا ملک خوشنود مصنف "جنت شکار" (تقریباً ۱۰۵۰ھ)، تیسرا بہشت امیر خسرو سن تصنیف
۱۱۶۴ھ تیسرا رستمی (کمال خان) جو بہت پر گو شاعر تھا۔ اس کی تصنیف "خاور نامہ" ایک ضخیم رزمیہ مثنوی ہے جو چوبیس
ہزار اشعار پر مشتمل ہے یہ فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں حضرت علیؑ اور ان کے رفقاء کی لڑائیوں کی
فرہنی داستان ہے۔ سن تصنیف ۱۰۵۹ھ، ۱۱۶۴ھ ہے۔

محمد عادل شاہ کے جانشین علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد میں دکنی اردو
خوب فروغ ہوا۔ اس بادشاہ نے اردو کی طرف خاص توجہ کی۔ خود بھی بہت اچھا شاعر تھا شاہی
تخلص کرتا تھا۔ اس کا کلیات موجود ہے جس میں اس کا کلام اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہے
اس عہد میں سب سے بڑا شاعر نصرتی ہے جو علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا
رزم و بزم دونوں میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ اس کی تین مثنویاں یادگار ہیں ایک "گلشن عشق" جو نصرتی
کی سب سے پہلے تصنیف ہے (۱۰۶۷ھ) یہ منوہر اور مدالتی کے عشق کی داستان ہے۔ دوسری
"علی نامہ" اس میں علی عادل شاہ کی جنگی مہات کا بیان جو اسے مغلوں اور مرہٹوں کے خلاف لڑنی
پڑیں۔ یہ بڑے پائے کی مثنوی ہے۔ اس میں شاعر نے تاریخی واقعات کی تفصیل، مناظر قدرت کی کیفیت
رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور سناعی سے کھینچا ہے۔ نصرتی کی
یہ مثنوی نہ صرف قدیم دکنی اردو میں بلکہ تمام اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس کی تصنیف
نصرتی کے فسانہ بھی بہت پر شکوہ ہیں اور زور بیان، علوم مضامین اور شوکت لفظی میں کمال
میں تیسری مثنوی "تاریخ اسکندری" ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کے جانشین اور عادل شاہی
سلطنت کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ تا ۱۰۹۷ھ) کی اس لڑائی کا بیان ہے

جو اسے شیواجی بھونسلہ سے لڑنی پڑی۔ یہ ۱۰۸۶ھ کی تصنیف ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ نے اپنے والد حضرت برہان الدین جانم اور اپنے دادا میراجی شمس العشق کی پیروی میں متعدد نظم و نثر کے رسالے تصوف کے مسائل پر لکھے۔ ان کی زبان نسبتاً آسان ہے۔

اس عہد کا ایک بڑا شاعر سید میران ہاشمی گزرا ہے جو ماورزاواندھا تھا۔ اس کی مثنوی "یوسف زلیخا" بہت مشہور ہے۔ اس نے غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ریختی کارنگ پایا جاتا ہے۔ اس طرز کلام کا لکھنے والا یہ پہلا شخص ہے۔

دکنی اردو کا تیسرا مرکز گوکنڈہ قطب شاہیوں کا دار الحکومت تھا قطب شاہی بادشاہ علم و ہنر کے بہت قردان تھے۔ بالخصوص اس خاندان کا پانچواں بادشاہ سلطان محمد قلی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) کے عہد میں ملک نے خوش حالی میں اچھی ترقی کی اور علم و فن اور شعر و شاعری کا خاصا چرچا رہا۔ بادشاہ خود بڑا اچھا شاعر تھا اس کا کلیات بہت ضخیم ہے۔ وہ بہت پرگو اور قادر الکلام شاعر ہے۔ غزل کے علاوہ اس نے قصیدے، مثنویاں، مرثیے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ متعدد قصیدے اور مثنویاں منظر ہر قدرت، تہواروں، رسوم و رواجوں، موسموں، میوہوں اور اپنے باغات اور محلات وغیرہ پر لکھی ہیں۔ محمد قلی کا کلام بہت قدیم ہے، لیکن اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو اس کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو بعد کے نلمو شعرا میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا مستند کلیات (مرتبہ ۱۰۲۵ھ) میں ہندی اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔

اس کا بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ بھی (۱۰۲۰ء تا ۱۰۳۵ھ) جس نے سلطان محمد قلی کا کلیات مرتب کیا ہے، شاعر تھا اور "ظل اللہ" تخلص کرتا تھا۔ محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا اور اس کا دیوان بھی موجود ہے۔

قطب شاہی عہد کے تین شاعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک "وجہی" مصنف "قطب مشرقی" (۱۰۱۸ھ) ہے۔ یہ نظم و دکنی ادب کی ابتدائی مثنویوں میں بڑی پائے کی ہے۔ یہ درپردہ محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق ہے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری

تصنیف "سب رس" ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ دوسرا شاعر غواصی ہے۔ اس کی دو مثنویاں سیف الملوک "و بدیع الجمان" $\frac{۱۰۲۵}{۱۶۲۵}$ اور "طوطی نامہ" $\frac{۱۰۴۹}{۱۶۳۹}$ بہت مشہور ہیں۔ سیف الملوک و بدیع الجمان اسی نام کے فارسی قصے کا اور طوطی نامہ "صیاد الدین بخش" کے "طوطی نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ غواصی کا دیوان بھی ہے۔ وہ بہت خوش گو شاعر ہے۔ اس کی غزلوں کی زبان صاف اور فصیح ہے۔ اس کے قصیدوں میں بھی شوکت پائی جاتی ہے۔ تیسرا شاعر ابن نشا ملی مصنف "پھول بن" ہے۔ "پھول بن" ایک فارسی قصے "بساتین" کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ اس نے صنائع بدائع سے خوب کام لیا ہے اور ساری مثنوی مرصع ہے لیکن سادگی اور روانی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کا سن تصنیف $\frac{۱۰۶۶}{۱۶۶۵}$ ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال پر اس کے حصے بخرے ہو گئے اور پانچ نئی خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ یعنی قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، برید شاہی، ان سب حکومتوں نے قومی زبان اردو (دکنی) کی سرپرستی کی۔ نظام شاہی حکومت کا بانی ملک احمد بھری الملقب بہ نظام الملک $\frac{۸۹۵}{۱۶۱۲}$ تا $\frac{۹۱۲}{۱۶۲۹}$ ہے۔ اس کے زمانے کے ایک شاعر کا پتہ لگا ہے جس کا تخلص اشرف ہے۔ اس کی مثنوی "نوسر بار" شہدائے کربلا کے بیان میں ہے اس کتاب کا سن تصنیف جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے $\frac{۹۰۹}{۱۶۰۳}$ ہے۔

بازان جو تھی تاریخ سال بعد از بنی ہجرت حال

نوسر ہوتے اگلے نو یہ دکھ لکھیا اشرف تو

اگرچہ یہ مثنوی دکنی اردو کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے اور بہت قدیم ہے، لیکن اس کی زبان سادہ اور سہل ہے اور دوسری دکنی کتابوں کی طرح جو بعد کی اور بہت بعد کی ہیں، مشکل اور سخت نہیں ہے۔ اس میں ٹھٹھ دکنی الفاظ اور محاورے اور ہندی سنسکرت کے مشکل الفاظ نہیں ہیں۔

برید شاہی حکومت کا بانی قاسم برید تھا۔ اس نے اپنا دار الحکومت بیدر قرار دیا جو بہمنی سلطنت کا بھی دار الخلافہ تھا۔ اس کے فرزند امیر برید کے عہد میں ایک شاعر شہاب الدین قریشی گزرا ہے۔ اس کی کتاب "بھوگ بل" کوک شاستر کا ترجمہ ہے، امیر برید کے نام معنون ہے:

اے شہر بیدر چانت گاہ کہ بیٹھا امیر شاہ سا بادشاہ

کتاب کے آخر میں سن تصنیف (۱۹۱۴ء) بھی بیان کر دیا ہے :

ہزار اور قویں میں تھے سال جب کیا میں مرتب سو خوش حال سب
 گجرات و دکن میں اردو کی ترویج و فروغ کا یہ تذکرہ شہنشاہ عالم گیر اور رنگ زیب کے عہد تک
 پہنچتا ہے۔ ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ بتدریج ہندی کے عزیز
 ناملائم اور نامانوس الفاظ کم ہوتے گئے اور عربی فارسی الفاظ بڑھتے گئے حتیٰ کہ دلی دکنی (گجراتی) کے
 کلام میں ہندی فارسی الفاظ کا مناسب توازن نظر آتا ہے۔ یہ ہونا لازم تھا کیونکہ اردو شاعری کی
 تمام اصناف فارسی کی مرہون منت ہیں اور ان کے ادا کرنے میں بھی فارسی کی تقلید کی گئی ہے
 اسی لیے اب تک اردو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چھایا رہا۔ عہد عالم گیر کے آخر زمانے میں
 اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ دلی دکنی کا انتقال شہنشاہ عالم گیر کی وفات کے ایک
 سال بعد ۱۱۱۹ھ میں ہوتا ہے۔ اس سے چند سال پہلے (۱۱۱۴ھ میں) وہ دلی آیا تو اہل ذوق اس کا کلام
 سن کر بہت مخطوط ہوئے اور وہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ وہاں کے موزوں طبع حضرات نے اسی طرز
 میں غزل گوئی شروع کر دی۔ اس سے قبل شمالی ہند میں کوئی غزل گو شاعر نہیں پایا جاتا۔ دلی کو بھی دلی
 کی زبان سے فیض پہنچا۔ دلی غزل کا شاعر ہے۔ قدما کی زبان میں جو کج خشکی اور ناہموری تھی وہ دلی
 کی زبان میں نہیں۔ اس کی زبان میں لوج اور لطافت اور بیان میں لذت اور روانی پائی جاتی ہے۔
 تصوف کے لگاؤ نے اس کے کلام میں درد مندی پیدا کر دی ہے۔ اس نے فارسی اور ہندی الفاظ کا
 مناسب تناسب قائم رکھا ہے۔ دلی کا درجہ بین بین ہے۔ اگر وہ بہت بلند پروازی نہیں کرتا تو پستی
 کی طرف بھی نہیں جاتا۔

دکن میں دلی کے ہم عصر اور بھی کئی شاعر تھے۔ ان میں صرف چند قابل ذکر ہیں۔ گجراتی مصنف
 "یوسف زینجا" (۱۶۹۷ھ) قاضی محمد بھری جن کی مثنوی "من لکن" دکن میں بہت مقبول ہوئی اور بار بار
 طبع ہوئی۔ ان کا کلیات بھی ہے جس میں غزلوں کے علاوہ بعض دیگر اصناف ہیں۔ ان کا کلام بڑے
 پائے کا ہے۔ وجیہ الدین وجدی جن کی مثنوی "نہی باجا" (۱۱۳۱ھ) ترجمہ "منطق الطیر" بہت مشہور ہے۔

شمال ہند میں اردو شاعری کا آغاز محمد بادشاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) اور شاہ مہدی (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۹۱ھ) کے وقت سے ہوتا ہے۔ ولی کا دیوان دلی میں پہنچا تو غزل گوئی کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ شاہ مہدی کے آبرو (متوفی ۱۱۶۴ھ) (۱۱۵۰ھ) شاہ حاتم (۱۱۱۱ھ تا ۱۱۹۹ھ) (۱۲۰۶ھ) شرف الدین مضمون (متوفی ۱۱۵۸ھ) (۱۱۴۵ھ) سید محمد شاہ کراچی وغیرہ نے اسی رنگ میں غزل گوئی کا آغاز کیا۔

اس عہد میں خواجہ میر درد (۱۱۳۲ھ تا ۱۲۱۱ھ) اپنے کلام اور بزرگی کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا کلام اپنی خصوصیت کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ فارسی اور ہندی کے اثر سے تصوف اردو شاعری میں پہنچ گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں صوفیانہ شاعری کا حق خواجہ صاحب ہی نے ادا کیا ہے۔ ان کا تصوف عطار و سنائی سے ملتا ہے نہ کہ حافظ و خیام سے۔ ان کا طرز بیان پاک صاف رواں اور پختہ ہے اور تاثیر سے خالی نہیں۔ ان کا شمار اپنے وقت کے اولیا اور عارفوں میں تھا۔ ان کے کلام میں بھی عرفان و معرفت کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ بڑے خود دار اور اعلیٰ سیرت کے بزرگ تھے۔ جب دلی پر پلے پلے آفات نازل ہوئیں اور شعر و سخن کا کوئی سرپرست نہ رہا تو شعرا عظام دلی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے مگر خواجہ صاحب کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔

لیکن اردو کے کمال کا زمانہ میر تقی میر (۱۱۲۵ھ تا ۱۲۲۲ھ) کا زمانہ ہے۔ میر کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے والد ایک گوشہ نشین متوکل درویش تھے۔ میر کی نو عمری کا بڑا حصہ شب دروز درویشوں کی صحبت میں گزرا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے اور تلاش معاش میں دلی سے آگرے آئے۔ اُس وقت مغلوں کے اقبال کا ستارہ گنار با تھا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد احمد شاہ درانی کے حملوں مرہٹوں اور جاٹوں کی فارت گرمی نے اس کی رہی سہی وقعت خاک میں ملا دی تھی۔ ان تمام واقعات کا اثر ان کے دل پر بہت گہرا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حزن و یاس، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام عاشقانہ ہے اور جذبات کے اظہار میں خلوص پایا جاتا ہے اور زبان میں خاص گھلاوٹ اور شیرینی، سادگی اور موسیقیت ہے۔ یہ خوبیاں یکجا کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اردو کا کوئی شاعر اس میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تمام باکمال شعرا نے انہیں استاد مانا ہے۔ ان کی بعض مثنویاں بھی بڑے پائے کی ہیں۔ وہ بہت بلند سیرت کے شخص تھے۔ خود داری اور بے نیازی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اسی

نہ رہی تو دلی کی ساری رونق لکھنؤ آگئی۔ میر صاحب بھی نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ چلے آئے۔

ان کے ہم عصر سودا (۱۲۵ھ م ۱۷۱۶ء تا ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۰ء) کو وہ مرتبہ حاصل نہیں۔ ان کے دیوان میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ مصاحب اور درباری تھے۔ اپنے مزاج پر قابو نہیں رکھتے تھے۔ اکثر اوقات خواہ مخواہ جھگڑے مول لیتے تھے اور طویل طویل ہجوئیں کہتے تھے لیکن باوجود اس کچھڑے کے جو انھوں نے اچھالی ہے وہ بہت قادر الکلام شاعر تھے اور ان کا شمار اردو کے اول درجے کے باکمال اساتذہ میں ہے۔ اردو زبان میں ان کے قصائد اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں شکوہ بیان میں قدرت اور وسعت نظر پائی جاتی ہے۔ وہ ہر صنف سخن پر قادر تھے۔

میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ، ۱۷۹۱ء) اپنے زمانے کے رسوم و عادات کے مصوّر ہیں۔ وہ ہر چیز کو صحیح طور سے اور اصلی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ وہ حقیقت نگار ہیں۔ ان کی مشہور مثنوی "سحر البیان" میں قدرتی مناظر اور انسانی جذبات، دلوں کا بیانیہ موجود ہے۔ میر حسن بیان اور لطف زبان بدرجہ کمال پایا جاتا ہے۔ اردو زبان میں یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی۔ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس نظم کا قصہ قدیم طرز کا ہے۔

مصحفی (متوفی ۱۲۲۱ھ م ۱۸۲۵ء) بہت پرگوشتاق اور پختہ شاعر تھے۔ فن شعر کے نکات پر گہری نظر تھی۔ ان کا کلام آٹھ جلدوں میں ہے۔ سودا کے انداز میں قصیدے بھی بہت لکھے ہیں۔ زبان میں سفاکی اور روانی ہے اور ہر قسم کے مضمون ادا کرنے پر قادر ہیں۔ ان کے استاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

اب رنگین (متوفی ۱۲۵۰ھ) (انشاد ۱۲۳۳ھ م ۱۷۱۶ء) کا دور آتا ہے۔ یہ بھی سودا، تیر اور حسن کی طرح لکھنؤ آگئے تھے۔ لکھنؤ اس زمانہ میں عشرت پسندی، تکلفات اور نمود و نمائش کا مرکز تھا۔ یہ رنگ ان کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی تھی۔ اسی رنگ میں شاعری بھی رنگی گئی۔ رنگین ریختی کا موجد ہے یعنی وہ اس طرز کا بانی ہے۔ جس میں سارا کلام عورتوں کی ہی زبان میں اور عورتوں ہی کے منقلب ہوتا ہے۔ وہ جام ہند کی گامے نوش ہے۔ مگر اس کا معیار ادنیٰ ہے۔ اس کی شاعری تمام تر شہواتِ نفسانی سے پُر ہے۔

انشا شہواتِ نفسانی کا دلدادہ نہیں مگر بڑا زندہ دلی، خوش طبع اور ظریف ہے، خوب سنتا

ہے اور ہنساتا ہے۔ انشا اور ادب میں ایک شاندار کھنڈر کی مانند ہے۔ وہ سچا شاعر تھا جو زمانہ زوال میں پیدا ہوا جب کہ عزتِ نفس اور خودداری کی جگہ غلامی نے لے لی تھی۔ انشا زندگی کو کھیل سمجھتا ہے۔ اس کی نظم کارنگ بہت شوخ ہے اور جذبات جھوٹے ہیں۔ وہ فنِ شعر کا استاد ہے۔ اس میں بلا کی جدت اور طباعی ہے۔ اگرچہ اس کے تکلفات اور تصنیعات اردو ادب کو ایک طرح سے نقصان پہنچا مگر پھر بھی اس نے بیان میں شگفتگی، تازگی اور وسعت پیدا کی ہے۔ اس کا اثر غیر دثر دونوں جانب ہے۔ وہ اس بر عظیم کی متعدد زبانیں جانتا تھا۔ اردو زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس پر اس کا کلام اور خاص کر اس کی کتاب ”دریائے لطافت“ شاہد ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک اہل زبان نے اردو صرف و نحو اور لسانیات پر لکھی ہے۔ اگر وہ شاہی دربار میں جا کر اپنی ہستی نہ کھو دیتا تو سودا کی ٹکر کا ہوتا اور شاید بعض صورتوں میں وہ اردو کے حق میں بے نظیر کام کرتا۔

نظیر (متوفی ۱۸۳۰ء ۱۲۴۶ھ) اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ بہت نا انصافی کی گئی ہے۔ ہمارے شاعروں اور تذکرہ نویسوں نے اسے سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھا۔ اس کی قدر سب سے پہلے یورپیوں نے کی، لیکن انھوں نے اور ان کے مقلدوں نے اسے اس قدر بڑھایا جس کا شاید وہ مستحق نہ تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں وہ اپنی وضع کا ایک ہی شاعر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعر ہے۔ اس میں پاک دلی اور محصومیت کے ساتھ انتہا درجے کی رند مشربی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بے اعتدالی جو کہیں کہیں آجاتی ہے لطف سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض اوقات شہوانی خواہشیں اسے گمراہ کر دیتی ہیں، مگر اس کا کمال اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کی شاعری شہوانی جذبات کو مشتعل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کا بہترین کلام وہ ہے جس میں وہ اپنے دس کاراگ گاتا ہے اور مزے مزے۔ بیڑوں پر نصیب لکھتا ہے جن کو بڑے بچے امیر غریب سب پڑھنے اور مزہ لیتے ہیں۔ اپنے وطن کی بجز زمین کی طرح اس کی طبیعت زرخیز اور مال مال ہے۔ اس کی اکثر نظمیں پرندوں اور جانوروں پر ہیں (مثلاً ہنس بچارا، ریچھ کا پتہ، گلہری کا پتہ) جو مجاز سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ دراصل اس زمانے کے معاشرے کی رسوم و عادات پر تنقید ہے۔ اس نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں ہندوستان کے تہواروں کا پر لطف سماں کھینچا ہے۔ اس نے ہندوستان کے موسموں کا حال جس لطف و خوبی سے لکھا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا عاشق ہے۔ اس کا یہ کمال کا لید اس سے کم نہیں۔ وہ اپنے اسلوب بیان میں بے پروا ہے۔ اس کا کلام غیب سے خالی نہیں۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں لاابالی ہے اور اسے اپنے بیان کی روانی میں کسی چیز کا ہارج ہونا گوارا نہیں۔ اس کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ عوام کا شاعر ہے۔

ذوق (۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء تا ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۲ء) فارسی شعرا کے ایک طویل سلسلے کا مقلد ہے۔ اس کے قصیدے جو زیادہ تر آخری مغل بادشاہ کی مدح میں ہیں، اردو زبان میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ غزلوں کی حالت دوسری ہے۔ اس کی طبیعت غزل کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ فن کے لحاظ سے اس کی غزلیں بے عیب ہیں مگر ان میں شعریت کم ہے ذوق محبت کی گرمی اور جوش سے خالی ہے۔

مومن (۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء تا ۱۲۷۸ھ ۱۸۵۱ء) ایک عاشق مزاج لذت کا دلدادہ حسن پرست شاعر تھا۔ اگرچہ اس نے قصیدہ، مثنوی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کا اصل کوچہ غزل ہے جس میں وہ غشیہ معاملات اور واردات کو پیش کرتا ہے۔ ان خیالات کے ادا کرنے میں اس نے اکثر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے لیکن اس کے کلام میں سوز و گداز اور اثر نہیں۔ اس کا عشق صادق نہیں۔

سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ بہت پر گوشاعر تھے۔ ان کے چار ضخیم دیوان موجود ہیں۔ بہت سی اصناف سخن پر شاہ نصیر کے شاگرد رہے۔ ان کے بعد ذوق سے مشورہ سخن کرنے لگے جو ان کے دربار کے ملک الشعراء تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے۔ ان کے کلام کا اکثر حصہ بھرتی کا ہے۔ نئی نئی زمیںیں اور نئے نئے قافیے اور روئیں نکالنے کا بہت شوق تھا لیکن اکثر اشعار جن میں واردات قلبی کی کیفیت کا بیان ہے سوز و گداز اور یاسیت سے پر ہیں۔ بادشاہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ اپنے اشعار میں روزمرہ اور محاورہ بڑی خوبی سے باندھتے ہیں، اس لیے ان کا کلام سندر ہے۔ بقول حالی: "ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے۔" تصوف سے بھی بہت لگاؤ ہو گیا تھا چنانچہ ان کے کلام میں صوفیانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری بے مزہ اور تقلیدی تھی جس میں وہی خیالات وہی الفاظ وہی باتیں ہیں جو بار بار دہرائی جا چکی ہیں۔ شمع نظم بچھنے کو تھی کہ غالب ایک شعلہ طور کی طرح نمودار ہوا۔

غالب سپاہی خاندان کا تھا۔ اس کی رگوں میں ایک ترک کی خون تھا جس نے اس کی شاعرانہ میں گری پیدا کر دی۔ ابھی وہ مکتب ہی میں تھا کہ اس نے شاعری شروع کر دی۔ لیکن اس کا کمال ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اگرچہ ترقی کا انقلاب تھا مگر غارت گر بھی تھا۔ اس میں بہت سی وہ چیزیں بھی برباد ہو گئیں جو رہنے کے قابل تھیں۔ مغلیہ سلطنت کے جانے سے جو صدمہ اسے ہوا، اس کا اثر اس کے کلام میں درد اور سوز سے پایا جاتا ہے۔

غالب اپنے زمانے سے بہت آگے تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہم عصروں نے اس کی قدر نہ کی۔ غالب کے کلام سے اردو کی جدید شاعری کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس میں جدت و تخیل کا زور اور ایسی بلند پروازی ہے جو اردو کے کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ غالب کی بدولت اردو شاعری میں فلسفہ کا ذوق پیدا ہوا جس سے وہ اب تک محروم تھی۔ فلسفے، تصوف اور سوز و گداز نے مل کر اس کے کلام میں ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا ہے۔

غالب کا طرز مرصع اور دل نشین ہے۔ اس کا ایک نقص یہ ہے کہ اکثر اوقات اس کا طرز ادا فارسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ جتا دینا لازم ہے کہ اس کے خیالات کی نزاکت اور جدت کسی آسان طرز میں ادا نہیں ہو سکتی تھی لیکن جہاں کہیں اس نے صاف شعر کہے ہیں وہ انتہا درجے کے سہل ممتنع ہیں۔ غالب نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی جس میں اب تک کی جدید شاعری کا ہیولا موجود تھا۔ وہ بہت زندہ دل، ظریف، خوب صورت اور شاندار شخص تھا۔ دہلی میں ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

مردوں پر رونا اور آنسو بہانا دنیا کی شاعری کا ایک قدیم طرز ہے، لیکن مسلمانوں کی المیہ شاعری امام حسینؑ کی شہادت سے متعلق ہے۔ ایران میں اس پر بہت سے مرثیے لکھے گئے۔ مجتہد کاشی کی نظم بہت مشہور ہے۔ مجتہد ایرانی تھا۔ اس کا علم عورتوں کا سا ہے۔ اسی کی تقلید ہندوستان کے مرثیہ گو شاعروں نے کی۔ انیس (۱۸۰۲-۱۸۶۴ء) اور دبیر (۱۸۰۳-۱۸۷۵ء) مجتہد کاشی سے سبقت لے گئے ہیں لیکن ان کے مرثیوں میں بھی مراد پر نہیں ہے۔ حسن بیان اور زبان اور مذہب کے جوش نے ان مرثیوں

کی قدر و منزلت بہت بڑھادی ہے اور اس وجہ سے اردو ادب میں مرثیے کو ایک خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔

میر انیس کے کلام میں واقعاتِ کربلا ایسے فطری احساس سے بیان کیے گئے ہیں اور شہدائے کربلا کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ ان کی تاریخی شخصیت زندہ نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار رواں اور شاندار ہیں اور اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بات چیت کر رہا ہو۔ لیکن ان پر حزن و مایوسی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ حضرت امامؑ کے عظیم الشان شجاعت کے کارنامے کو رزمیہ رنگ میں بلند آہنگی سے بیان کرنے کی بجائے اسے مایوسانہ اور زرنانہ طرز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان میں وہ شان نہیں پائی جاتی جو صداقت و راستی کے شہید میں پائی جاتی چاہیے۔ انیس اور دبیر دونوں ان کے مصائب و آلام پر عورتوں کی طرح آہ و زاری اور ماتم کرتے ہیں۔ باوجود ان تمام نقائص کے انیس زبان اور فن شعر کا باکمال استاد ہے۔

لکھنؤ کے زوال کا زمانہ ردعمل اور رکاوٹ کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے شاعروں کے خیالات میں گہرائی نام کو نہیں۔ کوئی جدید خیال نہیں، کوئی نیا طرز نہیں۔ شاعری انہی پرانے قالبوں میں ڈھالی جاتی ہے۔ تصنع اور تکلف کی بھرمار ہے۔ آتش اور ناسخ فن کے استاد ہیں مگر بڑے شعرا میں شمار کئے جانے کے مستحق نہیں۔ ناسخ کے مقلد اور شاگرد (مقلد) رشک، صبا، بجر، امانت وغیرہ) شاعر نہیں ضلع جگت باز ہیں۔ ان کی شاعری کا دار و مدار محض الفاظ کے الٹ پھیر، رعایت لفظی، روزمرہ کی پامال تشبیہیں اور استعاروں پر ہے اور ابتذال کی طرف مائل ہے۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی شاعرانہ صنعت کے کمال کا نمونہ ہے لیکن رعایت لفظی کا ضبط عیب تک پہنچ گیا ہے۔ شوق کی مثنویاں اس زمانے کی عیاں شانہ سوسائٹی کا خاکہ ہیں جس کا اصل منبع واجد علی شاہ کا چھبلا دربار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مثنویوں کی زبان کی صفائی بیباختہ پن اور محاورے اور بول چال کی خوبی قابل داد ہے لیکن شاعر خوش فعلیوں پر جان دیتا ہے اور تلون کا شکار ہے۔

ولع اور امیر کے بعد میر تقی میر کی قدیم (کلاسیکی) شاعری کی بنیاد ڈھے گئی۔ دونوں کا کلام

پستی کی طرف مائل ہے۔ یہ اس مردہ روایت کے ظہیر دار ہیں جس کی ساری کوششیں بے اثر، چھوٹی چھوٹی خوش نمایوں میں صرف ہوتی تھی لیکن داغ زبان کا بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی زبان کی سادگی، روانی اور بے ساختہ پن اور اس زبان میں اظہار خیال حیرت انگیز ہے۔ اس نے اردو کو روزمرہ اور محاورے اور شوخ اسلوب بیان سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ بات داغ پر ختم ہے اس کا اثر اس کے ہم عصر شاعروں پر بھی ہوا۔

جب ادب ایک تمسخر اور نقالی ہو گیا تو ملک کی دماغی زندگی پر مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہ ہندوستانی طبائع کے لیے خیالات کی نئی دنیا تھی۔ پرانی روایات بدل گئیں۔ جدید سائنس کی بدولت باطنی خودی کی جگہ ظاہری فن نے لے لی۔ ذوق سخن کے اصولوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ مسجع اور مستغنی زبان کی بجائے سادگی اور زبانی پن کی بجائے مرانہ پن اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اس عہد کی ایک ممتاز مہتی محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) ہیں۔ یہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مغرب کی اہلتی ہوئی شراب سے اپنا جام بھرا۔ وہ زبان کے محقق اور مسجع نثر کے استاد تھے مگر وہ بڑے شاعر نہ تھے۔ وہ صرف مٹی کی عورتیں بنا جانتے تھے۔ ان کے ہم عصر حالی کی حالت بالکل عکس تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۲۵۳ھ تا ۱۸۲۷ء تا ۱۳۳۲ھ ۱۳۳۲ھ) پانی پت میں پیدا ہوئے جہاں ہندوستان کی تین فیصلہ کن لڑائیاں ہوئیں اور سلطنتوں نے پلٹا کھایا۔ ان کا لڑکپن اور جوانی دلی میں بسر ہوئی۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس میں سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر تھا۔ مغلیہ سلطنت کے اقبال کا سورج انھوں نے اپنی آنکھوں سے ڈوبتا دیکھا تھا۔ ان تمام واقعات کا گہرا اثر ان کے قلب پر ہوا۔ ادبی فیض انہیں شیفتہ کی صحبت اور غالب کی شاگردی سے پہنچا۔

ان کی ابتدائی شاعری عام طرز کی تھی لیکن جدید اثر نے ان کی شاعری کا رخ نچرل ازم اور حقیقت نگاری کی طرف پھیر دیا۔ ان کی قومی اور اخلاقی شاعری علی گڑھ تحریک کا نتیجہ ہے۔ سرسید احمد خان کی تحریک سے ملک میں ایک نئی تہذیب کا دور شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی دماغی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ حالی نے ان جدید خیالات کا گیت

گایا۔ اسلامی حکومتوں کے زوال نے ایک عجیب و غریب درد پیدا کروا دیا تھا۔ اس نے اس کھوئے ہوئے عظمت اور جلال کو دلی سوز و گمراہی اور درد سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے مسدس (مرد و جزر اسلام) میں تاریخِ زمانہ گذشتہ ہی کو زندہ نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرقع بھی حیرت انگیز صفائی سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری کی بنیاد زوال یافتہ قوم کی گہرائی بے آواز مایوسی پر ہے جسے پڑھ کر بے اختیار دل بھرا تا ہے مگر وہ اُسے پھر بنانا اور تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حالی اگرچہ انگریزی زبان و ادب سے واقف نہ تھے تاہم وہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے باوجود زبان نہ جاننے کے بساطِ بھر انگریزی خیالات و ادب کی ایک گونہ ترجمانی کی ہے انہوں نے ادب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ شاعریِ حالی کے لیے صداقت کا جذبہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات صداقت کی خاطر فن کے حسن سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کا بڑا نقاد ہے۔ اس کی زبان پاک صاف اور پر اثر ہے۔ بول چال کے وہ سادہ اچھوتے جاندار لفظ جن کی اس وقت تک دربار میں نہائی نہیں ہوئی تھی، اس نے اپنی نظموں میں بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ اس نے اپنی قوم کی بے زبان عورتوں کی حمایت بڑی دردمندی سے کی ہے۔ مناجاتِ بیوہ اس کا دوسرا شہ کار ہے جو اتھائی سادہ اور ایسی زبان میں ہے جو اسی موضوع کے لیے خاص طور پر موزوں ہے اور اس قدر پر درد اور دل گداز ہے کہ اسے پڑھ کر سخت سے سخت دل بھی گھپل جاتا ہے۔ "چپ کی داد" اس کی ایک دوسری نظم ہے جس میں اپنے ملک کی عورت عسرت شرافت اور بے بسی کو عجیب انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ اردو میں شہدائے کربلا کے لیے خاص تھا۔ حالی نے قوم کی بعض برگزیدہ ہستیوں کے ایسے مرثیے لکھے ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں اس سے پہلے نہ تھی۔ غالب کا مرثیہ اردو ادب میں شہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ حکیم محمود خاں کا مرثیہ گویا دلی کا مرثیہ ہے۔ مغربی خیالات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر جو قدیم روایات کو بہائے لے جا رہا تھا، اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء) نے مشرقی تہذیب و روایات کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور اپنی طنز و تضحیک کے زہریلے تیر یورپ اور اس کی فضولیات کے پرستاروں پر برسائے شروع کیے۔ اس نے علی گڑھ تحریک کو بھی نہیں بخشا۔ علی گڑھ اور سرسید احمد خاں تو گویا اس کے مزاح و طنز کے ہدف تھے۔ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یورپ کی مادیت کا سیلاب اسلام اور اسلامی ثقافت

کو لے ڈوبے۔ ہر نیا خیال اور جدید تحریک کو وہ بدگمانی کی نظر سے دیکھتا اور اس کے ہاتھوں اس کی بری گت بنتی خصوصاً ان تنگ نظر مہذیبوں سے اسے سخت نفرت تھی جو اندھا دھند اہل یورپ کی نقالی کرتے تھے، اگرچہ خود اس کی نظر بھی محدود تھی۔ نئے خیال سے بدگنا اور مذہب کے نام پر ان کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اس کا اسلوب بیان بہت ستھرا، پر لطف اور پر مزاج ہے اس کی طنز بڑی گہری اور کاری ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ بہت مقبول ہوا لیکن یہ مقبولیت اب کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس کا اس قسم کا کلام کا معتد بہ حصہ وقتی تھا۔ اب اس کا ڈنگ نکل گیا ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کے کلام کے بعض حصے اس زمانے کی نفسیاتی تنقید اور خوبی بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شاعری کے اس جدید دور میں تین شخصیتیں دوسروں سے الگ نہایت بلندی پر نظر آتی ہیں۔ غالب، حالی، اور اقبال۔ ان تینوں کے کلام نے مردہ شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ غالب نے اگرچہ کوئی نئی راہ نہیں نکالی لیکن اس کی جدت فکر، بلندی، تخیل اور بیان کی شوخی نے پرانی شاعری میں جان سی ڈال دی۔ باوجود زندہ دلی کے اس کے کلام میں یاسیت مہلکتی ہے۔ اس کے بعد ہی زمانہ بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ہماری شاعری بھی بدل جاتی ہے اور حالی نے اگرچہ ہماری شاعری کا رخ یکسر بدل دیا۔

اقبال میں گو غالب کے سے تخیل کی بلندی پر دازی اور حالی کا سوسوز و گداز نہ ہو لیکن اس کے کلام میں جو دلولہ ہوش اور تخلیقی قوت ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ اس نے فرنگی تہذیب، جمہوریت، وطنیت اور مادیت کے بت بڑی بے دردی سے توڑے ہیں لیکن ہماری شاعری میں سب سے زیادہ مغربی خیالات سے تمتع اسی نے حاصل کیا ہے۔ وہ بہت بڑا مفکر اور عظیم المرتبت شاعر ہے۔ اس نے ان حکیمانہ افکار کو جو مغرب و مشرق کی حکومتوں کے گہرے مطالعہ ذاتی غور و فکر اور زندگی کے تجربات سے حاصل ہوئے، اپنے جذبات و وجدانات میں ڈبو کر شعر کے قالب میں ایسے لطیف، پر جوش اور انقلاب انگیز پیرائے سے ادا کیے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے مردہ لوں میں بھی زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس نے مسلمانوں کو جو مغرب سے مرعوب اور برادران وطن سے محجوب عارفہ کستری میں مبتلا، مایوس و دل شکستہ تھے عزت نفس اور خودداری کا پیغام سنایا اور خودی کا جدید تصور پیش کر کے ان کی بہتوں میں بلندی اور عزائم میں متقلل

پیدا کیا۔ ابتدا میں اس نے مقبول عام شاعری کے بعد وطنیت کے گیت گائے اُسے خاک وطن کا ہرزہ دینا نظر آیا اور وہ ایک نئے نوالے کی بنیاد استوار کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کی اجتماعی زندگی اور بنیادی اصولوں پر بھی نظر ڈالی اور بندہ مزور کو بیداری کا پیغام دیا۔ آخر میں وہ وطنیت سے نکل کر تعمیر ملت کی طرف مائل ہو گئے اور بنی نوع انسان کو اپنا پیغام دیتے ہیں یعنی وہ قوموں کو روحانی رشتے میں منسلک کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی پڑ میں ہے۔ ان کے خیال میں اسی میں بنی نوع انسان کی مشکلات و مصائب کا حل اور ان کی نجات ہے۔ اقبال نے اپنے کلام سے اردو زبان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے جو اس سے پہلے اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اردو کی تنگ دامانی کی شکایت اس شدت سے باقی نہیں رہ گئی۔ وہ بلاشبہ شاعر مشرق کے خطاب کا مستحق ہے۔

اقبال کی شاعری کا اثر بعد کے اردو شاعروں پر بہت کچھ ہوا۔ وہ خیالات ہی

متاثر نہیں ہوئے الفاظ اور تراکیب بھی اسی قسم کی استعمال کرنے لگے۔

غزل اپنی رعنائی، حسن بیان، سبک پن، رمزیت اور اشاریت کی وجہ سے ہماری شاعری پر چھپائی رہی اور چھپائی ہوئی ہے۔ اس کا میدان حسن و عشق ہے۔ اگر کوئی اور بات بھی کہنی ہوتی ہے تو اسی کی بول چال اور اشاروں کنایوں میں کہنی پڑتی ہے۔ غزل کا قدیم اسلوب داغ پر ختم ہو جاتا ہے، حالی کی تنقید نے اسے ایک طرف تو ابتذال و پستی سے بچایا اور دوسری طرف لفظی صنعت گری اور بے جان و بے لطف قافیہ بندی کی مشق سے نجات دلانی۔ حالی کے پیش نظر غزل کی اصلاح تھی۔ اس کے سب آثار چڑھاؤ اور محاسن و عیوب حالی کی نظر میں تھے۔ اس کی اصلاح کی محرک وہ بد ذوقی تھی جس نے غزل کو لفظوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ اس میں خیال کی جدت تھی نہ تازگی۔ خیال پس پشت جا پڑا تھا۔ حالی کی تنقید نے غزل کو پستی اور لفظی شعبہ بازی سے نکالا۔ مضامین کے لحاظ سے وسعت کا مشورہ دیا اور اس صنف سخن کو زندگی سے زیادہ قریب لانے کی طرف توجہ دلانی۔ صداقت اور خلوص لازم شرط تھی۔ حالی نے خود بھی اس پر عمل کر کے اچھی مثال پیش کی۔ اس کی غزلیں بھی حسن و عشق کے تذکرے سے خالی نہیں۔ ان میں عشق کے نازک جذبات و احساسات اور انسان

کی نفسی کیفیات کو بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کی شاعری کا مقصد قومی اصلاح تھا، اس لیے یہ خیالات بھی اس کی غزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس سے بعض اوقات غزل کی وہ شان باقی نہیں رہتی جس سے غزل عبارت ہے۔ تاہم اس سے وسعت کا رستہ کھل گیا بعد کے شعرا اس کی تقلید اور مثال سے کسی نہ کسی صورت سے ضرور متاثر ہوئے۔

غزل کی قدیم روایت اس وقت حسرت، اصغر اور فانی کے دم سے قائم تھی جسرت کی شاعری خالص عشقیہ ہے جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ اپنے وقت کے معنی ہیں۔ وہ محبوب کے انداز بیان کرنے میں حقیقت سے ہم کنار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے عشقیہ واردات کو سچے اور صاف طور سے بیان کیا ہے۔ یہ صوفیا کا عشق نہیں بلکہ عام انسانوں کا عشق ہے اس کی غزلوں میں کہیں سیاسی رنگ بھی آگیا ہے مگر بے اثر ہے۔

غزل میں جدت کا رنگ بھرنے میں اصغر کا بھی حصہ ہے۔ ان کا میلان اگرچہ صوفیانہ خیالات کی طرف ہے اور ان کی نظر مسائل حیات پر حکیمانہ ہے لیکن انسانی حسن کی کیفیات اور اثر کو بھی بڑی خوبی سے اور بعض اوقات کیف اور انداز سے بیان کیا ہے۔ فانی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں ان کے کلام پر سراسر حزن و ملال اور یاسیت چھائی ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حسن و عشق کے وہ اسرار بیان کر جاتے ہیں جو غزل کے لوازم میں سے ہیں۔ اصغر اور فانی دونوں جذبات کی رو میں مہم نہیں جاتے اور باوجود فوری جذبات کے ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے بخلاف مگر حسن و عشق کا شاعر اور ان کی کیفیات کا ماہر ہے۔ اس نے غزل میں بڑی رنگینی اور مستی پیدا کی ہے اس وقت جب کہ نظم کے مقابلے میں غزل کا اقتدار گھٹتا نظر آ رہا ہے، مگر نے اس کی پشت پناہی کی اور اپنے والمانہ اور سرور افزا کلام سے تغزل کا رنگ پھر جما دیا۔

لکھنؤ بھی جدید اثرات سے نہ بچا۔ وہاں کے شعرا کو اپنے پرانے غیر شاعرانہ طرز کو خیر باد کہنا پڑا۔ انہوں نے تصنع اور لفظی ستاعی کو ترک کر کے سادگی اور حقیقت کو پیش نظر رکھا۔ چلبست کی غزلیں حسن و عشق سے خالی ہیں۔ وہ وطنیت اور ہوم رول (Home Rule) کا راگ گاتے ہیں۔ ان کی نظر غزلوں میں بھی سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف پڑتی ہے،

لیکن انہوں نے آدابِ غزل کو ترک نہیں کیا۔ شعرائے لکھنؤ نے ناسخ کی تقلید چھوڑ کر غالب و میر کی پیروی کی طرف توجہ کی۔ صفحی، حزیں، ثاقب، آرزو، اثر کا کلام اس کا شاہد ہے۔ خاص کے آرزو نے سادہ آرزو کو اپنی ”سر ملی بانسری“ میں ہندی کے سانچے میں خوب ڈھالا ہے اور ایک نئی فضا پیدا کر دی ہے۔ اثر کی غزل میں سادگی، صفائی، نفاست اور رنگینی پائی جاتی ہے جس سے ان کی غزلوں میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ یگانہ میں عاشقانہ رنگ ذرا گہرا ہے اور وہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہتا۔ اس کی خودداری اور بے باکی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی طرح مسائلِ حیات پر بھی نظر ڈالی ہے۔ وہ حسن و عشق کے معاملات کو بھی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتا ہے۔ یگانہ نے غزل میں

جدت پیدا کی ہے۔ —

اقبال کے بعد جس شاعر نے ملک میں عام مقبولیت حاصل کی وہ جوش ہے۔ اگرچہ اس کے کلام میں وہ گہرائی نہیں جو اقبال کے کلام میں ہے۔ وہ اسمِ باہمی ہے، شاعرِ شباب بھی ہے اور شاعرِ انقلاب بھی۔ اس کے یہاں رومان اور انقلاب باہم یکجا نظر آتے ہیں، وہ بہت خوش گو اور خوش فکر شاعر ہے۔ اس کے کلام میں شان و شکوہ اور مہمہ ہے۔ وہ اپنے دل کی بات بغیر جھجک کے آزادی کے ساتھ کہہ دیتا ہے۔ اسے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ الفاظ اس کے سامنے پرا باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے کلام میں وریا کی سی روانی ہے۔ بعض وقت یہ روانی خوفناک طعنیانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے خصوصاً جب مظلوموں اور مزدوروں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر سرمایہ داروں اور حکومتوں پر گر جتا ہے یا جب وہ فرنگی سیاست کی کارستانیوں اور اپنی قومی معاشرے کی خرابیوں اور بیکاریوں کی قلعی کھولتا ہے۔ وہ اب غزل سے بیزار ہے۔ غزل میں اس کے خیالات کی گنجائش نہیں۔ عالی اور اقبال نے بھی غزلیں کہیں ہیں اور اپنے انکار میں ادا کیے ہیں اور غرض اس کے لیے مسلسل غزلوں سے بھی کام لیا ہے، مگر غزل مربوط اور مسلسل خیالات کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے عالی اور اقبال نے دوسری اصنافِ سخن یعنی مثنوی، قطعہ، ترکیب بند وغیرہ سے کام لیا ہے۔ جوش کو بھی یہی کرنا پڑا۔ اب وہ نظم کا شاعر ہے۔ اس کی بعض خاص نظمیں زندہ رہنے والی

تہیں۔ اس کا میلان اشتراکیت کی طرف ہے مگر عمل کچھ اور کہتا ہے۔
 سیلاب بہت پر گوشا غر ہے بہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ فن کی طرف زیادہ مائل
 ہے۔ اس کے کلام میں ایسے جذبات و احساسات نہیں پائے جاتے جو دل پر اثر کریں قریب
 قریب یہی کیفیت علی اختر کی ہے۔

خالص غزل گو یوں کا زمانہ حسرت، اصغر، فانی اور جگر تک رہا۔ اس کے بعد نئے شاعروں
 کی آمد ہوئی جو نظمیں لکھتے ہیں، مگر غزل نے ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ اس زمانے میں اسے اور فروغ
 ہوا اور مشاعروں نے اسے اور رونق بخشی۔ طرحی مشاعروں کی بجائے غیر طرحی مشاعرے ہونے
 لگے۔ مشاعرہ غزل ہی کی خاطر بنا تھا اور غزل ہی مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی، اب غزل کے ساتھ
 نظمیں بھی پڑھی جانے لگیں۔ نئے شاعر نظموں کے ساتھ غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ غزل کے دو مصرعوں
 سے ان کی سیری نہیں ہوتی۔ اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش، روش صدیقی
 کا شمار انہیں شعرا میں ہے۔ انہوں نے مختلف قومی، سماجی اور ملکی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اختر شیرانی
 اپنے وقت میں رومانیت کا امام تھا۔ اس کی شاعری میں ترنم، نغمگی، شادابی اور شدید ناشقانہ
 جذبات پائے جاتے ہیں۔ سانیٹ (sonnet) کو اردو میں شیرانی ہی نے رواج دیا۔

جدید ترین شاعروں میں فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار، اختر، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی
 مخدوم محی الدین ترقی پسند ہیں۔ ان کے ہاں رومان و حقیقت یا رومان و سیاست باہم مل جاتے
 ہیں۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان کے ہاں اشاریت اور ابہام پایا جاتا ہے، جنسی لذت
 کی طرف میلان بڑھا ہوا ہے جو بعض اوقات عربی کی حدود میں بھی جا پہنچتا ہے۔

فراق کی غزل میں بھی نئے دور کا احساس موجود ہے اس نے بھی غزل میں وسعت پیدا
 کی ہے۔ وہ اس کی سماجی، سیاسی اور عمرانی تجربات ہیں، جس سے اس کی غزل میں تنوع ہو گیا
 ہے۔ وہ حسن و عشق کی کیفیات کو حقیقی رنگ میں بیان کرتا ہے اور دیکھ کر ہی منہ پر چھو کر بھی لذت
 حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مزاج میں رومانیت ہے جس نے غزل میں خاص شان پیدا
 کر دی ہے۔ اس کی غزلوں میں فلسفیانہ رجحان بھی ہے مگر وہ اس دنیا اور مادی حیات سے
 آگے نہیں جاتا۔

کچھ شاعر اور بھی ہیں جن کا کلام منظر عام پر آیا ہے، مثلاً قیوم نظر، یوسف ظفر، حفیظ ہوشیار پوری، مجروح، اختر ہوشیار پوری، عدم، سلام محبتی شہری، ناصر کاظمی، فضل، مسعود حسین خان، ابن افتخار وغیرہ۔ نئے شاعروں میں دو چار کے سوا ابھی اوروں نے اپنا مقام حاصل نہیں کیا۔ کچھ ابھی سے تھک گئے ہیں اور ان کے پاس کہنے کے لئے کوئی نئی بات نہیں رہی کچھ ایسے ہیں جن کی شہرت انی الحال ان کی سرف دو چار غزلوں یا نظموں پر ہے، اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی ابھی اس کوچے میں قدم رکھا ہے وقت اس کا فیصلہ کرے گا کہ کون کس تہے کا۔ اس زمانے میں شعرائے نئے نئے تجربے بھی کیے ہیں مثلاً غیر مقفی اور آزاد نظم۔ راشد، میراجی اور ڈاکٹر خالد وغیرہ نے کچھ نظمیں اس قسم کی لکھی ہیں۔ اس سے قبل پرانے شاعروں میں مولوی محمد اسمعیل، مولانا طباطبائی، مولانا شرر، پنڈت کیفی دہلوی نے بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن یہ طرز مقبول نہ ہوا۔ اس کے لیے بڑی قادر الکلامی اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے تاکہ قافیے اور ردیف سے جو ترنم اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو وہ اپنے اسلوب بیان کے حسن اور الفاظ اور حروف کی سورت و ترتیب سے پورا کر سکے، لیکن اس سے ہم بے اعتنائی نہیں کر سکتے جب ہماری زبان میں ڈرامے، رزمیہ نظمیں یا اسی قسم کے مونسونات پر لکھنے کی نوبت آئے گی تو یہ طرز اختیار کرنا پڑے گا۔

ہمارے قدیم شعرا میں محبوب کا تصور خیالی تھا۔ نئے شاعروں میں یہ تصور زیادہ تر حقیقی اور ماوی ہے۔ ہمارے نئے شاعروں اور ادیبوں میں بہت سے ایسے ہیں جن پر فریڈ اور مارکس کے نظریوں کا اثر ہے۔ ایک کا تعلق نفسیات سے ہے اور دوسرے کا سیاسیات سے۔ ان نظریوں سے بلاشبہ ہمارے ادب کو فائدہ پہنچا ہے۔ نفسیات نے اندرونی کیفیات کے تجزیے میں مدد دی اور انتراکٹیت نے فرد اور سوسائٹی کے امتیاز اور ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھایا۔ لیکن جن ادیبوں نے ان نظریوں کو تنقید نظر سے نہیں پرکھا وہ غلط راستے پر جا پڑے۔ ایک تحت شعور کے فلسفے میں گم ہو کر لذت پرستی کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا، دوسرا بغیر یہ سمجھے کہ وہ کس ماحول اور کس سوسائٹی میں ہے، بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔

ہر زبان کے ادب میں اول قدم گیت، نظم یا شعر کا ہے، شریعت بعد کی چیز ہے۔ اردو زبان کا آغاز بھی اسی منج سے ہوا۔ نظم کی طرح نثر کا، ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب "معراج العاشقین" سمجھی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت میں گزشتہ ادراک میں لکھ چکا ہوں۔ اس سے قطع نظر کی جائے تو سب سے قدیم نثر ہمیں میراں جی شمس العشق کی ملتی ہے۔ آپ کا مختصر رسالہ ہے جس کا نام "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے دس باب ہیں جن میں شریعت اور طریقت کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس نثر کا یہ نمونہ ہے:

"خدا کیا تحقیق مال اور پیگڑے (اولاد) تمہارے دشمن ہیں چھوڑو پشیمان کون۔ اے کیا عقلت ہے جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد تھی (مے) تجھے بسر کر۔"

دکنی نثر کی دوسری کتاب "شرح تمہید ہمدانی" یا "شرح شرح تمہید" ہے۔ یہ "تمہید انہن القضا" کا ترجمہ ہے۔ مترجم شاہ میران (شاہ میران حسینی یا میران جی خدانما) امین الدین اعلیٰ کے مرید اور ساکن بلدہ حیدرآباد دکن ہیں۔ ان کا سن وفات ۱۰۶۲ھ ہے۔ کتاب کی زبان ٹھیٹھ دکنی اردو ہے لیکن صاف ہے مغلقت نہیں۔ کتاب میں تصوف کے مسائل، مسائل شرعیہ، عقائد اور قرآن کی بعض آیات کے باطنی معانی بیان کیے ہیں۔ میرے کتب خانے میں اس کے تین نسخے ہیں۔ سب سے قدیم نسخے میں سن کتابت ۱۰۱۲ھ لکھا ہے۔ اس حساب سے یہ اردو دکنی کی بہت قدیم کتاب ہے۔

میراں جی شمس العشق کے فرزند و خلیفہ برہان الدین جاٹم کا ایک رسالہ خاصا بڑا "حکمتہ الحائق" دکنی اردو میں ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا کتابیں اگرچہ اردو نثر کی قدیم ترین کتابیں ہیں اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اپنی نظر سے ان کا درجہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ جو کتاب اس بلند مرتبے کا دعویٰ کر سکتی ہے وہ

ملا وجہی کی کتاب "سب رس" ہے جو ۱۹۲۵ء میں تصنیف ہوئی۔ اس میں حسن و عشق کی نگرہ حقیقت کو مجاز کی صورت کے قبتے کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور دونوں کو میدانِ کارزار میں لا کر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر دیا ہے۔ پوری کتاب مقفی عبارت میں ہے باوجود قافیے کی پابندی کے اسلوب بیان صاف، شگفتہ اور رواں ہے۔ زبان چونکہ پرانی ہے بعض الفاظ اور محاوروں کے سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے اردو ادب میں یہ کتاب خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وجہی پہلا شخص ہے جس نے اپنی زبان کو زبانِ ہندوستان لکھا ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، نثر میں بھی بعض رسالے لکھے ہیں۔ ان میں ایک "گفتار شاہ امین" ہے جس میں تصوف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔ دوسرا مختصر رسالہ "گنجِ مخفی" کے نام کا ہے اس میں شاہد و شہود کی بحث ہے۔

اسی عہد کی ایک کتاب "شمائل الاتقیاء" ہے جو ترجمہ ہے، اسی نام کی ایک کتاب کا جس کے مصنف رکن عماد الدین دبیر معنوی و مرید برہان الدین غریب ہیں۔ مترجم کا نام میران یعقوب ہے۔ یہ ترجمہ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں شروع کیا اور کئی سال میں ختم ہوا۔ کتاب کا موضوع تصوف و طریقت کے مسائل میں خاصی ضخیم کتاب ہے۔ عبارت سادہ ہے۔ میرے نسخے میں سن کتابت ۱۹۹۳ء ہے۔ میر حسن نے اپنے "تذکرہ شعرائے اردو" میں لکھا ہے کہ "میر محمد حسین المتخلص بہ ظہیم جوان محمد شاہی نے خصوصاً الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا تھا اور ایک کتاب "نثر ہند" میں بھی لکھی تھی جس کے دو ایک جیسے بطور نمونہ تذکرے میں نقل کیے ہیں۔ یہ جملے بہت اچھی صاف اردو میں ہیں۔ تذکرہ ۱۸۸۸ء اور ۱۱۹۲ء کے درمیان کسی سن میں لکھا گیا ہے۔ اس وقت کلیم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دو کتابیں اردو نثر کی پہلی کتابیں ہیں مگر نایاب ہیں۔ اب تک ان کا نہیں پتا نہیں لگا۔

دوسری کتاب "نوطر زمرع" ہے جس کے مصنف میر محمد حسین عطا خان متخلص بہ تحسین ہیں۔ یہ بہت اچھے خوش نویس تھے اس بنا پر ان کا خطاب "مرصع رقم" تھا۔ اس کتاب کی تکمیل مصنف نے وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ (نواب اودھ) کے سایہ عاطفت میں کی، اور ان کے حضور میں پیش کرنا چاہتے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات

کے بعد یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی ۱۱۸۹ھ میں ہوئی۔ یہ وہی قصہ ہے جسے میرامن باغ و بہار یا قصہ "پرورویش" کے نام سے کہا ہے۔ "نوطرہ مرصع" کی عبارت، رنگین اور تشبیہات و استعارات سے ملبوس ہے۔ محسن نے اپنے بیان میں عام قصہ گوئیوں کا طرز اختیار کیا ہے، فارسی ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۱۱۱ھ تا ۱۱۳۲ھ) ۱۸۰۸ء تا ۱۸۰۸ء اور ان کے بھائی شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۳ھ) ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۳ء میں نے قرآن مجید کے ترجمے اردو میں کیے، لیکن یہ ترجمے بالکل لفظی ہیں۔ عبارت کا تسلسل اردو بول چال کے مطابق نہیں۔ شاہ عبدالقادر کو ترجمے میں ۱۸ سال لگے اور ۱۲۰۵ھ میں تکمیل کو پہنچا۔ اس زمانے میں حکیم شریف خاں دہلی نے شاہ عالم بابا شاہ کی فرمائش پر قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ ان کے خاندان میں حکیم محمد احمد کے قبضے میں تھا۔ ترجمے کے آخر میں کاتب نے روز جمعہ ۹ ذیقعدہ لکھا ہے، حساب کرنے سے اس کا سن ۱۲۰۸ھ ۱۸۹۳ء برآمد ہوتا ہے حکیم صاحب کے ترجمے کی زبان زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں سختی نہیں برتی گئی، اگرچہ شاہ صاحب کے ترجمے کی سی ادبی خوبیاں کسی دوسرے ترجمے میں نہیں۔

حکیم شریف خاں کا انتقال ۱۲۶۶ھ میں ہوا۔

جدید اردو شری بنیاد ریاض ولیم کالج کلکتہ میں پڑی۔ یہ کالج لارڈ ولزلی نے ہر مئی ۱۸۳۷ء کو قائم کیا۔ اس کا مقصد ان نو عمر انگریزوں کو تعلیم دینا تھا جو انگلستان سے ہندوستان بھیجے جاتے تھے، چونکہ آگے چل کر ان کا تقرر رومہ دار عہدوں پر ہوتا تھا، اس لیے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا کہ وہ اہل ملک کی زبان اور اہل ملک کے خیالات اور رسم و رواج اور آئین و قوانین سے واقف ہو جائیں۔ اس ضمن میں کالج نے ہندوستانی زبان یعنی اردو کی بڑی خدمت کی۔ اردو میں ساوہ اور روزمرہ کی زبان لکھنے کا ڈسنگ ڈالا اور مفقی اور مسجع عبارت ترک کر دی گئی۔ اس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں، جن میں کچھ ترجمے، کچھ تالیفات اور کچھ انتخابات جو قصص و حکایات، تاریخ و تذکرہ، لغات، صرف و نحو اور مذہب پر مشتمل تھے۔ کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیے، ایک تو روزمرہ کی زبان کو سلاست اور صفائی کے ساتھ لکھنا سکون یا دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز کی کتابیں لکھنے کی کوشش کی۔ اس

میں کالج کے ڈائریکٹر جان گلکرسٹ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک اور اچھا کام کالج نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اس میں چھپنے لگیں۔

کالج کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں خصوصاً میرامن کی ”باغ و بہار“ زبان کی فصاحت و سلاست اور بے تکلف طرز بیان کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میرامن کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور ہر موقع پر اس کی مناسبت سے صحیح اور ٹھیک لفظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ اس خوبی سے کھینچتا ہے کہ اس کے کمال انشا پر بلا کی داد دینی پڑتی ہے۔ میرامن کے علاوہ میر شیر علی افسوس بھی کالج میں ملازم تھے۔ ان کی کتاب ”آرائشِ محفل“ جو سبحان رائے کی ”خلاصۃ التواریخ“ سے ماخوذ ہے بہت مشہور ہے۔ افسوس نے سعدی کی گلستان کا ترجمہ ”باغِ اردو“ کے نام سے کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے ”طوطا کہانی“ لکھی جو محمد قادری کے فارسی ”طوطی نامہ“ کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ ”آرائشِ محفل“ (قصہ ساتم طائی) ”گلِ مغنرت“ وغیرہ کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی ”غزلیات“ کے قصے کو نثر میں بیان کیا ہے جس کا نام ”نثر بے نظیر“ ہے۔ مظہر علی خاں ولانی سندھ سے ”بیستانِ پھسی“ کا اردو میں ترجمہ کیا اور ”اتباقِ ہندی“ وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔ مرزا جان طیش بھی کالج سے تعلق رہا۔ ان کی کتاب ”شمس البیان فی اسطلاحاتِ ہندستان“ قابل ذکر ہے۔ طیش نے ”بہارِ دانش“ نام کا ایک منظوم عاشقانہ قصہ بھی لکھا ہے۔ وہ صاحبِ دیوان ہیں۔ کاظم علی جوان نے ”شکستہ“ نامک، کا اور شیخ حفیظ الدین احمد نے ”خرد افروز“ کے نام سے ”عیارِ دانش“ کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ علیل خاں اشک، نہال چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہاں وغیرہ اور کئی اشخاص کالج سے متعلق تھے۔ گلکرسٹ نے لذت اور صرف و نحو پر کتابیں لکھیں۔

ایک اور ادارہ جس نے اردو زبان اور اس وقت کے نظامِ تعلیم میں انقلاب پیدا کیا، ڈ۔ مریم ربی کالج تھا۔ اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں: ایک یہ کہ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے مشرق و مغرب کے علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام کیا۔ اس کالج سے ایسے روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری

زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعہ تعلیم اردو زبان تھا۔ تمام مغربی علوم اردو کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک مجلس ترجمہ (ٹرانسلیشن سوسائٹی) تھی جو کالج کے طلباء کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے یا تالیف کا کام انجام دیتی تھی۔ اس کی مطبوعات کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے جو تاریخ، جغرافیہ، اصولِ قانون، ریاضیات، اور اس کی متعلقہ شاخوں، کیمیا، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، عصبیات، معاشیات، وغیرہ علوم و فنون پر مشتمل تھیں۔ اگر ۱۸۵۴ء کی شورش کے بعد اس کا شیرازہ نہ بکھرتا تو یہ کالج ہماری زبان و ادب کی عظیم الشان خدمت انجام دیتا۔

فورٹ ولیم کالج نے بلاشبہ سادہ اردو لکھنی سکھائی مگر اس کی تقریباً سب کتابیں قصص و حیات کے ترجمے ہیں۔ دہلی کالج میں کالج کی جماعتوں کے درس کے لیے مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں جس کا مقصد طلبہ کو مغربی علوم سے روشناس کرنا تھا۔ یہ سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) تھے جنہوں نے سنجیدہ اور علمی مضامین سادہ اور بے ساختہ زبان میں ادا کرنے کا ڈھنگ ڈالا۔ ان کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ استدلال اور عقلیت کی پختگی ہے وہ ابہام سے بہت بچتے ہیں اور بعض اوقات اپنے خیال کو دل نشین کرانے کے لیے اس قدر سادگی اور وضاحت سے کام لیتے ہیں کہ عبارت بے رنگ ہو جاتی ہے لیکن ان کے کلام میں اثر ہے جو سادگی زبان اور خلوص کا نتیجہ ہے۔

اگرچہ سرسید کا شمار ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریروں کا معتد بہ حصہ ایسا ہے جس میں خوش بیانی، مزاح اور ادبیت کا دل آویز رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ نے اردو ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ انقلاب خیالات ہی میں نہیں ادائے خیالات کے طرز میں بھی تھا۔ یہ نثر نگاری قدیم نثر نگاری سے جدا تھی جس کا لازمی جز نضج اور آرائش تھی۔ سرسید کے بقول ”جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی، اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف معنوں کے ادا کرنے میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہے وہی دوسروں کے دل میں پڑے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ یہ نثر نگاری کا کمال ہے۔“

اس نوبت پر ہم مرزا غالب کے رقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے، جو زبان کی فصاحت

اور سلاست بے سائنگی، مزاج و ظرافت اور دلکش انداز کا بے مثال نمونہ ہیں۔ ان کی مقبولیت ہمارے ادب میں کبھی کم نہ ہوگی۔

وہ بزرگ جن کو جدید اردو نثر نگاری میں استاد کی مرتبہ حاصل ہے اور جن کی تصانیف ہمارے ادب میں 'کلاسکس' کا درجہ رکھتی ہیں وہ یا تو وہ تھے جو سرسید احمد خاں کے زیر اثر آگئے تھے یا وہ جن کی تعلیم قدیم دہلی کالج میں ہوئی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ زبان کے محقق اور مسجع نثر کے استاد تھے اور باوجود اس کے کہ وہ بعض اوقات تکلف اور کہیں کہیں تصنع سے کام لیتے ہیں، وہ اردو نثر کے ایسے صاحب طرز ہیں کہ جس کی مثال نہیں۔ ان کی زبان میں غضب کی سادگی، شیرینی اور لطافت ہے۔ ان کا سحر نگار قلم واقعات و حالات کا بیان ایسے پر معنی سبک اور لطیف الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھچ جاتا ہے۔ ان کی تصنیف "آب حیات" میں جو باوجود بعض فنی اور تاریخی نقائص کے اردو میں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، یہ کمال خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں انہوں نے شعر کی سیرت اور زندگی کے حالات اس خوبی سے بیان کیے ہیں کہ ان کی زندہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں یعنی "نیرنگ خیال"، "دربار اکبری" اور "قصص ہند" حصہ دوم پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ نقاد نہیں اگرچہ انہوں نے سب سے پہلے اس طرت توجہ کی۔ وہ اس کے اہل نہ تھے۔ ان کی تنقید پرانے تذکرہ نویسوں کی طرح بیان زبدی کے عیوب و محاسن اور مہم الفاظ میں ایک قسم کی تقریظ یا تنقیص ہوتی ہے۔ ان کی رائیں ایک طرح کی روایتیں ہیں جو بندگان سے سنی ہیں یا سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ ان کی نثر بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں۔

حالی نے جس طرح اردو شاعری میں انقلاب پیدا کر کے صحیح رستے کی طرف رہنمائی کی، اسی طرح اردو نثر پر بھی ان کا کم احسان نہیں۔ نثر ہماری زبانوں (یعنی اردو فارسی عربی) میں ایک قسم کی نیم شاعری تھی، یعنی رنگین مسجع یا مقفی عبارت، تشبیہوں، استعاروں اور مبالغے سے لدی خیال کم اور لفظوں کی بھرمار ایک معنی کے لیے کئی کئی مترادف الفاظ جسے صحیح نثر کہنا چاہیے اس کی ابتدا اگرچہ سرسید سے ہوئی، لیکن حالی نے اس کی بنیادیں مضبوط کیں اور اسے سنوارا۔

سائنس تشریحی مچھی کی 'سادہ اور متین ہوتی ہے۔ جتن سے میری مراد ایسی تشریح ہے جس میں جان اور قوت ہو۔ عالی کے مزاج اور کلام میں اعتدال اور قدیم اساتذہ کا سانس ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے، عقلیت اور استدلال کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ رنگین عبارت جو تشبیہ اور استعارے سے ملو ہوتی ہے، ذہن کو اصل موضوع سے ہٹا کر عقلی سائنس اور آرائش کی طرف لے جاتی ہے اور اس ضمنوں کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ ان کی تشریح الفاظ اور خیالات ایسے یک جان ہو جاتے ہیں کہ اس سے معنی میں روشنی اور کلام میں قوت اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی تشریح ایک اور خصوصیت ایجاز ہے۔ پھیلاؤ سے کام میں نفع پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ لفظ نے بے تباہی نہیں ہیں۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جاؤ گا اثر کرتا ہے۔ عالی جملوں کا کام لفظوں سے لیتے ہیں۔ وہ جملے میں ایسا بر محل لفظ بڑھا دیتے ہیں کہ سارا خیال چمک اٹھتا ہے۔

جدید سوانح نگاری کی بنیاد بھی حالی نے ڈالی۔ اس میں پہلی کتاب 'جوان کے قلم سے نکلا' وہ حیاتِ سعدی ہے۔ سعدی کی حیات پر نارسا اردو میں نون سامان نہ محفل صرف شیخ کے کلام کے مطالعے سے شہد کی کھٹی کی طرح ذرہ ذرہ جن کو سعدی کی سیرت اور اخلاق اور حالات کو مرتب کیا کلام پر مفسس تبصرہ اور اس کے محاسن اور ادبی نکات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

حالی کی 'یادگار غالب' اردو کے عالی مرتبہ شاعر پر پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ اس کے بعد غالب پر کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن 'یادگار غالب' کو پڑھ کر غالب کی عادات و اخلاق اس کی سیرت اور شخصیت کا جو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ دوسری کتابیں اس سے قاصر ہیں۔ 'یادگار غالب' نے پہلی مرتبہ غالب کی تمدن و منزلت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی اور اس کی سیرت اور کلام کے مختلف پہلوؤں اور اس کے اشعار کی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور نکات کو اس انداز سے بیان کیا کہ غالب کی شخصیت، انسان اور شاعر کی حیثیت سے اس مرتبے کو پہنچ گئی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ 'یادگار غالب' نے غالب کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

تیسری کتاب اس 'دمنوع پر حیات جاوید' ہے۔ تشریح، حالی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں صرف مزید احمد خاں کی سیرت اور ان کے حالات اور کارناموں ہی کا ذکر نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے۔ اس میں اس زمانے کی معاشرت اور

تعلیم، تہذیب، سیاست، زبان، نئی تحریکیں اور ان کے اثرات و نتائج، سب ہی کچھ آگیا ہے۔ یہ زمانہ بہت انقلاب انگیز تھا۔ مسلمانوں کی حالت نہایت پست اور در ماندہ ہو گئی تھی۔ ان کی اصلاح کے لیے سرسید کی مساعی اور جدوجہد، مخالفوں کی یورش، حکومت کی بے التفاتی اور سرد مہری، آپس کے تنازعات یہ سب حالات بہت دلچسپ اور عبرت انگیز ہیں۔ ایک ایسے شخص کے حالات کا لکھنا جو ہر طرف سے نزعے میں گھرا ہوا تھا جو اپنی قوم کے لیے اپنوں اور غیروں سے مجاہدانہ لڑ رہا تھا اور جس کی اصلاح کا موضوع کوئی ایک نہ تھا، بلکہ تعلیم، معاشرت، زبان، مذہب، سیاست سب ہی میں اسے کام کرنا اور دخل دینا پڑتا تھا، حالی ہی کا کام تھا ہماری زبان میں یہ سوانح عمری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی اس کتاب کا پلہ نہایت بلند ہے۔

اردو میں جدید تنقید کی ابتدا بھی حالی سے ہوئی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں شاعری کی ماہیت، حیات و سماج سے اس کا تعلق، اس کے لوازم، زبان کے بعض اہم مسائل، اردو کے اسباق شعری اور ان کے عیوب و محاسن اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہے۔ خاص کر نچرل شاعر پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی تنقید نگاری کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعر کی خوبی کے لیے جن شرائط کو حالی نے لازم قرار دیا ہے ان پر خود بھی عمل کیا۔ تنقید پر یہ پہلی کتاب ہے اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ ادبی تنقید میں حالی کا درجہ امام کا ہے۔ ان کی تنقید نے اردو کے ذوق سخن کو بدل دیا۔

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) نے قدیم دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اردو ادب میں ان کا خاص درجہ ہے۔ یہ اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے جدید طرز پر اردو میں ناول لکھے۔ یہ ناول مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کے پیش نظر لکھے گئے ہیں ان کا پہلا ناول "مرآة العروس" ہے۔ اس کا مقصد لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اس میں اوسط درجے کے شریف خاندان کی روزمرہ زندگی کا نقشہ ہے۔ جب یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی تو بہت مقبول ہوئی اور اصغری اور اکبری کے نام سکھڑا پے اور چھوٹے پرنس میں ضرب المثل ہو گئے۔ ایک بڑی خوبی اس میں (اور ان کے اکثر دوسرے ناولوں میں) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور ان کے خیالات کو بوجہ اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ عورتیں بھی تامل ہو گئیں۔ ان کا دوسرا ناول "بنات النعش"

۳۱ کا گویا وہ ملاحظہ ہے۔ "توبۃ النصوح" کا موضوع ایک خاندان کی دینی اصلاح ہے۔ مصنفان میں دو یوٹیاں کرنے کے مضر اثرات۔ کو بتایا ہے۔ "ابن الوقت" میں انگریزوں اور انگریزی معاشرت کی بے جا تقلید کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ ان نادلوں کا مقابلہ آج کل کے ترقی یافتہ نادلوں سے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پہلی کوشش تھی اور ان میں سے اکثر ناول بہت مقبول ہیں۔ ان میں ایک عیب یہ ہے کہ قصے کے دوران میں بعض وقت طویل وعظ شروع کر دیتے ہیں جو کبھی کبھی تو مزاح و ظرافت کی بدولت جو مولانا کی فطرت میں تھی یا قصے کی مناسبت سے سمجھ جاتے ہیں، لیکن بعض اوقات ان کا پڑھنا اجیرن ہو جاتا ہے۔ ان نادلوں میں اس وقت کے اوسط درجے کے مسلمان شربنا کی خانگی زندگی کا نقشہ بہت خوب سے کھینچا گیا ہے۔ بعض کرداروں کی نگارش میں کمال کیا ہے۔ وہ زندہ اور جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ "مرآة العروس" میں امیر اکبری اور "توبۃ النصوح" میں مرزا ظاہر وار بیگ کا کیریکٹر بہت پر لطف اور بے مثل ہے اور کلیم کا کردار تو اس قصے کی جان ہے۔ ان نادلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو زندگی سے کس قدر دلچسپی تھی اور انہوں نے اپنے وقت کی اسلامی سوسائٹی اور اسلامی خاندانوں کی معاشرت اور ان کی نفسیات کو کس قدر گہری نظر سے دیکھا ہے، جس کا ایسا سچا نقشہ کھینچا ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ ہے۔ قرآن پاک کا پہلا ترجمہ ہے جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ زبان کی سلاست و فصاحت کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قائم رہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک ضخیم تصنیف "الحقوق والفرایض" ہے۔ یہ کتاب ارکان اسلام، احکام قرآن، اسلامی آداب و اخلاق اور شرعی معلومات کی چھوٹی موٹی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ان کے سوا اور بھی مختلف موضوع پر ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔

مولانا، میسے اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشا پرداز تھے، ویسے ہی زبردست مقرر بھی تھے۔ زبان پر ان کو حیرت انگیز قدرت تھی۔ ان کے قلم میں بڑا زور تھا۔ مشکل سے مشکل مطالب کو بوجھنے خاص طرز میں آسانی سے ادا کر دیتے تھے۔ ان کی تحریر میں بلا کی آمد تھی، مگر طبیعت میں ضبط نہ تھا اس لیے بعض وقت ان کا بیان عامیانہ رنگ اختیار کر لیتا تھا۔

مولانا شبلی (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) ان لوگوں میں جو سرسید احمد خاں کے اثر اور فیض صحبت

کی بدولت محدود اور تنگ دائرے سے نکل کر علم و ادب کے وسیع میدان میں آئے۔ انہوں نے اردو زبان میں اسلامی تاریخ کا صحیح ذوق پھیلایا۔ تاریخ میں انہوں نے "ہیر و ذآق اسلام کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کی ابتدا "المامون" سے ہوئی۔ اس سلسلے میں متعدد نامور اسلاف کے سوانح آگئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور اور مقبول کتاب "الفاروق" ہے۔ ان کی آخری تصنیف جسے ان کا شہ کار سمجھنا چاہیے "سیرت نبوی" ہے جو ان کے انتقال کی وجہ سے ناتمام رہ گئی اور بعد میں ان کے فاضل شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل کی۔ اگرچہ وہ یورپی مورخین اور ان کے طرز تاریخ نویسی کے بہت شاکی ہیں اور سخت مذمت کرتے ہیں لیکن انہوں نے یورپی طرز تحقیق سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ انہوں نے بے شمار تاریخی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں جن سے اس بر عظیم کے اردو دان طبقے اور خاص کر مسلمانوں میں تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کا شوق پیدا ہو گیا۔

شبلی شاعر بھی ہیں اور شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ بڑے سخن سنج اور سخن فہم ہیں۔ حالی کے بعد تنقید نگاری میں انہیں کا نام آتا ہے۔ وہ اس باب میں حالی سے بہت متاثر ہیں اور ان کی پرزدی کرتے ہیں۔ تنقید میں ان کی کتاب "موازنہ انیس و دہر" بہت مشہور ہے۔ شروع میں جو اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ بیان کی ہے وہ ناقص ہے۔ وہ مرثیے کی ابتدا سودا سے کرتے ہیں۔ قدیم اردو مرثیے کا انہیں علم نہیں، لیکن سودا کے بعد اردو مرثیے میں جو ترقی ہوئی ہے اسے خوب بیان کیا ہے۔ تاریخی بحث کے بعد فصاحت، بلاغت، واقعیت اور نفسیات انسانیت کے مناظر قدرت، واقعہ نگاری کے مختلف عنوانات قائم کیے ہیں اور ہم ایک کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اپنی تائید میں میر انیس کے کلام سے منتخب اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان بیانات کے بعد انیس کی شاعری کو زمیہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں شک نہیں کہ ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں معرکہ کارزار، لڑائی کے داؤ پیچ، نقاروں کی گونج پہلوانوں کی مبارز، طبعی تلواروں اور نیزوں کے کوب و کھائے گئے ہیں لیکن یہ صرف زمیہ شاعری ہی نہیں ہے۔ اردو میں حقیقی زمیہ شاعری صرف توہم اردو میں پائی جاتی ہے۔ انیس کی شاعری کے محاسن دکانے کے بعد آخر میں دبیر سے مقابلہ کیا گیا ہے اور ہم مضمون اشعار یا بند نقل کر کے انیس

کے کلام کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

شہلی کی ایک اور مشہور اور مقبول تصنیف "شعر العجم" ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں انہوں نے اس امر پر بحث کی ہے کہ شاعری کیا چیز ہے اور اس کے تحت وہ احساس و ذراک، محاکات، تخیل وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ شاعری پر یہ بحث جامع اور قابل قدر ہے جس نے حالی کے بعد تنقید کے سلسلے کو قائم رکھا، اگرچہ وہ اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

آزاد، سالی، شہلی انگریزی نہیں جانتے تھے، انگریزی ادب کے متعلق کچھ ٹوٹی ہوئی باتیں سن رکھی تھیں۔ اپنی ذہانت اور ذوق کے بن پر انہوں نے اردو ادب و حقیقت کی راہ دکھائی اور تنقید کا نیا ڈول ڈالا اور اردو ادب کی انہوں نے وہ عظیم الشان خدمت کی جو انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہ کر سکے۔

بہید تنقید نگاروں میں سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ شروع شروع میں بعض نے جو کچھ لکھا وہ اخذ و ترجمہ اور نقل کی مدد سے آگے نہ بڑھا لیکن بعد کے لکھنے والوں نے تنقید کے فن کو ترقی دی اور مغرب کے اثر سے تنقید کے کئی مذہب بن گئے بعض تاثراتی ہیں جن پر روایت اور جذباتیت کا غلبہ ہے بعض انتہا پسند ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تنقید میں اعتدال ہے۔

ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری نے مغربی زبانوں اور ادب سے پورا استفادہ کیا، مگر انہوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد اور بعض دیگر مغرب زدہ حضرات کی طرح اپنے ادب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے ادب اور روایات کی برتری کو دکھایا ہے۔ غالب پران کی تنقید اس کی شاہد ہے، اگرچہ اس میں بعض جگہ جذباتیت سے مغلوب ہو کر وہ بہت دور نکل جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری اور فراق گورکھپوری کی تنقید بھی جذباتیت اور رومانیت سے تعلق رکھتی ہے۔ نیاز کی تنقید بالکل وجدان اور ذوق پر ہے اور اس سے وہ اس قدر متغلب ہیں کہ عقل و شعور کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ فراق بھی وجدان و ذوق کے قائل ہیں، وہ شاعر یا ادیب کے کلام میں ڈوب کر تنقید لکھتے ہیں اور پورے جوش کے ساتھ کیف اور ادب پر اثر العاطف میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تخلیقی رنگ جھلکتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی ابتدائی تنقیدیں تاثراتی ہیں مگر بعد میں وہ مارکسی نظریے کی طرف جھکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں

گہرے مطالعے پر مبنی ہیں۔

مغرب ہی کے اثر سے ایک جماعت ترقی پسند مصنفین کی وجود میں آئی۔ ان کی تنقید کی بنیاد مارکسی خیالات پر ہے۔ وہ زندگی اور ادب اور اس کے تمام شعبوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند ادیبوں نے تنقید کی ایک نئی راہ نکالی اور تنقید کو آگے بڑھایا، لیکن ان کی تنقید اہتنامہ کی نقطہ نظر پر مبنی ہیں۔ وہ صحابی، روحانی، الہامی، ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی نظریوں کے قائل نہیں۔ عجاوب طہیر، احتشام حسین، ممتاز حسین وغیرہ اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

کچھ اور نقاد ہیں جو نہ زیادہ مغرب زدہ ہیں نہ اشتراکی اور نہ مارکسی نظریے سے مغلوب۔ انہوں نے مغرب کے اثر میں اگر مشرقی اصول اور تنقید کو ترک نہیں کیا۔ ان کی تنقید میں توازن اور اعتدال ہے، انتہا پسندی نہیں۔ اس جماعت میں ممتاز نام آل احمد سرور کا ہے۔ ان کی تنقید حالی کی پیروی میں ہے، صلاح الدین احمد اور وقار عظیم بھی اسی قسم کے نقاد ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تنقید میں توازن ہے، اگرچہ وہ مغربی تنقید کے قائل اور ان کے اصولوں پر عامل ہیں مگر وہ مشرقی روایات سے منحرف نہیں۔ کلیم الدین احمد کا مطالعہ اور نظر وسیع ہے۔ انہوں نے مغربی ادب کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہے، لیکن وہ مغرب کے اثر سے اس قدر مغلوب ہیں کہ بعض اوقات حد سے تجاوز کرتے ہیں اور مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی رائے بے دردی رعایت بڑی آزادی و بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کتاب "اردو تنقید پر نظر" نے یہ تو کیا کہ ہمارے ادیبوں کو چونکا دیا اور وہ اپنے کاموں کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کی تنقید ایک طرف ہے۔ پروفیسر احسن فاروقی بھی اپنے خیالات میں پروفیسر کلیم الدین سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن وہ اتنے انتہا پسند نہیں۔ انہوں نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ بڑے غور سے کیا ہے اور اس کا ان پر بہت اثر ہے۔ وہ تنقید میں صحیح اصول سے کام لیتے ہیں اور بے لاگ رائے دیتے ہیں۔

جدید سوانح نگاری اور تنقید کی طرح ناول اور مختصر افسانے کا رواج بھی مغربی اثر کا نتیجہ ہے۔ مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے اور دوسرے

ناول نگار پنڈت ارتن نامتہ سرشار (۱۸۴۶-۱۹۰۲ء) ہیں۔ یہ بالکل دوسرے رنگ کے شخص ہیں۔ مولوی ندیر احمد جس قدر سنجیدہ ہیں، یہ اسی قدر آزاد اور رنگین مزاج ہیں۔ ان کا مشہور ناول ”فسانہ آزاد“ ہے جو بہت ضخیم ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بہت بے ڈھنگا اور بے ربط ہے بہت سے اجزا زبردستی داخل کر دیئے گئے ہیں۔ اکثر واقعات غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر ان کی نظر وسیع ہے، خاص کر لکھنؤ کی سوسائٹی کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ ذہنی دیباہوں، خاص خاص متواردوں، رسوم و رواج، شادی بیاہ کے ہنگاموں، ناچ رنگ کے جلسوں، بازاروں کی چہل پہل، سرائے کی بھٹیاریوں، چانڈ بازوں، افیونیوں، بانکوں، شہدوں، طوائفوں کے حالات بڑے مزے سے بیان کرتے ہیں۔ بیگمات کی زبان پر بڑی قدرت ہے۔ اس ناول کا مشہور مفتح کردار خوجی ہے جو ہمارے ادب میں بطور ضرب المثل کے ہو گیا ہے۔ باوجود نقائص اور خامیوں کے یہ کتاب اردو ادب میں ایک مقام رکھتی ہے۔

ندیر احمد اور سرشار کے بعد عید الحلیم شرر کا تہر آتا ہے۔ ہماری زبان میں ناول کا نام نہیں کی کتابوں کی بدولت مشہور ہوا۔ شرر مورخ ہیں۔ ان کے اکثر ناول تاریخی ہیں۔ ان کے ناولوں سے لوگوں میں تاریخ کے مطالعے کا شوق ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ اسلامی حمیت اور جوش بھی نمودار و اثر کر۔ کو قصہ کہنے کا ڈھنگ آتا ہے وہ پلاٹ بنانا اور سوارنا بھی جانتے ہیں، لیکن حقیقت نگاری میں بیٹھے ہیں۔ ان کے ناولوں کے تاریخی ہیرد تاریخ کے نامور اور زندہ اشخاص ہیں لیکن وہ ان ناولوں میں بے جان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ہیرد کے مقابلے میں بعض اوقات اس قدر غلو کرتے ہیں کہ غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کے ناولوں میں ”فردوس بریں“ ایک کامل ناول ہے۔ اس میں کردار نگاری اور مرقع کشی میں شرر نے کمال دکھایا ہے۔ شیخ جودی اور حسین کے کردار اور ان کے مکالمے بہت خوب ہیں اور زندہ رہنے والے ہیں۔ وہ بہت پرنویس اور زود نویس تھے اس لیے خامیوں کا ہونا لازم ہے۔ باوجود خامیوں کے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہماری زبان میں تاریخی ناول نگاری کے بانی تھے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ان کا نام باقی رہے گا۔

مرزا ہادی رسوا ذی علم اور صاحب ذوق شخص تھے۔ ان کا ناول ”امراؤ جان“ اردو ادب

میں ایک خاص اور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ وہ کردار نگاری، رُوداد، (پلاٹ) کی ترتیب کے اعتبار سے بہت متوازن اور مربوط ہے۔ اذراط و تفریط کے عیب سے بری ہے۔ حقیقت نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ امر اور جان کا کردار زندہ کردار ہے۔ یہ سارا قصہ بہت اچھی ستمبری زبان میں ہے۔

مولانا راشد الخیری نے بہت سے ناول عمورتوں کی اصلاح و بہبود کے لیے لکھے ہیں۔ اس میں انہوں نے اپنے پھوپھا مولوی نذیر احمد کی پیروی کی ہے عمورتوں کی زبان اور ان کی سیرت بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں غم و الم اور درد انگیزی کی نگارش میں کمال رکھتے ہیں۔ اسی لیے "مسٹر غم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے بیانات میں آدرو پائی جاتی ہے اور ناولوں کے اکثر پلاٹ اور مکالمے غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کردار نگاری سے زیادہ افسانہ پر داز، کی طرف مائل ہیں ان کے ناولوں کے کردار اکثر بے بن ہیں لیکن ایک نثریفاً گزار "عشوتانی" بہت دلچسپ اور زندہ کردار ہے۔

اپنے ناولوں کو میوں کا ذکر کیا ہے، پریم چند ان میں سب سے الگ ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے حقیقت نگاری پریم چند کا بڑی خصوصیت ہے۔ ان کا انداز بیان صاف ستھرا اور مشاہدہ وسیع ہے ان کے ناول اسلحا میں ان میں بے کس کسانوں سے ہم دردی کی ہے اور ان کی روزمرہ کی زندگی، جھگڑے، ٹٹنے، زمینداروں کے جبر و استبداد اور ان کے اقتصادوں مسائل کو سچائی سے بیان کیا ہے پریم چند نے متعدد ناول لکھے ہیں لیکن دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں: ایک "میدانِ عمل" جس میں ادراہ طبقے کے افساس اور ہندوستان نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا نقشہ کھینچا ہے، دوسرا "گنواں" جو ان کا شاہکار ہے اس میں باپ اور بیٹے، قسیم اور جدید، ظلم اور بغاوت کی کشمکش ہے۔ اس کے کردار بلاشبہ جاندار ہیں لیکن کوئی ایسا کردار پیدا نہیں کر سکے جسے

ابدیت حاصل ہو۔

کچھ اور ناول نوپس بھی ہیں: سرزا محمد سعید کا "خواہ ہستی" قابل ذکر ہے۔ مرزا صاحب صاحب نے اور ادیب ہیں۔ فنون لطیفہ کا ذوق رکھتے ہیں ان میں نفسیاتی نظر بھی پائی جاتی ہے، لیکن طویل

فقہریں اور پند و وعظ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کشن پر شاد کول کا "شیاما" ایک ہندو بیوہ کی کہانی ہے۔ اس زمانے کے متوسط درجے کے ہندو گھرانے کے حالات کا صحیح نقشہ ہے۔

نئے لکھنے والوں میں کرشن چندر، اپنرنا تھہ اشک، احمد علی، عصمت چغتائی، عزیز احمد قابل ذکر ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں ایک طبقہ فرائڈ اور مارکس کے نظریوں سے متاثر ہے۔ ان ناولوں میں رومانیت کے ساتھ جنسیت اور لذتیت ہے یا اشتراکیت، اشتراکیت کا ہلکا سا رنگ، باوجود اس کے ناول مطالعے کے قابل ہیں کیونکہ اس میں مشاہدے اور حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے اور ان میں سے بعض کا انداز مفکرانہ ہے جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ مختصر افسانے کی ابتدا اس صدی کے اوائل میں پریم چند سے ہوئی۔ پریم چند بہت اچھے افسانہ گو اور افسانہ نویس ہیں۔ اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی اور دیہاتیوں کے دکھ درد، ان کی دلچسپیوں اور مشکلات و معائب کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں ان کے افسانوں میں مقلص رنگ ہے اور مقصد اصلاح ہے۔ اسی زمانے کے لگ بھگ نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور پنڈت سُدرشن نے بھی افسانے لکھنے شروع کیے۔ نیاز حسن، وحشہ کے داستان گو ہیں۔ مقامی رنگ اور مقصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی اور ایرانی افسانوں کے ترجمے کیے اور چند خود بھی لکھے۔ ان کے افسانے عشقیہ ہیں اور رُحمان بے قید و محبت کی جانب ہے۔ نغیاتی نظر بھی رکھتے ہیں۔ سلطان حیدر جوش کے افسانے بھی پریم چند کی طرح مقصدی ہیں۔ پریم چند ہا مقصد وطن کی محبت ہے اور سلطان حیدر نے اپنے افسانوں میں مغربیت اور اُس کے مضر اثرات کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس زمانے میں اور بہت سے افسانہ نویس پیدا ہوئے لیکن قابل ذکر صرف چند ہیں یعنی علی عباس حسینی، مجنوں گورگھپوری، اعظم کریمی، اختر ادریس، حسام الدین مسر وغیرہ۔ یہ لوگ اب رومانیت کی بجائے زندگی کے حقائق پر نظر ڈالتے ہیں اور پریم چند کی قائم کی ہوئی روایت سے متاثر ہیں، لیکن ان کی نظر بہت گہری نہیں۔ وہ کارزار زندگی میں پورے جوش سے نہیں اُترتے۔ اعظم کریمی کے افسانوں میں یوپی کے مشرقی علاقے کی دیہاتی زندگی کے خاص خاص پہلو اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ مجنوں گورگھپوری نے یوپی کے شرفا اور تعلیم یافتہ طبقے کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ علی عباس حسینی نے یوپی کے

زمینداروں کی دستکاریوں اور کرتوتوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی خانگی زندگی کی مخصوص باتیں چن چن کے نکالی ہیں غرض ان میں سے ہر ایک جس طرح اپنے ماحول اور اپنے تجربے اور مشاہدے سے متاثر ہوا ہے، اُس نے اس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

گذشتہ بیس پچیس سال میں غیر زبانوں کے افسانوں کے ترجمے بہت کثرت سے ہوئے۔ انگریزی، روسی، فرانسیسی، اسپرکی، ترکی، چینی، جاپانی، ہسپانوی، اطالوی وغیرہ۔ تمام بڑی بڑی زبانوں کے افسانے اُردو میں منتقل ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ان ترجموں کا اثر ہماری افسانہ نگاری پر بہت کچھ ہوا۔ ترجمہ کرنے والوں میں سجاد حیدر، یلدرم، نیاز فتحپوری، جنوں، گوکھپوری، اعظم کرپوری، محمد مجیب، جیل قدوائی، خواجہ منظور احمد، اختر حسین رائے پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۲۵ء میں دس کہانیوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع ہوا جس میں بڑی بے باکی اور آزادی کا اظہار کیا گیا تھا بعض کہانیوں میں عام روایات، ظاہر ہستی، مذہبیت پر شدید طنز، تنبیہ اور تمسخر کیا گیا ہے جو مبتذل اور عام اخلاق سے گرا ہوا ہے۔ ان میں باغیانہ اور اتلانی رُحمان پایا جاتا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر بعد کے افسانہ نگاروں پر بھی ہوا۔ اس کے دوسرے سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا، جس نے حقیقت پسندی اور آزادی کی تلقین کی اور اُردو افسانہ نگاری میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ کرشن چندر، احمد علی، عصمت چغتائی، بی بی، حسین سکری، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، ممتاز مفتی، اختر انصاری، حیات اللہ، فرحت، وغیرہ نے زندگی کی مختلف پیچیدگیوں اور معاشی پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے بیان میں نفسیاتی تجربے پایا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر، بلونت، سگور، باجرہ مسرور وغیرہ نے بھی بعض افسانے اچھے لکھے ہیں۔ اسی کے ساتھ مارکس اور فرائڈ کے نظریات، بھی جدید شاعری اور تنقید کی طرح ہمارے افسانے پر اثر ڈالا اور شاید افسانہ ان نظریات سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس سے یہ تو ہوا کہ وسعت پیدا ہو گئی، لیکن بعض افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری اور فن کے نام سے بہت بے اعتدالیاں کی ہیں اور لوگوں کے جذبات، اور معتقدات کو مجروح کرنے میں تامل نہیں کیا۔ بعض نے جنس کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس قدر غلو کیا ہے کہ عربی اور لذتیت صاف نمایاں ہے۔ مثلاً عصمت اور

غلو بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کے بعض افسانے درحقیقت اعلیٰ پائے کے ہیں، لیکن چند ایسے بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں جن کو پڑھ کر گھن اور نفرت ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گذشتہ پچیس تیس برس میں اردو افسانے نے قابل تعریف ترقی کی ہے اور اس کے بعض افسانے ایسے ہیں کہ ہم انہیں دنیا کے مشہور افسانوں کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جو نیا دور آیا ہے اس میں بہت سے نئے نئے افسانہ نویس طبع آزمائی کر رہے ہیں جن کے متعلق اس وقت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

واجد علی شاہ کے عہد میں رقص و سرود کو خوب فروغ ہوا۔ اسی زمانے میں ۱۸۵۳ء کے لگ بھگ سید آغا حسن امانت نے ایک ناول ”اندر سمجھا“ کے نام سے تصنیف کیا۔ اس میں اُس نے ہندی دیومالا کو اسلامی روایات میں سمو کر خاص کیفیت پیدا کی ہے۔ گانے اور رقص نے اس کی مقبولیت میں اور اضافہ کیا۔

اسی دوران یعنی ۱۸۵۳ء میں ڈھاکے اور بمبئی میں اردو اسٹیج کا آغاز ہوا۔ ڈھاکہ میں ابتدا امانت کی ”اندر سمجھا“ ہی سے ہوئی۔ شیخ فیض بخش کانپوری نے جو ایک مدت سے ڈھاکے میں مقیم تھے، ایک تھیٹر ریکل کمپنی ”فرحت افزا“ سے قائم کی اور نواب علی نفیس کو ڈرامے لکھنے کے لیے بلا یا۔ انہوں نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ وہاں کے اُمرانے اُس کی سرپرستی کی۔ اس نے بنگال کے مختلف مقامات میں ڈرامے دکھائے جس کا ایک اثر یہ ہوا کہ بنگال کے ان علاقوں میں جہاں ٹوٹی پھوٹی اردو بولی یا سمجھی جاتی تھی، اردو کا شوق پیدا ہو گیا۔

۱۸۵۳ء میں ہندو ڈرامیٹک گورنمنٹ جو مرہٹی ڈرامے دکھاتی تھی، یہ خیال پیدا ہوا کہ ملک کی عام مقبول زبان اردو میں ڈرامے دکھائے جائیں تو زیادہ رونق اور کامیابی ہوگی چنانچہ اُس نے گرانٹ روڈ تھیٹر میں اردو کا ناول ”گوپی چند“ دکھایا۔ اسی ناول کو اس نے دوبارہ جنوری ۱۸۵۴ء میں پیش کیا۔

ہندو ڈرامیٹک گورنمنٹ کے ٹوٹ جانے یا بمبئی سے چلے جانے کے بعد پارسی تھیٹر ریکل کمپنی نے جو گجراتی تماشے دکھاتی تھی، اردو کی طرف توجہ کی اور اردو کے کئی ڈرامے دکھائے۔ ڈرامے کے آخر میں نقل دکھانے کی رسم بھی اسی نے جاری کی۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۴ء کے اواخر تک رہا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ عظیم نے ملک کا نظام وریم بریم کر دیا تھا۔ نانک کمپنیوں پر بھی اوس پڑی لیکن کچھ ہی عرصے بعد تاجرانہ ذہنیت کے پارسی سرمایہ داروں نے اس کو پھر زندہ کیا اور اسے کاروباری اصول پر چلانے کا ڈول ڈالا۔ سیٹھ لستین جی فرام جی نے جو شاعر بھی تھے اور اداکار بھی، اور جنل تھیٹر کیل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ رونق بنا رہی اور حسینی میاں ظریف اس کے ڈراما نگار اور بالی والا اور کاؤس جی کھٹاؤ اس کے مشہور اداکار تھے۔ اس کمپنی کی بڑی شہرت ہوئی اور اس نے ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار کے موقع پر خوب نام پایا۔

ہندوستان میں اردو ڈرامے کی مقبولیت دیکھ کر بعض پارسی کمپنیوں کو بیرون ملک میں اپنے تماشوں کو ایٹیج کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ خورشید جی بالی والا اپنی کمپنی لے کر رنگون پہنچا اور وہاں خوب دولت کمائی۔ رنگون سے یہ کمپنی بانڈلے گئی جہاں برما کے مہاراجہ اور مہارانی نے بھی ڈرامے دیکھے اور بہت محظوظ ہوئے اور اس قدر زور و جواہر انعام میں دیے کہ کمپنی مالا مال ہو گئی۔ برما میں تماشے دکھانے کے بعد یہ کمپنی سنگاپور گئی اور اس کے تماشے بے حد مقبول ہوئے۔ سنگاپور کے قیام میں اس کو جاوا سماٹرا کے ہندوستانی تاجروں نے مدعو کیا۔ چنانچہ سنگاپور کے بعد یہ بنا دی گئی، وہاں بھی اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ یہ کمپنی دو کٹوریہ منڈلی، جہاں بھی گئی خلقت نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور تماشوں سے بہت معقول آمدنی ہوئی۔ اب ان کامیابیوں سے ان کی ہمت اتنی بڑھی کہ لندن کا قصد کیا اور ۱۸۸۰ء میں وہاں جا کر اردو ڈرامے ایٹیج پر دکھائے۔

ان پارسی کمپنیوں کے کاروبار کے ختم ہونے پر بعض دیگر اصحاب نے بھی تھیٹر کیل کمپنیاں بنائیں۔ خاص نمبر میں محمد علی ناخدا نے "نیوال فریڈ تھیٹر کیل کمپنی" قائم کی اور بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست رام پور کے نواب حامد علی خاں اشک نے لاکھوں روپے کے صرف سے رام پور قلعہ کے سامنے تھیٹر کی عالی شان عمارت تعمیر کی اور قابل ڈرامہ نگاروں، شاعروں اور اداکاروں کو اپنی کمپنی کے لیے جمع کیا۔ اس کمپنی کے ٹوٹنے پر اس کے محلے نے دہلی میں "جوبلی تھیٹر" قائم کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک بیسویں کمپنیاں بنیں اور ٹوٹیں اور کچھ دن اپنا اپنا تماشہ دکھا کر خست ہو گئیں۔ فلم نے ان کا بازار سرد کر دیا۔ اگرچہ پارسی سرمایہ داروں نے حصول زر کی خاطر اپنا سرمایہ اس کام میں لگایا، لیکن اس ضمن میں اردو ڈرامے اور اردو زبان کی خدمت بھی ان کمپنیوں نے کی۔

قدیم ڈرامے ابتدا میں اندر سبھا کے انداز کے تھے، بعد میں کچھ اصلاح ہوئی لیکن پھر بھی قدیم روایات کے پابند رہے۔ موضوع عشق و محبت ہوتا تھا۔ کردار اکثر فوق الفطرت ہوتے حقیقی زندگی سے بہت کم واسطہ ہوتا۔ باتیں گانے میں ہوتیں۔ بادشاہ بھی گاتا، وزیر بھی گاتا، غلام بھی گاتا۔ اشعار کیا تھے تک بندی ہوتی تھی اور بیچ بیچ میں نثر آجاتی تو نظم سے بدتر معنی، مسجع نیم شاعری ہوتی۔ احسن لکھنوی، بے تاب اور آغا حشر نے کچھ اصلاح کی۔

جدید اردو میں جو ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ اسٹیج پر آنے کے قابل نہیں، پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان لکھنے والوں میں مرزا ہادی رسوا، احمد علی شوق، لالہ کنور سین، حکیم احمد شجاع، اشتیاق حسین قریشی، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، فضل الرحمن عظیم بیگ، چغتائی، سُدشن، عبدالمجید کینی، اور مرزا ادیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یورپی ڈراموں کے بھی اردو ترجمے ہوئے ان کا بھی ہمارے ڈرامہ نگاروں پر اثر پڑا۔

آخر میں ان چند اداروں اور انجمنوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اردو کی اشاعت و ترقی اور اس کے علمی مرتبے کو بلند کرنے میں کام کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج، قدیم دہلی کالج کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ اس سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا تذکرہ ضروری ہے یہ سوسائٹی (سر) سید احمد خاں نے ۱۸۶۲ء میں قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کر اہل وطن میں مغربی ادب اور مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے اور علمی مضامین پر لیکچر دیے جائیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ یہ کتابیں تاریخ، معاشیات، (پولیٹیکل اکاؤنٹی) فلاحیت، ریاضیات، طبیعیات وغیرہ مضامین کی تھیں۔ اس سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ بھی جاری کیا گیا جس میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار سرسید کی وفات تک جاری رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مطبع نو لکھنور نے بھی علاوہ عربی فارسی تصانیف کے اردو زبان کی بے شمار کتابوں کی طبع و اشاعت کا قابل تعریف کام کیا اور نظم و نثر کی ایسی ایسی ضخیم کتابیں چھاپ کر شائع کیں جو کسی دوسرے ادارے یا مطبع کے بس کی بات نہ تھی۔ بیسویں صدی میں جن

انجمنوں اور اداروں نے یہ خدمت انجام دی ان میں وارلمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انجمن اور جامعہ عثمانیہ نے صد ہا کتابیں مختلف علوم و فنون کی ترجمہ و تالیف کیں اور ہزار ہا اصطلاحات علمیہ وضع کر کے اردو ادب میں پیش بہا اضافہ کیا۔ انجمن نے اس کے سوا اردو شعرا کے قدیم نایاب تذکرے مرتب کر کے شائع کیے اور اردو زبان کی قدیم کتابیں جن کے نام تک سے لوگ ناواقف تھے شائع کر کے اردو زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا۔ جامعہ عثمانیہ پر عظیم بھارت و پاکستان میں پہلی یونیورسٹی تھی جس میں تمام علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم ملک کی ایک ویسی زبان یعنی اردو تھا۔ افسوس کہ بھارت کے قبضہ کے بعد یونیورسٹی کا سرشتہ تالیف و ترجمہ بند کر دیا گیا اور ذریعہ تعلیم اردو جو جامعہ عثمانیہ کی ممتاز خصوصیت اور اس کا بڑا کارنامہ تھا موقوف کر دیا گیا۔ حیدرآباد دکن میں ہماری قومی زبان اور تہذیب کو جس بیدروی سے مٹایا گیا، اس کا صدمہ ہم کبھی نہیں مہول سکتے۔

تقسیم ملک کے بعد حال میں پاکستان میں چند ادارے ایسے قائم ہوئے ہیں جو علمی ادبی ثقافتی کام کر رہے ہیں۔



”سب سے مقدم اور اہم کام یہ ہے کہ تمام علوم و فنون
 حتیٰ کہ انگریزی بھی اپنی ہی زبان کے ذریعے پڑھائی جائے جیسا
 کہ دنیا میں ہر جگہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کیا کسی انگریزی یونیورسٹی میں
 گویے یا خیام پر جرمن یا فارسی زبان میں لیکچر دیے جاتے ہیں؟
 کیوں نہ ہم شیکسپیر، شیلے یا دانٹے پر اردو زبان میں لیکچر دیں۔ اس
 سے ہماری زبان میں وسعت، پختگی اور قوت کا اضافہ ہو
 گا۔۔۔۔۔“

—بابائے اردو عبدالحق

الوقار پبلیکیشنز کی اہم مطبوعات

alwaqrpublications@hotmail.com

Ph: 0300 - 8408750

پی او بکس نمبر 7104 لاہور

- | | | |
|-----|---|---------------------------------|
| ۱۔ | مجموعہ تنقیدات از: پروفیسر آل احمد سرور - مرتبہ: عاصمہ وقار | ۱۰۰/- |
| ۲۔ | غالب نامہ۔ تجزیاتی مطالعہ | از: عاصمہ وقار |
| ۳۔ | حرف سرور (آپ جی پروفیسر آل احمد سرور) | از: پروفیسرز ہر معین |
| ۴۔ | باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ | از: پروفیسرز ہر معین |
| ۵۔ | نقد غالب | مرتبہ: پروفیسر مختار الدین احمد |
| ۶۔ | مرقع غالب | از: پرتھوی چند |
| ۷۔ | کلیات ولی | مرتبہ: پروفیسر نور الحسن ہاشمی |
| ۸۔ | کلیات ممنون | مرتبہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان |
| ۹۔ | اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم | از: ڈاکٹر حنیف کنفی |
| ۱۰۔ | نقد عبدالحق | مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن |

۲۹۵/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	بابائے اردو خدمات اور فرمودات
۹۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	لطائف نبوی از غالب
۱۲۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	غزل غالب اور حسرت از: رشید احمد صدیقی
۲۸۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	نقوش غالب
۳۲۵/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	دل کی کتاب
۱۹۵/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	بازیافت غالب
۲۵۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	تحقیق نامہ غالب
۲۵۰/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	غالب کا علمی سرمایہ
۲۸۰/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	غالب پیائی
۱۹۵/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن مرتبہ: سید وقار حسین	برسبیل غالب
۱۲۹۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	دیوان غالب 'نسخہ خوبہ' (ڈیٹیکس ایڈیشن)
۲۵۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	دیوان غالب 'نسخہ خوبہ'
۲۹۰/-	مرتبہ: اصغر ندیم سید ڈاکٹر معراج نیر	دیوان غالب 'نسخہ خوبہ' - تجزیہ و تحسین
۱۸/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	دیوان غالب (صحیح صورتحال)
۱۹۵/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	غالبیات جہات و جستجو
۱۹۵/-	از: ڈاکٹر سید معین الرحمن	غالب آشنائی
۲۵۰/-	از: پروفیسر نیر پرویز	کائنات غالب اور ڈاکٹر سید معین الرحمن
۲۵۰/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن	فورٹ ولیم کالج از: پروفیسر سید وقار عظیم
۳۹۵/-	از: پروفیسر سید وقار عظیم	اردو ڈرامہ --- تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ
۲۸۰/-	از: پروفیسر سید وقار عظیم	داستان سے افسانے تک
۳۲۵/-	از: پروفیسر سید وقار عظیم	ہماری داستانیں
۲۵۰/-	از: ڈاکٹر معراج نیر	بابائے اردو مولوی عبدالحق

- ۲۸۰/- مرتبہ: ڈاکٹر معراج نیر ۳۳ - بیسویں صدی کے منتخب افسانے
- ۲۸۰/- مرتبہ: ڈاکٹر معراج نیر ۳۳ - بیسویں صدی کے بیس افسانے
- ۱۲۰/- از: جمیل مباح ۳۵ - اب در بچوں کو نہ بند رکھنا کبھی (شاعری)
- ۳۵۰/- از: پروفیسر عقیل احمد روبری ۳۶ - یونان کا ادبی ورثہ
- ۳۹۵/- از: پروفیسر عقیل احمد روبری ۳۷ - عالمی ادب کی رزمیہ شاعری (عہد بہ عہد)
- ۳۹۵/- از: پروفیسر عقیل احمد روبری ۳۸ - شخصیات و ادبیات
- ۳۵۰/- از: پروفیسر رؤف امیر ۳۹ - انور مسعود شخصیت و فن
- ۲۷۰/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۰ - میر انیس حیات و شاعری
- ۳۵۰/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۱ - اقبال سب کے لیے
- ۳۹۵/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۲ - اردو نثر کا فنی ارتقاء
- ۳۹۵/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۳ - اردو شاعری کا فنی ارتقاء
- ۳۵۰/- مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۴ - خودنوشت اور تنقید خودنوشت
- ۱۹۵/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۵ - میر کو سمجھنے کے لیے
- ۳۲۵/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۶ - اردو افسانہ اور افسانہ نگار
- ۷۵۰/- از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۴۷ - اردو ادب کی فنی تاریخ
- ۳۲۵/- از: ڈاکٹر معین الدین عقیل ۴۸ - پاکستانی زبان و ادب
- ۳۹۵/- از: ڈاکٹر معین الدین عقیل ۴۹ - نوادرات ادب
- ۳۵۰/- از: ڈاکٹر معین الدین عقیل ۵۰ - جہات جہد آزادی
- ۳۵۰/- از: ڈاکٹر معین الدین عقیل ۵۱ - فتح نامہ شیو سلطان
- ۶۵۰/- از: عباد اللہ اختر ۵۲ - دیوان حافظ شرح و ترجمہ
- ۱۹۵/- از: مطلوب الحسن سید ۵۳ - منتخب کلام غالب (انگریزی ترجمہ)
- ۱۸۰/- از: عالیہ جلیل شاہ / ۵۴ - تنہا چاند (پروین شاکر، فکر و فن)

- ۳۲۵/- مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر ۵۵۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار
- ۳۳۰/- مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی ۵۶۔ اقبال شناسی اور نیاز و نگار
- ۱۹۵/- مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی ۵۷۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار
- ۱۸۰/- از: سعدیہ ناز ۵۸۔ نظیر حسنین کی علمی اور ادبی خدمات
- ۲۵۰/- از: ڈاکٹر نیر صدیقی ۵۹۔ اعتبارات (شعری تنقید)
- ۱۳۰/- مرتبہ: لیاقت علی چوہدری ۶۰۔ تقاریر سربراہان پاکستان (اولین خطبات)
- ۹۰/- مرتبہ: پروفیسر طاہر نقیس ۶۱۔ مکتوبات اقبال (بنام چوہدری محمد حسین)
- ۳۰۰/- از: ڈاکٹر وسیم کتان ۶۲۔ مہک (شعری مجموعہ)
- ۱۵۰/- از: پروفیسر نظیر صدیقی ۶۳۔ ادبی جائزے
- ۱۰۰/- از: ڈاکٹر محمد خاں اشرف ۶۴۔ درد کا سورج (شعری مجموعہ)
- ۱۹۵/- از: ڈاکٹر محمد خاں اشرف ۶۵۔ رومانویت اور ادب میں رومانوی تحریک
- ۲۹۰/- از: ڈاکٹر عارف ثاقب ۶۶۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے
- ۱۲۰/- از: خاور بوسالوی ۶۷۔ وفا کے پھول (شعری مجموعہ)

☆☆☆



برادرِ مکرم معین صاحب، سلام مسنون

...آپ کراچی کب آرہے ہیں۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو بھی

چاہتا ہے۔ خاص طور پر مولوی (عبدالحق) صاحب کے بارے میں

چاہتا ہوں کہ آپ کے اشتراک اور تعاون سے مرحوم کے شایانِ شان

کوئی کام کیا جائے۔ آپ کے سوا کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں ہے جسے اس

کام میں شریک کیا جاسکے۔ آپ کا بھائی: **مُشفق خواجہ**

۳۱۔ اگست ۱۹۷۱ء

مولانا عبدالحق پر ڈاکٹر سید معین الرحمن کی کتاب (سے) پرانی یادیں

ہو گئیں۔ یادوں پر ڈکھی ہوا، معین صاحب کے کام پر خوش ہوا۔ عبدالحق مرحوم

ابھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علمی کام تو ظاہر ہیں لیکن اُن کو جاننے اور اُن کی

شخصیت کو پہچاننے کے لئے اُن کے شخصی اور ذاتی حالات پر زیادہ لکھنے اور اُن کو

کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے بڑا مبارک کام کیا ہے۔

ہے وہ اس اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

کراچی: ۱۹۷۵ء — پیر سید حسام الدین راسد کی

”ایشیاء، آدمی دولت کا کرتا ہے، وقت کا کرتا ہے اور اپنے جسم و جان کا کرتا ہے۔

اگر ایشیاء کی ایک ایسی مثال تلاش کرنی ہے کہ جہاں جسم و جان اور روح کی

تک آدمی اپنے آپ کو قربان کر دے اور برباد کر دے تو وہ مولوی عبدالحق کی

ہے! معین صاحب نے کام کو اُس انداز میں کیا جو انداز مولوی عبدالحق نے

سکھایا تھا..... کہ کام چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اُسے کارکن سے

لگن کے ساتھ کرنا چاہیے..... تو یہ سبق معین صاحب نے مجھے

جس حصے میں وہ مولوی عبدالحق صاحب سے ملے اور اُن کے

اس طرح سیکھے ہیں کہ انہیں اپنی زندگی کا وظیفہ

خوش قسمت ہیں اور دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ یہ

نام کی برکت سے اور اُن کے ذکر کی برکت سے

لاہور: ۱۹۷۵ء